تفسیر سُورۃ یٰسٓ

ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

اِدارۃ العُلوم الاثریۃ
فیصل آباد، پاکستان

تفسیر سورۂ یٰسٓ

ارشاد الحق اثری

ادارۃ العلوم الاثریہ
فیصل آباد، پاکستان

نام کتاب: تفسیر سورۂ یٰسٓ

مولف: ارشاد الحق اثری

ناشر: ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد

فون: 041-2642724

تعداد: 1000

تاریخ طباعت: مارچ 2015ء

مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس، لاہور

فون: 042-7232400

ملنے کا پتہ

(1) ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد ۔ فون: 041-2642724

(2) مکتبہ اسلامیہ: غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

(B) کوتوالی روڈ فیصل آباد ۔ فون: 041-2631204

فہرست

آیت نمبر 7

آیت نمبر 9,8

آیت نمبر 11,10

آیت نمبر 12

آیت نمبر 14,13

آیت نمبر 15 تا 17

آیت نمبر 19,18

آیت نمبر 21,20

آیت نمبر 22 تا 25

آیت نمبر 27,26

آیت نمبر 29,28

آیت نمبر 41 تا 44

آیت نمبر 45، 46

آیت نمبر 47

آیت نمبر 48 تا 50

آیت نمبر 51 تا 54

آیت نمبر 55 تا 58

آیت نمبر 59 تا 61

آیت نمبر 62

آیت نمبر 63 تا 65

آیت نمبر 70

آیت نمبر 71 تا 73

آیت نمبر 74 تا 76

آیت نمبر 77 تا 80

آیت نمبر 81 تا 83

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰسٓ ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ○ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ تَنْزِيْلَ
الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ○ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ
عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى
الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا
فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ
بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ○ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ
شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ○ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ
جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ
فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ
مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ○ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَمَا
عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ
وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ
اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ
اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَمَا لِيَ لَآ
اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ
بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ○ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اِنِّيْٓ
اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ○ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا
غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ

مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ○ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ
خَامِدُوْنَ ○ يَاحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا
يَرْجِعُوْنَ ○ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ
اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ○ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۚ
اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ
اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ
مُّظْلِمُوْنَ ○ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ وَالْقَمَرَ
قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ○ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ
تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا
حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ○ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ○
وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ○ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا
اِلٰى حِيْنٍ ○ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ○ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ○ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ
مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ
يَخِصِّمُوْنَ ○ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ○ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ

فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ○ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن

مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ○ إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً

وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ○ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا

تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ○

هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ○ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُم

مَّا يَدَّعُونَ ○ سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ○ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ○

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○

وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ○ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ

تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ○ هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ○ اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا

كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ○ الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ

أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا

الصِّرَاطَ فَأَنَّىٰ يُبْصِرُونَ ○ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا

وَلَا يَرْجِعُونَ ○ وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ○ وَمَا عَلَّمْنَاهُ

الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ○ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا

وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ○ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا

أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ○ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ○

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ○ وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً

لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ○ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ ○ فَلَا

يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ○ أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا

خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ
قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ ۝ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ
بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُۙ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ
تُوْقِدُوْنَ ۝ اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ
مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ۗ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۝ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْــًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ
فَیَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

مقدّمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصّلاۃ والسّلام علٰی سیّد الانبیاء والمرسلین وعلٰی آلہ وصحبہٖ اجمعین ومن تبعھم باحسانٍ إلی یوم الدّین امّابعد:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے سورہ یٰسٓ کی تفسیر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ والحمد للّٰہ علٰی ذٰلك!

قبل ازیں سورۂ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کی تفسیر ''فلاح کی راہیں'' کے عنوان سے اور پھر سورۂ قٓ اور سورۂ فاطر کی تفاسیر بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ہیچ مدان کی مقدور بھر کوشش رہی ہے کہ اس تفسیری سلسلے کو زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے اور قرآن فہمی کے لیے ضروری اور اہم باتوں کو جمع کر دیا جائے۔ اہلِ علم سے التماس ہے کہ اگر وہ اس میں کہیں کوئی غلطی محسوس کریں تو برائے مہربانی اس سے مطلع فرمائیں۔ ہم ان کے سپاس گزار ہوں گے۔ یقیناً اُن کی ایسی راہنمائی ہمارے لیے تعاون اور ان کے لیے اجر وثواب کا باعث بنے گی۔

یہ سلسلۂ تفسیر پہلے دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والے مؤقر ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوتا رہا ہے، جسے اب مع حک واضافہ کتابی صورت میں طبع کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم دارالدعوۃ السّلفیہ کے شکر گزار ہیں۔

میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جو بہر نوع ادارہ کی سرپرستی فرماتے ہیں اور اپنے رفقائے کار کا بھی ممنون ہوں جو قدم قدم پر میرے معاون بنتے ہیں بالخصوص مولانا عبدالحی انصاری حفظہ اللہ کا جنھوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کے

پروف پڑھے اور اپنے علمی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اپنی نوازشوں سے نوازے، ادارہ کی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے اور ہم سب کے لیے ذریعۂ نجات اور ادارہ کے مؤسسین اور خدمت گزاروں کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یارب العالمین!

خادم العلم والعلماء
ارشاد الحق اثری عفی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ یٰسٓ کے فضائل

سورۂ یٰسٓ مکی سورت ہے اور ترتیب مصحف میں اس کا نمبر چھتیسواں ہے۔ اس کے فضائل میں متعدد احادیث اور آثار مروی ہیں جنھیں ہم ضروری تفصیل سے یہاں ذکر کرتے ہیں:

1۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن لكل شيء قلباً وقلب القرآن يٰسٓ، ومن قرأ يٰسٓ كتب الله له بقراءة تها القرآن عشر مرات.)) ①

''بے شک ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔ جس نے یٰسٓ کو پڑھا اللہ تعالیٰ اسے یٰسٓ کے پڑھنے کی وجہ سے دس بار قرآن پڑھنے کا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔''

ترمذی کے علاوہ یہ روایت دارمی اور شعب الایمان میں بھی منقول ہے۔ ترمذی کے بعض نسخوں میں ہے کہ امام ترمذی نے اسے ''حسن غریب'' کہا ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں ''حسن'' کا لفظ نہیں بلکہ صرف ''غریب'' ہے۔ علامہ قرطبی نے تفسیر الجامع لأحکام القرآن ② میں اور حافظ ابن کثیر نے تفسیر ③ میں ''حدیث غریب'' ہی نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے مزید یہ بھی فرمایا:

«وهارون أبو محمد شيخ مجهول» ''اس کا راوی ابو محمد ہارون مجہول ہے۔'' حافظ ابن حجر نے تہذیب ④ میں بھی امام ترمذی کا یہ کلام ذکر کیا ہے اور انھوں نے بھی امام ترمذی سے اس حدیث کے بارے میں ''حدیث غریب'' ہی نقل کیا ہے، تحسین نقل نہیں کی۔ حافظ ذہبی نے تو یہی روایت امام قضاعی کی ''مسند الشہاب'' سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

---

① ترمذي: 2887
② قرطبی 1/15
③ تفسير ابن كثير 742/3
④ تهذيب: 15/11

"أنا أتهمه" ''میں اس روایت میں ابومحمد ہارون کو متہم قرار دیتا ہوں۔'' ①

امام ابن ابی حاتم فرماتے ہیں کہ میں نے اسی حدیث کے بارے میں اپنے والد گرامی سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا:

''سند میں مقاتل بن سلیمان ہے۔ میں نے یہ حدیث مقاتل بن سلیمان کی کتاب کی ابتدا میں دیکھی ہے۔ یہ حدیث باطل ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔'' ②

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''موضوع'' قرار دیا ہے ③ اور فرمایا ہے کہ امام ابوحاتم نے سند کا راوی مقاتل بن سلیمان ذکر کیا ہے جبکہ ترمذی اور دارمی میں مقاتل بن حیان ہے۔ لیکن امام ابوالفتح الازدی اور امام قضاعی یہی حدیث ''مقاتل عن قتادة'' سے روایت کرتے ہیں جس میں وضاحت نہیں کہ مقاتل کون ہے۔ بعض راویوں نے غلطی سے اسے مقاتل بن حیان سمجھا ہے امام ازدی رحمہ اللہ نے بھی اسی غلط فہمی میں اس پر امام وکیع سے جرح نقل کی ہے کہ مقاتل بن حیان کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت کی گئی ہے۔ حافظ ذہبی نے وضاحت کی ہے کہ امام ازدی پر معاملہ ملتبس ہو گیا ہے انھوں نے مقاتل بن حیان کو مقاتل بن سلیمان سمجھا ہے مقاتل بن حیان تو صدوق ہیں اور جسے امام وکیع نے جھوٹا کہا ہے وہ مقاتل بن سلیمان ہے۔ اس کے بعد انھوں نے امام ازدی کی سند سے یہی روایت ذکر کی ہے اور فرمایا ہے:

«الظاهر أنه مقاتل بن سليمان» ④

''ظاہر ہے کہ وہ مقاتل بن سلیمان ہے۔''

اور مقاتل بن سلیمان کو امام وکیع، امام نسائی اور امام ابن حبان نے کذاب کہا ہے۔

امام بخاری نے ''سكتوا عنه'' اور امام ابن معین نے ''ليس حديثه بشيء'' کہا ہے۔

---

① میزان: 288/4　② العلل لابن أبي حاتم: 56.55/2

③ سلسلة الاحاديث الضعيفة رقم: 169　④ میزان: 172/4

امام احمد رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے: "هذا كلام موضوع" "یہ من گھڑت روایت ہے۔"①

اس لیے یہ حدیث حسن قطعاً نہیں جیسا کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں ہے بلکہ یہ موضوع اور بے اصل روایت ہے۔

2۔ امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ اس باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور:

"ولا يصح وإسناده ضعيف" "وہ صحیح نہیں اور اس کی سند ضعیف ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ سورۂ یٰس کا نام تورات میں "المعمہ" ہے جس کی خیر اس کے پڑھنے والے کے لیے دنیا و آخرت میں عام ہے۔ دنیا و آخرت میں اس کے مصائب کو دور کرنے کا باعث ہے۔ اسے "المدافعہ" اور "القاضیہ" بھی کہا گیا ہے کیونکہ یہ پڑھنے والے کی ہر تکلیف کو دور کر دیتی ہے، ہر حاجت اس سے پوری ہوتی ہے، پڑھنے والے کو بیس حجوں کا ثواب ملتا ہے۔ اسے سننے والا ایک ہزار دینار اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر پاتا ہے۔ جو اسے لکھ کر پی لیتا ہے اس کے پیٹ میں ایک ہزار دواء، ایک ہزار نور، ایک ہزار یقین، ایک ہزار برکت، ایک ہزار رحمت داخل ہو جاتی ہے......الخ②

خطیب بغدادیؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں بہت سے مجہول راوی ہیں۔ امام بیہقی نے کہا ہے کہ اسے بیان کرنے میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الجدعانی، سلیمان سے روایت کرنے میں منفرد ہے اور یہ منکر ہے۔ حافظ ذہبی نے کہا ہے:

((أتى بخبر باطل، أنا أتهمه به في يٰسٓ))③

"یٰسٓ کی فضیلت میں محمد بن عبدالرحمٰن کو میں متہم قرار دیتا ہوں، وہ باطل خبر بیان

---

① منتخب من العلل للخلال: 117

② تاریخ بغداد: 388/2، شعب الإيمان: 480/2، ابن كثير: 743/3، نوادر الأصول: 89/6

③ میزان: 620/3

کرتا ہے۔" علامہ ابن جوزی نے اسے موضوعات ① میں اور علامہ سیوطی نے اللآلئ المصنوعۃ ② میں ذکر کیا ہے۔

تنبیہ:

حافظ سیوطی نے یہی روایت سعید بن منصور اور بیہقی سے نقل کی ہے اور ذکر کیا ہے کہ اسے حسان بن عطیہ روایت کرتے ہیں ③ مگر یہ درست نہیں۔ علامہ آلوسی ④ اور علامہ شوکانی ⑤ نے بھی اسی طرح غالباً علامہ سیوطی ہی سے اسے حسان بن عطیہ کی حدیث ہی قرار دیا ہے جو بہر نوع درست نہیں۔

3۔ حضرت ابوبکر کی ہی روایت خطیب بغدادی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ذکر کی ہے اور وضاحت کر دی ہے کہ یہ اس سند سے باطل ہے۔ یہ دراصل محمد بن عبدالرحمٰن الجدعانی کی روایت ہے جسے وہ اپنی سند سے حضرت ابوبکرؓ سے بیان کرتا ہے۔ محمد بن عبد بن عامر (کذاب) نے اس کا متن چوری کر کے اسے حضرت انسؓ کی حدیث بنا دیا ہے۔ ⑥

4۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ مسند بزار میں ہے یعنی "ہر چیز کا دل ہے اور قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔" ⑦ مگر اس کی سند بھی ضعیف ہے کیونکہ حمید مکی مولی ابن علقمہ راوی مجہول ہے۔ ⑧

5۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے سورۂ یٰسٓ سنی اس نے گویا بیس دینار فی سبیل اللہ خرچ کیے، جس نے اس کی تلاوت کی اس نے گویا بیس حج کیے اور جس نے اسے لکھ کر پی لیا اس کے پیٹ میں ایک ہزار یقین، ایک ہزار نور، ایک ہزار برکت، ایک ہزار رحمت داخل کر دی جاتی ہے...... الخ ⑨

---

① موضوعات: 247/1 ② اللآلئ المصنوعۃ: 234/1

③ الدر المنثور 256/5 ④ روح المعانی: 193/22 ⑤ فتح القدیر: 358/4

⑥ تاریخ بغداد: 388/2، فوائد المجموعۃ ص: 301

⑦ ابن کثیر: 743/3، کشف الأستار: 87/2، الدر المنثور

⑧ تقریب ص: 85 ⑨ تاریخ بغداد: 248/6

مگر یہ روایت بھی سخت ضعیف ہے۔ امام ابوعلی نیسا پوری، امام دار قطنی اور امام حاکم نے کہا ہے کہ اس کا راوی اسماعیل بن یحییٰ کذاب ہے۔ حافظ صالح جزرہ نے کہا ہے: وہ حدیث گھڑتا تھا۔ امام ابن عدی نے کہا ہے: عموماً اس کی حدیثیں باطل ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں: وہ بالاتفاق متروک ہے اور اس کی یہ حدیث اس کی ''بلایا'' میں سے ہے۔ ①
علامہ ابن جوزی اور علامہ شوکانی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ ②

6۔ حضرت حسان بن عطیہ سے مرسلاً مروی ہے کہ جس نے یٰسٓ پڑھی اس نے گویا دس بار قرآن پڑھا۔ ③

7۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت ہے کہ جو یٰسٓ اللہ کی رضا کے لیے پڑھتا ہے اس کی بخشش ہو جاتی ہے اور یٰسٓ کا پڑھنا پورا قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔ ④

مگر یہ روایت مرسل ہے اور معتمر بن سلیمان اپنے باپ سے بلاغاً حسن بصری سے روایت کرتے ہیں، اس لیے یہ متصل بھی نہیں، ضعیف ہے۔

8۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو رات کو اللہ کی رضا کے لیے یٰسٓ پڑھتا ہے اس کی اس رات مغفرت کر دی جاتی ہے۔'' ⑤

مگر یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ حسن بصری مدلس ہیں اور روایت معنعن ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ ان کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں، البتہ یہی روایت ابویعلی میں بھی ہے اور اس میں ''سمعت أباهريرة'' ہے یعنی حسن بصری کے سماع کی صراحت ہے غالباً اسی وجہ سے حافظ ابن کثیر ⑥ اور علامہ شوکانی ⑦ نے کہہ دیا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔ حالانکہ اس کا دارومدار ہشام بن زیاد ابوالمقدام مدنی پر ہے اور وہ ''متروک'' ہے، اس لیے حافظ ابن کثیر کا یہ فیصلہ درست نہیں۔ حافظ ابن جوزی نے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو

---

① میزان: 253/1

② الفوائد المجموعة، ص:300 الموضوعات 246/1، اللآلئ 233/1

③ شعب الإيمان:479/2 ④ دارمي: 328/2 ⑤ دارمي: 328/2، طيالسي وغيره

⑥ تفسير ابن كثير 743/3 ⑦ فتح القدير 358/4

موضوعات ① میں ذکر کیا ہے مگر یہ بھی درست نہیں بلکہ یہ انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ②

یہی روایت حضرت جندب بن عبداللہ، عبداللہ بن مسعود اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے مگر ان کی اسانید بھی ضعیف ہیں۔ علامہ البانیؒ نے تفصیلاً ان پر نقد کیا ہے۔ ③

امام دارقطنیؒ نے بھی کہا ہے کہ یہ روایت موقوفاً یا مرفوعاً ثابت نہیں۔ اور امام عقیلیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ اس متن کی روایت کمزور ہے۔ علامہ سیوطیؒ اور علامہ شوکانیؒ نے جو اسے "علی شرط الصحیح" کہا یہ محل نظر ہے۔ علامہ البانیؒ اور علامہ معلمیؒ نے الفوائد المجموعہ کے حواشی میں اس کی کمزوری واضح کر دی ہے۔ ④

9۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس نے یٰسٓ پڑھی اس نے گویا دس بار قرآن پڑھا۔ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے یٰسٓ ایک بار پڑھی اس نے گویا دو بار قرآن پڑھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو کچھ آپ نے سنا آپ بیان کرتے ہیں اور جو کچھ میں نے سنا وہ میں بیان کرتا ہوں۔ ⑤

علامہ سیوطیؒ نے یہی روایت ابن مردویہ اور بیہقی سے الدرالمنثور ⑥ میں نقل کی ہے اور اس میں "ابو ہریرۃؓ" کی بجائے "ابو برزۃؓ" ہے مگر صحیح ابو ہریرۃؓ ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ شعب الایمان میں ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اسے العلل ⑦ میں معلقاً نقل کیا ہے اور امام ابو حاتم سے نقل کیا ہے کہ یہ منکر ہے بلکہ علامہ البانی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ ⑧

10۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں پسند کرتا ہوں کہ میری امت کے ہر فرد کو یہ سورت یاد ہو۔" ⑨

---

① موضوعات 247/1

② عجالة الراغب المتمني في تخريج عمل اليوم والليلة لابن السني، رقم: 676

③ سلسلة الاحاديث الضعيفه: 6623 ④ الفوائد المجموعه ص:303

⑤ شعب الإيمان:481/2 ⑥ الدر المنثور :256/5 ⑦ العلل 67/2

⑧ الضعيفة، رقم: 4636 ⑨ بزار

مگر اس میں ابراہیم بن حکم بن ابان راوی منفرد ہے اور ضعیف ہے۔ ① حتی کہ امام ابن معین ؒ نے "لیس بشیء" امام نسائی ؒ نے متروک اور امام بخاری ؒ نے "سکتوا عنه" کہا ہے۔ ②

11۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو ہر رات یٰس پڑھنے پر مداومت کرتا ہے وہ شہید فوت ہوگا۔" ③

علامہ سیوطی ؒ نے الدر المنثور میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ بلکہ اس کی سند سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی سعید بن موسیٰ ازدی "کذاب" ہے۔ ④

امام ابن حبان ؒ نے اسے حدیثیں گھڑنے والا قرار دیا ہے۔ ⑤

علامہ سیوطی ؒ نے اسے ذیل الأحادیث الموضوعة میں ذکر کیا ہے۔ ⑥

12۔ امام عطاء بن ابی رباح بلاغاً روایت کرتے ہیں کہ جس نے دن کے ابتدا میں یٰس پڑھی اس کی حاجات پوری کر دی جائیں گی۔ ⑦

یہ بلاغاً یعنی مرسلاً ہے، البتہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

13۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"جو شخص یٰس صبح کے وقت پڑھے گا اس دن شام تک اسے آسانی ملے گی اور جو رات کی ابتدا میں پڑھے گا اسے اس رات صبح تک آسانی ملے گی۔" ⑧

یہ موقوفاً ہے، البتہ اس کی سند حسن ہے اور حکماً مرفوع ہے۔

14۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① تقریب ② میزان: 27/1 وغیرہ
③ طبرانی، بزار ④ مجمع الزوائد: 97/7
⑤ میزان: 159/2
⑥ الضعیفة، رقم: 6844 ذیل الاحادیث الموضوعة ص: 24
⑦ دارمی 328/2 ⑧ دارمی 328/2

''جس مرنے والے کے پاس یٰسٓ پڑھی جائے اللہ اس پر آسانی فرما دیتے ہیں۔'' ①

یہ روایت امام ابونعیم ؒ نے بھی ذکر کی ہے ② مگر اس کا راوی مروان بن سالم سخت ''ضعیف'' ہے۔ امام احمد ؒ اور امام نسائی ؒ نے ''ليس بثقة'' اور امام ساجی ؒ اور ابوعروبہ الحرانی نے ''يضع الحديث'' (وہ حدیثیں وضع کرتا تھا) کہا ہے۔

دیلمی میں بھی اسی سند سے یہ روایت ہے مگر اس میں ''عن أبي الدرداء وأبي ذر'' ہے، گویا اسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ ③

15۔ حضرت معقل بن یسار ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ جو اِسے اللہ کی رضا اور آخرت کے لیے پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کے پہلے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ یٰسٓ فوت ہونے والوں پر پڑھو۔'' ④

مگر یہ روایت بوجوہ ضعیف ہے:

1۔ اس کا ایک راوی ابوعثمان ہے، جو «النهدي» نہیں ہے۔ سلیمان تیمی اس سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ امام علی بن مدینی ؒ نے اسے ''مجہول'' اور حافظ ذہبی ؒ نے ''لا يعرف'' کہا ہے۔ ⑤

تنہا امام ابن حبان نے اسے ذکر کیا ہے ⑥، مگر ایسے مجہول راویوں کو تنہا ان کا ''الثقات'' میں ذکر کرنا اہل علم کے ہاں قابل اعتبار نہیں، جیسا کہ لسان المیزان کے مقدمہ میں حافظ ابن حجر ؒ نے وضاحت کی ہے۔ ⑦ حافظ ابن حجر ؒ نے بھی تقریب میں اسے ''مقبول'' ہی کہا ہے۔ ⑧ اور تقریب کے مقدمے میں انھوں نے صراحت کر دی ہے کہ

---

① ابن مردویہ، دیلمی ② اخبار اصبہان 188/1 ③ إرواء الغليل: 152/3
④ أبو دواد: 3121، أحمد: 26,27/5، ابن ماجه: 1448 وغيرهم
⑤ تهذيب: 163/12، ميزان: 550/4 ⑥ الثقات: 326/2
⑦ لسان الميزان: 14/1 ⑧ تقريب: 417

مقبول تبھی ہوگا جب اس کی متابعت ہو، ورنہ وہ ''لین الحدیث'' ہوگا۔ اور ابوعثمان کی متابعت ثابت نہیں۔

i۔ ابوعثمان اسے اپنے باپ سے روایت کرتا ہے اور وہ بھی مجہول ہے۔

ii۔ ابوعثمان اسے کبھی اپنے باپ سے اور کبھی حضرت معقلؓ سے بلا واسطہ بیان کرتا ہے، اور کبھی اسے موقوفاً بیان کرتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

«« أعله ابن القطان بالاضطراب، وبالوقف، وبجهالة حال أبي عثمان وأبيه. ونقل أبوبكر بن العربي عن الدار قطني أنه قال: هذا حديث ضعيف الإسناد، مجهول المتن، ولا يصح في الباب حديث.»» ①

''ابن قطان نے اسے اضطراب، وقف اور ابوعثمان اور اس کے باپ کی جہالت کی وجہ سے معلول کہا ہے۔ ابن العربیؒ نے امام دارقطنیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث سنداً ضعیف، متناً مجہول ہے اور اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔''

علامہ البانیؒ نے بھی اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ ②

16۔ ابوقلابہؒ فرماتے ہیں:

''جس نے یٰسٓ کو پڑھا اسے بخش دیا جائے گا۔ جو کھانے کی کمی کے خوف سے یٰسٓ پڑھے اسے وہ کھانا کافی ہوگا۔ جس نے اسے میت کے پاس پڑھا اس پر آسانی ہوجائے گی۔ جس عورت کے ہاں ولادت میں مشکل آئے اس کے پاس اسے پڑھا جائے تو اس عورت پر آسانی ہوجائیگی۔ جس نے یٰسٓ کو پڑھا اس نے گویا گیارہ مرتبہ قرآن پڑھا۔ ہر چیز کا دل ہوتا ہے، قرآن کا دل یٰسٓ ہے۔'' ③

امام بیہقیؒ نے فرمایا ہے:

---

① التلخیص: 104/2 ② إرواء الغليل: 150/3 ③ شعب الإيمان: 482/2

''ابو قلابہ کبار تابعین میں سے ہیں۔ اگر ان سے یہ صحیح ہے تو یہ انھوں نے بلاغاً کہا ہے۔''

مگر یہ صحیح نہیں۔ غلیل بن مرة راوی ضعیف ہے۔ ①

17۔ حضرت محمد بن علی ابو جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو اپنے دل میں سختی پائے وہ پیالے میں زعفران سے یٰسٓ لکھ کر پی لے۔'' ②

امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی صحت میں نظر ہے۔ عرض ہے کہ اس کا راوی عمرو بن ثابت بن ابی المقدام ''ضعیف'' ہے۔ ③ اس لیے یہ بھی قابل استدلال نہیں۔

18۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ایک روایت ہے کہ جو جمعہ کے روز اپنے والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور ان کے پاس یٰسٓ پڑھتا ہے، ہر حرف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دے گا۔ ④

امام ابن عدی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام دار قطنی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کے راوی عمرو بن زیاد کو ''وضاع'' قرار دیا ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسے سہارا دینے کی جو بلا جواز کوشش کی ہے اس کی دلچسپ تفصیل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ⑤

19۔ امام ابو نصر سجزی رحمہ اللہ نے ''الإبانة'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قرآن میں ایک سورت ہے جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ''العظیمة'' کہا جاتا ہے۔

---

① تقريب، ص:94

② حاكم، شعب الإيمان: 482/2، نوادر الأصول: 88/6

③ تقريب، ص:258

④ ابن النجار، الدر المنثور، ابن عدي، أخبار أصبهان

⑤ سلسلة الأحاديث الضعيفة، رقم:50

اس کو پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کے ہاں ''الشریف'' کہلاتا ہے۔ اسے پڑھنے والا قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ ومضر کے لوگوں سے زیادہ افراد کی شفاعت کرے گا۔ اور وہ سورت یٰسٓ ہے۔''

علامہ سیوطیؒ نے کہا ہے: امام ابونصر سجزیؒ نے اسے ''حسن'' قرار دیا ہے۔ ① تتبع بسیار کے باوجود اس کی سند نہیں ملی۔ علامہ علی المتقیؒ نے بھی اسے کنز العمال میں مطولاً ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے: اس کے راوی مقبول وثقہ ہیں اور یہ سب سے احسن حدیث ہے۔ ② نیز یہ بھی کہا ہے کہ اسے حکیم ترمذی نے محمد بن علی سے مرسلاً اور امام حاکم نے تاریخ میں حضرت علیؓ سے موصولاً روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی کی النوادر میں یہ روایت اصرم بن حوشب جیسے کذاب راوی سے مروی ہے۔ ③ اس کا استاد بقیہ بن ولید مدلس ہے۔ واللہ اعلم!

20۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مسند بزار میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں پسند کرتا ہوں کہ میری امت کے ہر فرد کو سورۂ یٰسٓ یاد ہو۔'' ④

مگر یہ روایت ابراہیم بن حکم بن ابان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ بلکہ طبرانی میں اسی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی الفاظ سورۃ الملک کے بارے میں ہیں۔ ⑤

امام سفیان ثوری کے آخری لمحات میں ان کے پاس تھا، انھوں نے مجھے یٰسٓ پڑھنے کا فرمایا۔ چنانچہ میں نے سورہ یٰسٓ کی تلاوت کی ادھر سورہ مکمل ہوئی اور ادھر انکی روح پرواز کر گئی۔ ⑥

یہ ہیں وہ احادیث واقوال جو عموماً سورہ یٰسٓ کی فضیلت میں منقول ہیں۔ ان میں بعض موضوع، بعض ضعیف ہیں۔ البتہ بعض آثار حسن ہیں جن سے سورہ یٰسٓ پڑھنے کی فضیلت میں ضعیف رایات کو تقویت ہو جاتی ہے۔ علامہ محمد بن عبدالواحد الغافقی نے ''لمحات الانوار'' میں ان احادیث وآثار کو جمع کیا ہے۔

---

① الدر المنثور: 257/5 ② کنز العمّال: 528/1 رقم: 2363 ③ النوادر: 95/6

④ مسند بزار 87/3 ⑤ طبری، نیز دیکھیے: مجمع الزوائد 127/7

⑥ السیر ج 7، ص 227

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ [يٰسٓ:2,1]

''یٰسٓ ۔اس حکمت سے بھرے ہوئے قرآن کی قسم۔''

﴿يٰسٓ﴾ یہ حروف مقطعات ہیں۔ قرآنِ مجید کی 29 سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے جنھیں علیحدہ علیحدہ اور جدا جدا کر کے پڑھا جاتا ہے۔ سورتوں کی ابتدا میں ان حروف کے بارے میں اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں جن کی ضروری تفصیل ہم سورۂ ق کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں، شائقین اس پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

امام رازی نے فرمایا ہے کہ حروف مقطعات میں سے بعض سورتوں میں صرف ایک حرف استعمال ہوا ہے، بعض میں دو، بعض میں تین اور تین سے زائد پانچ حروف تک۔ اور حروف تہجی میں سے ہی بعض حروف کو حروف مقطعات کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، مثلاً: ''س'' کو ذکر کیا گیا ہے ''ش'' کو نہیں کیا۔ ''ص'' کو ذکر کیا گیا ہے ''ض'' کو نہیں۔ اسی طرح ''ط، ع'' کو ذکر کیا گیا ہے ''ظ'' اور ''غ'' کو نہیں۔ اس تخصیص کی صحیح حکمت تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے یا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کا علم عطا فرمایا ہے۔

ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ عبادات بعض ''قلبی'' ہیں، بعض ''لسانی'' ہیں اور بعض جوارح اور اعضاء سے متعلق ہیں۔ اور ان تمام عبادات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی حقیقت وحکمت عقل سے معلوم ہو جاتی ہے، دوسری وہ جس کی حکمت کا کوئی علم نہیں ہو پاتا، چنانچہ اعتقادی طور پر جن کا تعلق دل سے ہے ان میں توحید باری تعالیٰ اور اس کے قادر مطلق ہونے، نبی اور نبی کی صداقت کو ہم عقل سے جان سکتے ہیں۔ مگر پل صراط، جو بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا اس سے مومنین گزر جائیں گے۔ اسی طرح میزان میں اعمال کا وزن ہونا، حالانکہ دیکھنے والے کو تو اعمال کا کوئی وزن اور ثقل نظر نہیں آتا۔ نیز جنت اور دوزخ کی تفصیلات کو عقل سے نہیں جان سکتے۔ اسی طرح اعمالِ جوارح میں سے بعض کی

حکمت سمجھ آتی ہے بعض کی نہیں۔ اللہ کی بندگی کے لیے اس کی عبادت ہونی چاہیے مگر نماز کی تعداد اور رکعات کی تعیین، زکاۃ کا نصاب، حج کی بعض مخصوص ادائیں جیسے رمی جمار، سعی اور اضطباع کی حکمت وحقیقت سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ اسی طرح عبادات لسانیہ ہیں۔ تسبیح وتحمید اور قرآنِ مجید کی تلاوت ہے۔ ہم بہت سی آیات کے معانی ومطالب کو عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر حروف مقطعات کے مطالب عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ جن امور کے مطالب ہم سمجھنے سے قاصر ہیں ان سے مقصود محض عبودیت کا اظہار واقرار ہے۔ بہرحال حروف مقطعات جیسے لکھے ہیں اسی طرح پڑھنے مطلوب ومقصود ہیں اور باعث اجر وثواب ہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من قرأ حرفاً من كتاب اللّٰه فلهٗ به حسنة، والحسنة بعشر أمثالها. لا أقول: «الٓمٓ» حرف، ولكن ألف حرف، و لام حرف، وميم حرف.)) ①

"جو اللہ کی کتاب سے ایک حرف پڑھتا ہے اسے ایک نیکی ملتی ہے اور ایک نیکی کا دس گنا ثواب ہے۔ میں نہیں کہتا: "الٓمٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، اور میم ایک حرف ہے۔"

اس لیے ہم ان حروف کو اسی طرح پڑھنے کے مکلف ہیں۔ ہم تمام امور کی حقیقت اور اس کا فلسفہ سمجھنے کے مکلف نہیں۔ عبدیت کا بس یہی تقاضا ہے کہ ہم حکم کی بجا آوری کریں۔

﴿یٰسٓ﴾ کا مفہوم:

اس حقیقت کے باوصف بعض مفسرین نے اس کا مفہوم بیان کیا ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، عکرمہ، ضحاک، حسن بصری اور سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یٰسٓ کے معنی "یا إنسان" ہیں۔ عکرمہ اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ لغت حبشہ میں بھی یہی مفہوم ہے۔ ②

محمد بن حنفیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد "یا محمد" ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس

---

① ترمذی، رقم: 2910 ② ابن کثیر، ابن جریر وغیرہ

کا مصداق ہیں۔ابوبکر الوراق نے کہا ہے کہ مراد "یا سیّد البشر" ہے۔ ①

زید بن اسلمؒ اور امام مالکؒ کا خیال ہے کہ "یٰسٓ" اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔حضرت ابن عباس سے بھی ایک قول یہی ہے کہ "یٰسٓ" اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ ②

اسی سے امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ "یٰسٓ" کسی انسان کا نام رکھنا مناسب نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔علامہ ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ چونکہ "یٰسٓ" اللہ تعالیٰ کے ان ناموں میں سے ہے جس کے معنی معلوم نہیں، ممکن ہے کہ اس کے معنی ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہوں، اس لیے کسی انسان کو یہ نام رکھنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے۔البتہ اللہ تعالیٰ کے وہ نام تو رکھے جاسکتے ہیں جن کے معنی معلوم ہیں، جیسے عالم، قادر، مرید اور متکلم وغیرہ۔رہی یہ بات کہ قرآنِ مجید میں جو ﴿سَلَامٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْنَ﴾ ③ ہے تو اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ یہ حروف تہجی سے مرکب ہے، حروف مقطعات پر مشتمل نہیں۔گویا امام مالکؒ نے "یٰسٓ" نام رکھنے سے منع کیا ہے، "الیاس" یا "اِل یاسین" رکھنے سے منع نہیں کیا۔ ④

بعض نے ﴿سَلَامٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْنَ﴾ میں آل محمد ﷺ مراد لی ہے۔مگر یہ قرآن پاک کے سیاق کلام کے ہی منافی ہے۔جیسا کہ تفصیلاً علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں وضاحت کردی ہے۔ ⑤

امام قتادہؒ کا خیال ہے کہ قرآنِ مجید میں تمام حروفِ مقطعات قرآنِ مجید کے نام ہیں۔ ⑥

چنانچہ "یٰسٓ" سورت کا نام ہے جیسے "طٰہٰ" اور "قٓ" سورتوں کے نام ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک ہے۔بلکہ اس بارے میں

---

① ابن أبي شيبة، بيهقي، ابن المنذر، قرطبي، الدر المنثور: 258/5
② ابن جرير، ابن كثير ③ الصافات:130 ④ قرطبی
⑤ قرطبی 118/15 ⑥ ابن جریر وغیرہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سات نام رکھے ہیں، اور بعض نے روایت کیا ہے کہ دس نام رکھے ہیں، ان میں "طٰهٰ" اور "یٰسٓ" میرے نام ہیں۔ مگر اس قسم کی کوئی روایت قابلِ اعتبار نہیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ابوبکر محمد بن حسن بن احمد نقاش بغدادی سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی نبی کے نام کی قسم نہیں کھائی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی تعظیم اور بزرگی ہے۔ ①

مگر نقاش کذاب ہے۔ ابوالقاسم اللالکائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نقاش کی تفسیر "شفاء الصدور" کا باعث نہیں بلکہ "إشقاء الصدور" کا باعث ہے۔ ②

اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم کھائی۔ مگر «یٰسٓ» کو آپ کا اسم گرامی قرار دے کر اسے قسم کے معنی میں لینا کعب احبار کا بے سند قول ہے جسے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ بلکہ اس قول میں معنوی اشکال کی وجہ سے علامہ علی قاری رحمہ اللہ اور علامہ خفاجی رحمہ اللہ نے شرح الشفاء ③ میں کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کعب احبار کے قول کو ضعیف قرار دیا جائے۔

زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ «یٰسٓ» میں علی حسب الاقوال "یا إنسان"، "یا سیّد البشر" اور "یا محمد" مراد ہے اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ بعد کی آیت ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ سے بھی کچھ اس کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کائنات میں بمنزلہ دل کے ہیں اور سورۂ «یٰسٓ» قرآن کا دل ہے۔ یہ کس قدر پیارا آغاز ہے کہ قرآن کے دل کو کائنات کے دل کے ذکر سے شروع کیا جارہا ہے۔ ④ واللّٰهُ أعْلَمُ

﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴾ قسم ہے قرآنِ حکیم کی یا حکمت بھرے قرآن کی۔ "القرآن" کے بارے میں ہم ضروری وضاحت تفسیر سورۂ قٓ کی ابتدا میں کرچکے ہیں، شائقین اس کی

---

① الشفاء، قرطبی ② میزان: 520/3
③ شرح الشفاء 191,192/1 ④ روح المعاني: 59/23

مراجعت فرمائیں۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ''وَ'' قسم کے لیے ہے۔ متکلم یا قسم کھانے والے کے نزدیک جس چیز کی عظمت ہوتی ہے اسی کی وہ قسم کھاتا ہے۔ اس سے قرآنِ مجید کی عظمت عیاں ہوتی ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ ①

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھے بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں اور بہت عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عظیم ہے اور اس کا قرآن بھی عظیم ہے۔

اور قسم شہادت کے قائم مقام بھی ہوتی ہے۔ لعان کی صورت میں جو قسمیں اٹھانے کا حکم سورۂ نور میں ہے ② وہ اسی لیے ہے کہ یہ قسمیں شہادتوں کے قائم مقام ہیں۔

اسی طرح کسی مقدمہ میں دو گواہ نہ ہوں تو ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کی اجازت احادیث میں آتی ہے جس کی تفصیل نیل الاوطار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ③ یہاں بھی قسم کو گواہ کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ تو مفہوم یہ ہوگا کہ یہ حکمت بھرا قرآن اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ آپ ﷺ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔

یہاں قرآنِ پاک کی صفت ''الحکیم'' بیان ہوئی ہے جیسے دوسرے مقامات پر ''القراٰن المجید، القراٰن العظیم، قراٰن مبین، قراٰن کریم، صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک اور مقام پر بھی قرآن کی یہی صفت ''الحکیم'' ذکر ہوئی ہے:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ۝﴾ ④

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ۝﴾ ⑤

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ﴾ ⑥

---

① الحجر:87 ② النور: 6-9 ③ نیل الأوطار:295/8

④ یونس:1 ⑤ لقمان:1-2 ⑥ آل عمران:58

قرآنِ مجید کے اسماء میں ایک ''الذکر'' بھی ہے اور یہاں اسی کے ساتھ یہ صفت ''الحکیم'' بیان ہوئی ہے۔ ''الحکیم'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بھی صفت ہے، کہا جاتا ہے:

«فعل الحكيم أو قول الحكيم لا يخلوا عن الحكمة.»

''حکیم کا فعل یا قول حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔''

اس لیے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بھی حکمت سے خالی نہیں۔

﴿الحكيم﴾ بعض نے کہا ہے کہ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے یعنی ''حکیم'' بمعنی حاکم، قاضی، حکم اور فیصلہ کرنے والا۔ الزجاج نے کہا ہے: ''حکم'' کے اصل معنی منع کرنا اور روکنا ہیں۔ حاکم کو بھی حاکم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ فریقین کو باہم ظلم وزیادتی سے روکتا ہے۔ بعض نے ''الحکیم'' کو مُحکِم کے معنی میں لیا ہے یعنی اشیاء کو مضبوط اور پختہ کرنے والا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ''الحکیم'' سے مراد علم وحکمت والا، اور حکمت کے معنی ہیں افضل ترین علوم میں سے افضل اور بہترین کو جاننا و پہچاننا۔ ①

علامہ راغب فرماتے ہیں کہ ''الحکمۃ'' علم وفہم کے ذریعے حق بات کو دریافت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کو جاننا اور انھیں کمال خوبی کے ساتھ پیدا کرنا ہے اور انسانوں کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھے کاموں کو سرانجام دینا۔ ② علامہ جوہری نے ''الصحاح'' میں کہا ہے:

«الحكمة من العلم، والحكيم: العالم، وصاحب الحكمة والحكيم المتقن للأمور.» ③

''حکمت علم ہے اور حکیم عالم ہے اور حکمت والا اور حکیم وہ ہے جو معاملات کو بحسن وخوبی سرانجام دیتا ہے۔''

---

① النهاية لابن الأثير وغيره ② المفردات

③ الصحاح:476/2

علامہ ابن حیان اندلسی نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں:

««الحكمة الفقه في الدين، والفهم الذي هو سجية ونور من الله تعالىٰ.»»

''حکمت، دین میں سمجھ اور فہم کو کہتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ایک فطری خصلت، ملکہ اور نور ہے۔''

امام مجاہد فرماتے ہیں: حکمت، قرآن کا فہم ہے۔ مقاتل کہتے ہیں حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کا نام ہے۔ ائمہ لغت اور مفسرین کے مندرجہ بالا اور اسی نوعیت کے دیگر اقوال نقل کر کے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز اور فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور پر ہو جاتا ہے اور اس کے مطابق صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔'' ①

گویا ''حکمت'' وسیع مطالعے کا ثمرہ نہیں بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطیہ اور موہبت ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت ہے جس سے وہ اپنے بندوں کو سرفراز فرماتے ہیں، چنانچہ آل ابراہیم پر اپنے احسانات کے حوالے سے فرمایا ہے:

﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝﴾ ②

''تو ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور ہم نے انھیں بہت بڑی سلطنت عطا فرمائی۔''

حضرت داود علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ ③

''اور ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی اور اسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا فرمائی۔''

---

① سیرت النبی: 91/4 ② النساء: 54 ③ ص: 20

حضرت لقمان کے بارے میں بھی فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ﴾ ①

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی کہ اللہ کا شکر کر۔“

ان کی حکمت کی باتوں کا بیان قرآنِ مجید اور آثار میں موجود ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہ اور اس موضوع کی دیگر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ”حکمت“ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، یہ وسعت علم اور علمی کدو کاوش کا نتیجہ نہیں۔ ②

قرآنِ مجید اس لیے ”حکیم“ ہے کہ اس کی آیات اور اس کے فیصلے محکم اور قطعی ہیں۔ نہ اس میں لفظی خامیاں ہیں، نہ ہی معنوی۔ اسلوب بیان بڑا حکیمانہ ہے، موقع محل کی مناسبت سے ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی، صیغہ غائب سے خطاب کے پہلو میں صیغہ حاضر سے بھی خطاب ہے۔ خبر کے سیاق میں استفہام کا سیاق بھی پایا جاتا ہے۔ اور یہ تنوع فصاحت و بلاغت کی جان ہے۔ وہ لوگوں کی زندگی کا صحیح صحیح فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے اوامر ونواہی حکمت و دانائی پر مبنی ہیں، جو عقل سلیم اور فطرت کے مطابق ہیں۔ اس کے وعدے اور وعید، اس کے قصص و واقعات میں بھی حکمت ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے دور کوعوں میں آداب و اخلاق، حسن معاملہ، مال و جان کی حرمت، فواحش سے اجتناب اور مالی معاملات کے ضوابط بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ ③

”یہ اس میں سے ہے جو تیرے رب نے حکمت میں سے تیری طرف وحی کی۔“

قرآنِ پاک کی صفت ”الحکیم“ ذکر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قرآنِ مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت ہی میں نہیں، اس کے حکیمانہ فیصلے بھی معجز ہیں، اسی میں انسانوں کے ہر دکھ کا مداوا اور ہر درد کا درماں ہے، اسی کے بارے ارشاد فرمایا:

﴿لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ﴾ ④

---

① لقمان:12 ② مزید تفصیل کے لیے سیرت النبی (4/87-95) ملاحظہ ہو۔

③ بنی اسرائیل:39 ④ حٰمٓ السجدۃ:42

"اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔"

کامل حکمت بس اسی کتاب کا خاصہ ہے:

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ o حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُo﴾ ①

"اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس کئی خبریں آئی ہیں جن میں باز آنے کا سامان ہے۔ کامل دانائی کی بات ہے، پھر (بھی) ڈرانے والی چیزیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں۔"

سچائی کی سب باتیں اس میں ہیں۔ اس میں تحریف وتبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ ② "اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف کے اعتبار سے پوری ہوگئی، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔"

شاعر مشرق نے بھی کہا ہے:

آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است وقدیم

حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوع انسان را پیغام آخریں — حامل او رحمۃ للعالمین

قرآنِ مجید میں حدود وقصاص اور میراث وغیرہ کے احکام بیان کرتے ہوئے عموماً اللہ کی صفت "علیم" و "حکیم" کا ذکر بھی اسی بنا پر ہے کہ اس کے یہ فیصلے پورے علم اور کامل حکمت پر مبنی ہیں، چنانچہ سورۃ النساء میں وراثت کے احکام ومسائل بیان کرتے ہوئے پہلی آیت کے اختتام پر فرمایا:

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ ③

"یہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ حصے ہیں، بے شک اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔"

اسی طرح محرمات کا ذکر کرتے ہوئے پہلے فرمایا:

---

① القمر: 5،4 ② الانعام 115 ③ النساء: 11

﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ ①

"بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔"

مزید اسی مسئلے کی وضاحت کے بعد فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○﴾ ②

"اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔"

سورۃ النساء ہی میں قتل خطا کی دیت وفدیہ کے احکام بیان کرتے ہوئے بھی یہی فرمایا:

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○﴾ ③

"اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا، کمال حکمت والا ہے۔"

میاں بیوی کے مابین نزاع واختلاف اور ان سے متعلقہ ہدایات کے بعد بالآخر فرمایا:

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ○﴾ ④

"اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا کمال حکمت والا ہے۔"

یہ اور اسی نوعیت کے دیگر احکام کے بیان میں بطور خاص جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت "الحکیم" بیان ہوئی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ انسانوں کی ہر ضرورت ومصلحت کا اسے خوب علم ہے۔ اس نے اپنی حکمت کاملہ سے ایسے احکام وضع کیے ہیں جن میں انسانوں کی تمام ضروریات کا پورا پورا لحاظ ہے۔

اسی طرح مومن عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان سے نکاح کے مسائل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ ⑤

---

① النساء:24 ② النساء:26 ③ النساء:92

④ النساء:130 ⑤ الممتحنة:10

”یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔“

”احکم الحاکمین“ بھی وہی ہے: ”اور وہی سب سے احسن فیصلہ کرنے والا ہے۔“ ①

اس لیے حکم ہے کہ اسی کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ ②

بلکہ یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کی خواہشات کی پروا کیے بغیر اللہ کے حکم کے مطابق ہی فیصلہ کرو۔ ③

اور یہ فیصلہ بھی فرمایا دیا کہ جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔ ④

اس کے برعکس مومن کا طرز عمل یوں بیان فرمایا:

”کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔“ ⑤

نیز فرمایا:

”ایمان والوں کی بات، جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے سوا نہیں ہوتی کہ وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“ ⑥

حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ ⑦ اس کی حاکمیت میں کوئی شریک و مشیر نہیں۔ ⑧ حکم تکوینی بھی اسی کا اور حکم تشریعی بھی اسی کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جو بھی حکم تشریعی فرماتے ہیں وہ اللہ کے حکم سے ہی فرماتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ وحی الٰہی سے

---

① المائدة:50 ② المائدة:48 ③ المائدة:49

④ المائدة:44-46 ⑤ الأحزاب:36 ⑥ النور:51

⑦ الأنعام:57، يوسف:40، 67 ⑧ الكهف:26

بولتے ہیں۔ ①

اسی لیے آپ ﷺ کی تابعداری اور اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ ② اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے جو سراسر گمراہی۔ ③ اور جہنم جانے کا باعث ہے۔ ④ أعاذنا الله منه.

قرآنِ حکیم کی ''حکمت'' اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ⑤

حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ یہاں ''الحکمۃ'' سے مراد قرآنِ مجید کی معرفت اور اس کا فہم ہے۔ بلاشبہ جسے یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ فواحش سے بچ جاتا ہے اور حکمت و دانائی پر چل نکلتا ہے۔ اور اگر ''الحکمۃ'' سے مراد حکم و فیصلہ ہو، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، تب بھی وہی فیصلہ درست اور حق پر مبنی ہوگا جو ''الحکمۃ'' یعنی قرآنِ مجید اور وحی الٰہی کے موافق ہوگا۔ وما ذا بعد الحق إلا الضلال.

اس کی تائید صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا حسد إلا في اثنتين: رجل آتاه الله مالًا فسلّطه على هلكته في الحق، وآخر آتاه الله حكمة فهو يقضي بها ويعلمها.)) ⑥

''دو آدمیوں کے علاوہ کسی پر حسد (کرنا جائز) نہیں: ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا تو وہ اسے راہِ حق میں خرچ کر دیتا ہے، اور دوسرا وہ جسے اللہ حکمت دیتا ہے تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔''

---

① النجم: 4,3 ② النساء:80 ③ الأحزاب:36
④ النساء:14 ⑤ البقرة:269
⑥ بخاري: 73/6، مسلم: 816

ظاہر ہے کہ حکمت کے مطابق فیصلے اور اس کی تعلیم دینے میں قرآنِ مجید کے مطابق فیصلے کرنا اور اس کی تعلیم دینا ہی مراد ہے۔

البتہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں جہاں کتاب وحکمت کا یا اللہ کی آیات وحکمت کا یا قرآن وحکمت کا ذکر آیا ہے وہاں حکمت سے مراد قرآنِ مجید کی تفسیر وتعبیر ہے جسے حدیث وسنت سے موسوم کیا جاتا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کے ذکر میں ہے:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ①

اور انھیں کتاب وحکمت سکھائے۔

یا جیسے ازواج مطہرات سے فرمایا گیا ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ﴾ ②

''اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جن آیات اور دانائی کی باتوں کی تلاوت کی جاتی ہے انھیں یاد کرو۔''

گویا ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآنِ مجید اور ''الحكمة'' یعنی حدیث کی جو تلاوت وتکرار ہوتی تھی انھیں حفظ وضبط کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے، اس لیے ''الحكمة'' سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ اور جہاں کتاب وحکمت کا ذکر ہے وہاں ''الحكمة'' سے مراد حدیث وسنت ہے۔

---

① البقرة:129 ، نیز دیکھیے البقرة:151 ، آلِ عمران: 48 ، الجمعة:2

② الأحزاب:34

﴿ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ [یٰسٓ:۳]

''بلاشبہ تُو یقیناً بھیجے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔''

یہ آیت حکمت بھرے قرآن کی قسم کا بیان ہے یعنی مُقسَم علیہ ہے۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ قسم کھانے والا اسی چیز کی قسم کھاتا ہے جس کی عظمت وعزت اس کے ہاں مسلم ہوتی ہے۔ کافر اوّلاً قرآن کی قسم نہیں کھاتا، اگر کھائے گا تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا کہ اس کے نزدیک تو یہ مسلّم ہی نہیں بلکہ اس کی قسم کا اعتبار تبھی ہوگا جب وہ اپنے معبود یا اگر وہ عیسائی ہے تو صلیب کی قسم کھائے گا، پس اللہ نے قرآن کی قسم کھائی ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں قرآنِ حکیم کی عظمت وعزت واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہم ذکر کر آئے ہیں کہ قسم شہادت اور گواہی کے قائم مقام بھی ہوتی ہے، یعنی یہ پُر حکمت کتاب گواہ ہے کہ آپ ﷺ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔

آپ ﷺ نے اعلان رسالت سے پہلے کبھی اس جیسا کلام نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ امی تھے، کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیے تھے۔ چالیس سال کے بعد یکا یک آپ ﷺ نے ایسا فصیح وبلیغ کلام پیش کیا جس کے سامنے عرب کے فصحاء وبلغاء کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ انھیں قرآن کے مقابلے میں ایک سورت بنالانے کا چیلنج دیا گیا مگر وہ چیلنج قبول کرنے سے عاجز رہے۔ انھوں نے مخالفت کے سبھی حربے اختیار کر کے دیکھ لیے مگر وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو پائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ اعلان کروایا:

﴿ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ ①

''کہہ دے: اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ وہ تمھیں اس کی خبر دیتا،

① یونس:16

پس بے شک میں تم میں اس سے پہلے ایک عمر رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے۔''

چالیس سال کا یہ طویل عرصہ تمھارے سامنے ہے۔ میں نے تمھارے اندر رہ کر کاروباری زندگی گزاری ہے، کبھی تم سے نہ جھوٹ اور فریب کا معاملہ کیا نہ ہی اس قسم کا کلام پیش کیا۔ اب اگر یہ آیات تمھیں پڑھ پڑھ کے سنا رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ کے پڑھانے اور فرمانے پر سنا رہا ہوں۔ اگر پہلے تم سے جھوٹ اور فریب کا کبھی کوئی معاملہ نہیں کیا تو اب بھی نہیں کر رہا۔ یہ میرا بنایا ہوا نہیں اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ اس کے ثبوت کے لیے تو دلیل چاہیے تھی، قسم پیش کرنے میں کیا حکمت ہے؟

امام رازیؒ فرماتے ہیں: قسم اس لیے کہ کفار عرب اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ جھوٹی قسم جہان کی بربادی کا باعث ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی مخالفت کا وبال محمد ﷺ کو پہنچے گا۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کے حکم سے قسماً باتیں بتلاتے اور قسماً قرآن کے نزول کا ذکر فرماتے۔ آپ ﷺ کو معبودانِ باطلہ کا وبال کیا پہنچنا تھا، آپ ﷺ کی زندگی میں ہر روز آپ ﷺ کی رفعت و سربلندی میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ یہ چیز اس حقیقت کی غماز تھی کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

اسی طرح قسم کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں دو فریق مناظرہ کرنے اور جھگڑنے والے ہوں تو ان میں سے ایک دوسرے پر غالب آ جائے تو دوسرا کہتا ہے کہ تم محض جھگڑالو ہونے کے ناطے غلبہ پا رہے ہو، ورنہ اپنی دلیل کی کمزوری کا تمھیں بھی احساس ہے، اور یہ بھی جانتے ہو کہ نفس الامر میں حقیقت یوں نہیں جیسے تم کہہ رہے ہو۔ ایسی صورت مناظروں میں پیش آتی رہتی ہے کہ غلبہ پانے والا کوئی دلیل دے تو مغلوب اس کے بارے میں بھی وہی کچھ کہہ سکتا ہے جو پہلی دلیل کے بارے میں کہا ہے۔ ایسی صورت میں قسم کے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے: اللہ کی قسم، میں جھگڑالو نہیں اور نہ ہی ضد کی کوئی بات ہے۔ حقیقت

موقف سے رجوع کرلوں گا۔ یوں قسم سے معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب دلائل و براہین پیش کیے تو کفار نے یہی کہا کہ یہ تو جادو ہے اور یہ تمھیں تمھارے آباء واجداد کے طریقے سے ہٹانا چاہتا ہے:

﴿مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ..الآية﴾ ①

جب دلائل کے جواب میں انھوں نے یہ کج روی اختیار کی تو قسم کی صورت متعین ہوگئی۔

ایک تیسرا جواب یہ بھی دیا ہے کہ یہ محض قسم نہیں بلکہ بظاہر یہ قسم ہے مگر حقیقتاً دلیل ہے کیونکہ قرآن معجزہ ہے اور رسول ہونے کی دلیل بھی یہی معجزہ ہے۔ ②

بلکہ قرآن کی صفت حکیم دلیل ہے کہ یہ پر حکمت کتاب جس میں تہذیب وتمدن، معاش ومعاد، اصلاح احوال اور ایسے ایسے قواعد واصول بیان ہوئے ہیں جن کا کوئی بدل نہیں، اس لیے یہ قسم بھی ہے اور دلیل وشہادت بھی، کہ آپ ﷺ رسولوں میں سے ہیں۔

کفار مکہ کہتے تھے:

﴿لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ ③

''تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔''

انھیں اس پر بڑا تعجب تھا کہ ہم میں سے ایک رسول آیا ہے جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے۔ ان کے اسی تمرد کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ حکمت بھرے قرآن کی قسم، آپ ﷺ یقیناً رسولوں میں سے ہیں، سورۂ قٓ میں فرمایا ہے:

﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝﴾ ④

---

① سبا:43 ② التفسیر الکبیر، ملخصا

③ الرعد:43 ④ ق:2،1

”ق، قسم ہے قرآن کی جو بہت بڑی شان والا ہے۔ بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، تو کافروں نے کہا: یہ ایک عجیب چیز ہے۔“

یہاں مقسم علیہ محذوف ہے۔ سورۂ یٰسٓ سے ہی وضاحت ہوجاتی ہے کہ یہاں مقسم علیہ رسول اللہ ﷺ ہیں کیونکہ ”القرآن یفسر بعضه بعضا.“ (قرآن کا بعض بعض کی تفسیر کرتا ہے۔)

قرآنِ مجید ہی میں اس حقیقت کا اظہار ایک اور اسلوب میں بھی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ ①

”یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انھیں حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور بلاشبہ تُو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔“

یہاں اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ”آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾

”اور بلاشبہ تو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔“

جیسے پہلے اللہ کے رسول ہوگزرے ہیں اور ان کی نبوت و رسالت کو تسلیم کیا گیا ہے، انھی کی مانند آپ ﷺ بھی اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یوسف، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے رسول ہونے سے انکار نہیں تو آپ ﷺ سے انکار کیوں ہے؟

جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا﴾ ②

---

① البقرة:252 ② المزمل:15

”بلا شبہ ہم نے تمھاری طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا۔“

جس طرح فرعون کی طرف رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ تمھاری طرف، یعنی اہل مکہ کی طرف رسول ہیں۔ ایک اور مقام پر کفار کے اسی نوعیت کے اعتراض کے جواب میں فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعاً مِنَ الرُّسُلِ﴾ ①

”کہہ دے میں رسولوں میں کوئی انوکھا نہیں ہوں۔“

یعنی میری طرح پہلے بھی رسول ہو گزرے ہیں جیسے وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے، میں بھی اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

---

① الاحقاف: 9

﴿عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [يٰسٓ:4]

''سیدھی راہ پر ہے۔''

یہ دوسرا مقسم علیہ ہے اور ایک کے بعد دوسری خبر ہے، یعنی حکمت بھرے قرآن کی قسم، آپ ﷺ رسولوں میں سے ہیں، صراطِ مستقیم پر ہیں۔ اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ①

''اور بلاشبہ تُو یقیناً سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔''

نیز یہ بھی فرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ②

''اور بے شک تُو یقیناً انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاتا ہے۔''

''صراط'' کے معنی راستہ کے ہیں، لغت عرب میں ''س'' سے سراط بھی پڑھا گیا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ 'ص' کا اصل 'س' ہے۔ 'ط' کے قرب مخرج کی وجہ سے اسے ''ص'' سے بدلا گیا ہے ③ اور اس کے معنی ہیں آسان راستہ، اور یہ تبھی ہوگا جب راستہ کھلا اور ہموار ہو، نشیب و فراز اس میں نہ ہوں۔ راستہ ہموار نہ ہو تو ہم کہتے ہیں یہ بھی کوئی راستہ ہے۔ اسی لیے اس کی صفت مستقیم بیان ہوئی ہے۔

قیامت کے روز جہنم پر ''صراط'' ہوگا، مگر وہ بال سے باریک ہوگا۔ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے ایمان و اعمال کی بنا پر بعض بجلی کی طرح، بعض تیز ہوا کی طرح، بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح، بعض اونٹ کی رفتار سے گزریں گے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ بعض گرتے پڑتے پار ہوں گے۔ بعض ٹھوکریں کھاتے جہنم میں گریں گے۔ یہ صراط تلوار کی دھار کی طرح تیز ہوگا۔ اس پر آگ کے کنڈے ہوں گے جو اچک اچک کر لوگوں کو جہنم میں گرائیں گے۔ یہ صراط تو ہوگا مگر صراط مستقیم نہیں۔ (اعاذنا اللّٰہ منہ)

---

① الشوریٰ: 52 ② المؤمنون: 73 ③ تاج العروس۔

''مستقیم'' اس سیدھے راستے کو کہتے ہیں جو منزل مقصود کو قریب سے قریب تر کر دے۔ منزل مقصود اللہ کا قرب، اس کی رضا اور جنت ہے۔ اس کے حصول کا وہی راستہ ''صراطِ مستقیم'' ہے جس کی راہنمائی رسول اللہ ﷺ نے کی ہے۔

اسی ''صراطِ مستقیم'' کا ذکر سورۂ یٰسٓ میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ٥﴾ ①

''کیا میں نے تمھیں تاکید نہ کی تھی اے اولادِ آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنھیں اولادِ آدم کی کثیر تعداد معبود بنا کر ان کی پرستش میں مصروف ہے، انھوں نے فرمایا تھا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ ②

''بے شک اللہ ہی میرا ربّ اور تمھارا ربّ ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہی دعوت سورۃ الزخرف ③ اور سورۂ مریم ④ میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ⑤

''اور جو شخص اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۔''

سورۂ الانعام میں شرک کی ممانعت کے علاوہ مزید چند احکام کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے یہ اعلان کروایا ہے:

---

① یٰسٓ: 61,60 ② آلِ عمران: 51 ③ الزخرف: 64
④ مریم: 36 ⑤ آلِ عمران: 101

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ﴾ ①

''اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔''

ان آیات میں بیان ہونے والے احکام ہی صراطِ مستقیم نہیں بلکہ پورا اسلام صراطِ مستقیم ہے جیسا کہ اس سے پہلے اسلام ہی کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِیْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ﴾ ②

''اور یہ (اسلام) تمھارے رب کا راستہ ہے سیدھا، بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔''

توحید خالص اور اسلام کی پیروی ہی صراطِ مستقیم ہے جس کی طلب ہر مسلمان اپنی نمازوں میں کرتا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾

توحید کی بجائے شرک اور اسلام کی بجائے کسی اور نظام کی پیروی باطل اور سراسر گمراہی ہے، ایسا کرنا اللہ کی رضا کی بجائے اللہ کے غضب اور جہنم جانے کا باعث ہے۔ أعاذنا الله منه۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

''صراطِ مستقیم'' کے بارے میں سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، ابن عباس اور جابر وغیرہم رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: اس سے اسلام مراد ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد حق کی

---

① الأنعام: 153 ② الأنعام: 126

پیروی ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔ حافظ ابن کثیر ؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سب اقوال صحیح اور باہم متلازم ہیں۔ جو اسلام کی اتباع کرتا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتا ہے، اور جو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرتا ہے وہ حق ہی کی پیروی کرتا ہے، اور جو حق کی پیروی کرتا ہے وہ اسلام کی ہی پیروی کرتا ہے، اور جو اسلام کا پیروکار ہے وہ قرآن کا پیروکار ہے، لہٰذا ان اقوال میں کوئی منافات نہیں۔ ①

''صراطِ مستقیم'' وہ چھوٹے سے چھوٹا خط ہے جو دو نقطوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ بندۂ مومن اور اس کے معبود و مقصودِ حقیقی کے مابین واسطہ یہی ''صراطِ مستقیم''، یعنی اسلام (قرآن وحدیث رسول ﷺ) ہے۔ اس سے ہٹ کر جو بھی ''صراط'' ہے وہ ''صراطِ مستقیم'' نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((ترکت فیکم أمرین، لن تضلوا ما تمسکتم بھما: کتاب اللہ وسنة رسوله.)) ②

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کے جا رہا ہوں، جب تک ان دونوں کو تھامے رکھو گے ہرگز تم گمراہ نہیں ہوگے، (ایک) کتاب اللہ (قرآنِ حکیم) اور (دوسری) اللہ کے رسول کی سنت۔''

یہی دونوں چیزیں اسلام کا اصل الاصول ہیں۔ انھی دونوں میں ہدایت وراہنمائی ہے، انھی کے ساتھ تمسک میں نجات ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھا خط کھینچا، پھر فرمایا:

''یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا راستہ ہے''، پھر اس کے دائیں اور بائیں کچھ خط کھینچے، پھر فرمایا: ''یہ راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو اپنی طرف بلاتا

---

① ابن کثیر: 51/1

② موطأ، مستدرك حاكم: 93/1، السلسلة الصحيحة

ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ ①

''بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا پس اس پر چلو۔'' ②

اس سیدھے راستے کے علاوہ دوسرے ٹیڑھے راستوں پر نہ چلو، یہ شیطان کے راستے ہیں، یہ شرک و بدعت اور ضلالت کے راستے ہیں۔ جنت کا اور حق کا ایک یہی سیدھا راستہ ہے اور یہی میرا راستہ ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ آرام فرما رہے تھے کہ فرشتے خواب میں آئے اور باہم کہنے لگے: اس صاحب کی ایک مثال ہے، ان کے سامنے وہ مثال بیان کرو۔ دوسرے فرشتوں نے کہا: یہ تو سوئے ہوئے ہیں۔ اور بعض نے کہا: ان کی آنکھیں سو رہی ہیں مگر دل بیدار ہے، چنانچہ انھوں نے کہا: ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا، اس میں دستر خواں بچھایا اور ایک بلانے اور پکار لگانے والے کو بھیجا۔ لہٰذا جو داعی کی آواز پر لبیک کہے گا وہ اس گھر میں داخل ہو کر دستر خواں سے کھائے پیے گا، اور جو اس کی دعوت کو قبول نہیں کرے گا وہ محروم رہ جائے گا۔ بعض نے کہا: اس مثال کی ان کے لیے وضاحت کرو تو بعض نے کہا: یہ تو سو رہے ہیں اور بعض نے کہا: آنکھیں سو رہی ہیں دل بیدار ہے، چنانچہ انھوں نے کہا: گھر سے مراد جنت ہے اور داعی محمد ﷺ ہیں:

«فمن أطاع محمدا فقد أطاع الله، ومن عصى محمدا فقد عصى الله، ومحمد فرق بين الناس.» ③

''پس جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی

---

① الأنعام: 153 ② أحمد: 465/1

③ صحيح بخاري: 7281

اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، محمد ﷺ لوگوں کے مابین فرق کرنے والے ہیں۔''

گویا مومن وکافر کا فرق آپ ﷺ کی بدولت ہے۔ کسی کام کے مشروع وغیر مشروع، جائز وناجائز اور صحیح وغلط ہونے کا معیار آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کے بعد پہلی شرائع منسوخ اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اطاعت موقوف ہو چکی ہے حتی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((والذي نفس محمد بيده لو بدأ لكم موسى فاتبعتموه وتركتموني لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان حيا وأدرك نبوتي لاتبعني.)) ①

''مجھے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، اگر تمھارے لیے موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہو جائیں، پھر تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرو تو تم سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے، اور اگر وہ زندہ ہوں اور میری نبوت کو پالیں تو وہ میری ہی اتباع کریں گے۔''

اسی لیے تو سید الطائفہ جنید بغدادی ؒ نے فرمایا ہے:

«الطرق كلها مسدودة على الخلق إلا من اقتفى أثر رسول الله ﷺ.» ②

''مخلوق پر تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں سوائے اس کے جو رسول اللہ ﷺ کی ہی اتباع کرے۔''

اس لیے صراطِ مستقیم، وہی ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی، جس پر آپ ﷺ نے عمل کیا اور جس کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیروی کی۔ یہی اسلام ہے اور اسی کا نام قرآن وحدیث کی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔

صراطِ مستقیم کو قرآنِ مجید میں ''طريق مستقيم''، ''سواء السبيل''،

---

① سنن دارمي، ص: 116,115

② الحلية: 257/10، الفقيه والمتفقه: 150/1 وغيرهما

"الصراط السوي" بھی کہا گیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صراطِ مستقیم پر چلنے کو ایک مثال سے واضح فرمایا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا تو سر اوپر اور پاؤں زمین پر، وہ اسی طرح پاؤں کے بل چلتا ہے۔ اللہ نے آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے لیے، وہ دیکھ کر سیدھا اور اپنے آپ کو بچا کے چلتا ہے۔ یہی انسان کی سیدھی چال ہے۔ مگر اس کے باوجود جو الٹا سر کے بل چلے گا تو یہ اس کی الٹی چال ہوگی، ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ ①

"تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل الٹا ہو کر چلتا ہے زیادہ ہدایت والا ہے یا وہ جو سیدھا ہو کر درست راستے پر چلتا ہے؟ (وہ ہدایت والا ہے؟)"

جس طرح ہدایت اور درستگی کی راہ یہی ہے کہ سیدھا ہو کر چلا جائے، اسی طرح وہی ہدایت پر ہے جو اسلام کو ماننے والا اور قرآن وسنت کا متبع ہے۔ قرآن وحدیث سے ہٹ کر ہر چال الٹی ہے اور سراسر گمراہی ہے۔

امام رازی نے یہاں یہ لطیف بات بھی فرمائی ہے کہ اس سے اباحت پسندوں کی بھی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ راہ سلوک میں جب انسان "واصل إلى الحق" ہو جاتا ہے تو اس سے عمل کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اسے منزل مقصود حاصل ہو جاتی ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں ہمیشہ آخری دم تک صراطِ مستقیم پر چلتے رہے ہیں اور اسی راہ کے راہی اور راہ رَو رہے ہیں تو یہ جاہل کیسے اپنے بارے میں سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اب تکلیف کے دائرے سے نکل گئے ہیں! ②

---

① الملك: 22 ② التفسير الكبير

﴿تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ﴾ [يٰسٓ: 5]

''یہ سب پر غالب، نہایت مہربان کا نازل کیا ہوا ہے۔''

''تنزیل'' کے معنی ایک چیز کو یکے بعد دیگرے اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہیں۔ ①

قرآنِ حکیم بھی بالتدریج تیئس سال میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اس لفظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اور تدریجاً نازل کرنے کی حکمت بیان فرمادی:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ ②

اور عظیم قرآن ہم نے اس کو جدا جدا کر کے نازل کیا تاکہ تو اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم نے اسے نازل کیا (تھوڑا تھوڑا) نازل کرنا۔

یعنی قرآن پاک کو سورتوں اور آیتوں کی صورت میں جدا جدا کر کے نازل کیا تاکہ حفظ وتلاوت میں آسانی ہو اور آہستہ آہستہ اس لیے اتارا تاکہ لوگ بہ آسانی اسے سمجھ سکیں اور حالات کی مناسبت سے ہدایت حاصل کرتے رہیں۔ سورہ الفرقان میں اس کی ایک اور حکمت بیان ہوئی ہے کہ مشرکین کی طرف سے پریشانیوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا اور تسلی دی گئی ہے اور ان کے اعتراضات کا موقع پر جواب آجاتا ہے۔

یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دو صفات ''عزیز'' اور ''رحیم'' بیان ہوئی ہیں جبکہ دوسرے مقامات پر نزولِ قرآن کے بیان میں دیگر صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ③

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ ④

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ ⑤

---

① مفردات ② الاسراء: 106 ③ الشعراء: 192

④ الزمر: 1، الجاثیۃ: 2، الاحقاف: 2 ⑤ غافر: 2

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ①

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ ②

گویا اسے اللہ رب العالمین نے نازل کیا ہے جو عزیز و حکیم ہے، رحمٰن ورحیم ہے اور حلیم وحمید ہے۔

مشرکین مکہ کو قرآنِ مجید کے بارے میں جہاں یہ اعتراض تھا کہ یہ محمد (ﷺ) کا بنایا ہوا کلام ہے اور اس میں بیان کی گئی باتیں اساطیر الاولین ہیں، وہاں وہ اسے بھی ناممکنات میں سے سمجھتے تھے کہ ہم جیسا بشر، جو ہم ہی میں سے ایک فرد ہے، ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور کوئی بڑا صاحب ثروت بھی نہیں، وہ بھی رسول بن سکتا ہے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مختلف مقامات پر ان کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ یہاں بھی آپ ﷺ کی رسالت کے ثبوت میں فرمایا ہے:

''حکمت بھرے قرآن کی قسم، بلاشبہ آپ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں، صراطِ مستقیم پر ہیں۔''

یہ حکمت بھرا قرآن ''عزیز ورحیم'' ہی کا نازل کیا ہوا ہے۔ وہ سب پر غالب ہے جو چاہتا ہے۔ فیصلہ فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے رسول بنا دیتا ہے۔ کسی کو رسول بنانا اور اس پر اپنا کلام نازل کرنا سراسر اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝﴾ ③

''اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل

---

① فصلت: 2 ② فصلت: 42 ③ الزخرف: 32,31

نہ کیا گیا؟ کیا وہ تیرے ربّ کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا تا کہ ان کا بعض بعض کو تابع بنا لے، اور تیرے ربّ کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔"

اس نے اپنی رحمت کی بنا پر ہی رسولِ رحمت بھیجا ہے اور اپنی کتاب نازل فرمائی۔ جیسے فرمایا ہے:

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

یا جیسے فرمایا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ﴾

تنزیل قرآن یا تعلیم قرآن کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات رحمٰن ورحیم کا تذکرہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا نزول سراسر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی مخلوق پر بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے، اس لیے اس نے اپنی مخلوق کو تاریکیوں میں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑا بلکہ ان کی راہنمائی کے لیے حکمت بھری کتاب نازل کی ہے تا کہ وہ گمراہیوں سے بچ کر صراطِ مستقیم پر آ جائیں اور اپنے مقصد کو پا لیں۔

"تنزیل" کی اعرابی حالت:

"تنزیل" کو بعض نے فعل محذوف کا مصدر بنایا ہے، یعنی: "نزّل الله ذلك تنزيل العزيز الرحيم" اور بعض نے فعل محذوف کا مفعول قرار دیا ہے: "والقرآن الحكيم ۝ اعنى تنزيل العزيز الرحيم" بعض نے مبتدا محذوف کی خبر قرار دیا ہے، یعنی: هو تنزيل العزيز الرحيم اور یہ بھی کہا گیا ہے تنزیل یہاں بمعنی ارسال ہے، جیسے قرآنِ مجید میں ہے:

﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ ①

---

① الطلاق: 11,10

”یقیناً اللہ نے تمھاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے جو ایسا رسول ہے کہ تمھارے سامنے اللہ کی واضح بیان کرنے والی آیات پڑھتا ہے۔“

یہاں ”انزالِ ذکر“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ”ذکر“ سے موسوم کرنا ایسا ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”کلمہ“ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور ”رسولاً“ کا لفظ ”ذکراً“ سے ”بدل الکل“ ہے، یعنی آپ ﷺ کی ذات گرامی سراپا نصیحت ہے۔ اور آپ ﷺ کو ”الذکر“ اس لیے کہا گیا ہے کہ کتب سابقہ میں آپ ﷺ کے متعلق خوشخبری پائی جاتی ہے۔ ①

اور جب کہا جاتا ہے: ”أرسل اللہ المطر“ تو اس سے مراد نزول مطر ہوتا ہے، اسی طرح ”تنزیل“ بمعنی ارسال ہے، اسی لیے علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

«محمد ﷺ رحمة اللّٰه أنزلها من السماء.»

”محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کی رحمت ہیں جسے اللہ نے آسمان سے نازل کیا ہے۔“

بلاشبہ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور آیت مبارکہ میں قرآنِ مجید اور رسول اللہ ﷺ دونوں مراد ہیں۔ اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ ہیں اور دونوں سے مقصود اپنے بندوں کو گمراہیوں سے بچا کر فلاح وفوز سے ہمکنار کرنا ہے۔

”عزیز“ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک ہے، جس کے معنی، غالب، قوی، شان وشوکت والا اور ارجمند کے ہیں، جیسے فرمایا:

﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ②

”اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں سب بڑائی ہے اور وہی سب پر غالب کمال حکمت والا ہے۔“

اہل علم نے بیان فرمایا ہے کہ ”عزیز“ وہ ہے جو:

---

① مفردات ② الجاثیہ: 37

1- واحد و یکتا ہو اور اس جیسا کوئی نہ ہو، جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ ①

کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔

اگر اس جیسا کوئی اور ہوتا تو زمین و آسمان کا نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ ②

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے، سو پاک ہے اللہ جو عرش کا رب ہے، ان چیزوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔

2- ہر ایک ہر چیز میں اسی کا محتاج ہو:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ﴾ ③

اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو

ہر ایک اس کے سامنے عاجز ہو، وہ کسی کے سامنے بے بس نہ ہو، جیسا کہ فاطر میں بیان ہوا ہے۔ ④

3- عزیز وہ ہے جس کا ادراک ممکن نہ ہو اور اس تک رسائی و وصول محال ہو:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ ⑤

''اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے۔'' نیز فرمایا:

﴿قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا﴾ ⑥

''کہہ دیجیے کہ اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے۔''

---

① الشوریٰ: 11 ② الانبیاء: 22 ③ فاطر: 15
④ فاطر: 44 ⑤ الانعام: 103 ⑥ الاسراء: 42

اس لیے عزیز وہ ہے جو سب پر غالب ہو اور سب پر اسی کا فیصلہ نافذ ہو۔

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (1)

اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

جس سے چاہے انتقام لے اور جسے چاہے معاف کر دے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

''العزیز'' میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو نازل کرنے والا اور محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنے والا سب پر غالب ہے، اس لیے ان کا انکار کرنے والے کسی غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ان کے انکار سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ خبردار رہو کہ یہ قرآن اس ہستی کا کلام ہے جو سب کا مالک ہے، اور محمد ﷺ اس مالک کے رسول ہیں جو سب پر غالب ہے۔ جس کی پکڑ سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ جو سرکشی کرے گا وہ بہر حال سزا پائے گا۔

اور ''الرحیم'' میں یہ اشارہ ہے کہ جو میرے رسول کی اطاعت کرے گا اور میرے کلام کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کرے گا وہ اس ''الرحیم'' کی رحمتوں کا مستحق قرار پائے گا۔ 'عزیز' کے ساتھ 'رحیم' کے ذکر میں اشارہ ہے کہ اس کا رحم و کرم کسی بے چارگی یا مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ سراپا رحمت ہونے کی نتیجے میں ہے۔ سبقت رحمتي غضبي۔

امام ماتریدی نے انھی دو صفات کے حوالے سے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے یہ اسماء ہیں: عزیز و رحیم، عظیم و لطیف، ظاہر و باطن، اوّل و آخر۔ اور یہ بات مشاہدے کی ہے کہ انسانوں میں جو عزیز ہے وہ رحمت سے عاری ہے، جو عظیم ہے وہ لطف و کرم سے محروم ہے، جو ظاہر ہے وہ باطن نہیں اور جو اوّل ہے وہ آخر نہیں۔ جس سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے مخلوق اور خالق کی صفات مختلف ہیں۔ جس معنی میں کوئی صفت مخلوق کی ہے خالق کی صفت اس سے کہیں مختلف اور مہتم بالشان ہے۔

---

(1) یوسف 21:12

یہاں ''تنزیل'' کے لفظ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ علو ثابت ہوتی ہے کیونکہ نزول اوپر سے نیچے کی طرف ہوتا ہے اور قرآن پاک کا نزول اوپر سے نیچے رسول اللہ ﷺ پر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا قرآن مجید اور متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے۔

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [یٰسٓ:6]

''تاکہ تُو اس قوم کو ڈرائے جن کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے، تو وہ بے خبر ہیں۔''

اس آیت کریمہ میں ''قرآنِ حکیم'' کے نازل کرنے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے رسول بنائے جانے کی غایت بیان کی گئی ہے کہ آپ اس لیے رسول ہیں اور آپ پر قرآنِ حکیم اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا۔ ''ما'' کے بارے میں ایک رائے یہی ہے کہ یہ نافیہ ہے جیسا کہ ترجمے میں ہے اور یہی اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ قرآنِ مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ﴾ ①

''تاکہ تُو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، تاکہ وہ راہ پائیں۔''

یہی بات سورۃ القصص میں بھی کہی گئی مگر اس کے آخر میں ہے ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ ② ''تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ﴾ ③

''حالانکہ ہم نے نہ انھیں کوئی کتابیں دیں جنھیں وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا بھیجا۔''

---

① السجدۃ:3 ② القصص:46 ③ سبا:44

اس آیت میں کتاب اور رسول دونوں کے آنے کی نفی ہے تو پھر انھیں اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کی تعلیم کس نے دی؟ اور کیا اس کی کوئی سند ان کے پاس ہے؟ قطعاً نہیں یہ سراسر جہالت اور بے خبری میں دعوت توحید کا انکار کرتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ "ما" یہاں موصولہ ہے اور "الذي" کے معنی میں ہے، یوں آیت کے معنی ہوں گے:

"تم اس قوم کو اسی بات سے ڈراؤ جس سے ان کے باپ دادا ڈرائے گئے ہیں۔"

دراصل ان دونوں معانی میں کوئی تضاد نہیں۔ پہلا مفہوم لیا جائے تو باپ دادا سے زمانۂ قریب کے باپ دادا مراد ہوں گے کیونکہ سرزمین عرب میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت شعیب علیہم السلام نبی ہوئے ہیں۔ ایک زمانے بعد جب ان کی تعلیمات کے آثار مٹ گئے اور توحید کی بجائے شرک نے راہ پکڑی تو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا، اس لیے ان آیات میں کتاب اور رسول کی نفی سے مراد ان کے قریبی زمانے میں نبی آنے کی نفی ہے۔ اور "إنذار" کی نفی براہِ راست بذریعہ نبی ڈرانے کی نفی ہے، یوں نہیں کہ انھیں کسی ڈرانے والے نے ڈرایا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے زید بن عمرو بن نفیل، قیس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل وغیرہ اہل مکہ کو ان کے شرک اور ان کی بدعملیوں سے خبردار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ﴾ [1]

"اور کوئی امت نہیں، مگر اس میں ایک ڈرانے والا گزرا ہے۔"

خواہ یہ ڈرانے والا نبی ہو یا عام شخص۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے زمانہ فترت یعنی انقطاع نبوت کا ذکر کیا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] فاطر:24

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ ①

”اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے رسولوں کے ایک وقفے کے بعد“

اس وقفے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کا زمانہ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی فترت سے مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں کوئی نبی نہیں آیا، یہ مراد نہیں کہ اس زمانے میں عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا اہل کتاب میں کوئی عالم بھی نہیں تھا۔ ②

اور دوسرے مفہوم میں مراد یہ ہے کہ جو پیغام انبیاء کے ذریعے سے ان کے آباء واجداد کے پاس آیا تھا یہ لوگ اسے فراموش کر چکے ہیں، آپ ﷺ اس عہد کی یاد تازہ کریں اور وہی توحید کا پیغام انھیں پہنچا دیں۔ یہ مفہوم بھی دراصل اسی تناظر میں ہے کہ قوم عرب میں نبی تو ہوئے ہیں، اس لیے ان سے نبوت کی کلیۃً نفی تو نہیں ہو سکتی۔ یہ نفی ہے تو عہد قریب میں ان کے آباء واجداد میں کسی نبی کے آنے کی نفی ہے۔ یوں ان دونوں معنوں میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اہل عرب، اہل مکہ کے لیے تھی۔ یہود ونصاریٰ کی طرف تو بہت سے رسول آئے ہیں مگر آپ ﷺ ان کے لیے رسول نہیں تھے کیونکہ آیت میں ہے کہ آپ انھیں ڈرائیں جن کے پاس ڈرانے والا نہیں آیا بلکہ قرآنِ مجید میں یہ صراحت ہے کہ آپ ﷺ ”امیین“ کی طرف رسول ہیں۔ اور ایک جگہ فرمایا ہے:

---

① المائدة:19 ② روح المعاني، البحر المحيط وغيرهما

﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ ①

’’اور یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے اور تا کہ تو بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد لوگوں کو ڈرائے۔‘‘

اس سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اہل مکہ اور اس کے آس پاس بسنے والوں کے لیے نبی ہیں۔ مگر یہ درست نہیں کیونکہ ان بعض کی تخصیص سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں دوسروں کی نفی ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ ②

’’اور اپنے سب سے قریب رشتہ داروں کو ڈرا۔‘‘

یہ باعتبار اوّلین مخاطبین کے ہے، یوں نہیں کہ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کسی کو نہ ڈراؤ۔ اہل مکہ اور مکہ کے مضافات میں بسنے والوں کے بارے میں ڈرانے کا حکم بھی اوّلین مخاطبین کے اعتبار سے ہے۔ قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ میں آپ ﷺ کی بعثت عمومی کے بے شمار دلائل ہیں جن کا یہ محل نہیں۔

امام رازی ؒ نے اس کے علاوہ یہ جواب بھی دیا ہے کہ جب ”ما“ موصولہ مانا جائے تو یہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہود ونصاریٰ کی گمراہی کے بعد قریبی دور میں کوئی نبی نہیں آیا تھا، اس لیے وہ بھی آپ ﷺ کے مخاطب ہیں بلکہ انھیں خبردار کیا گیا ہے:

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ﴾ ③

’’تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا، تو یقیناً تمھارے پاس ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آچکا ہے۔‘‘

---

① الانعام:92 ② الشعرآء:214 ③ المائدۃ:19

﴿وَهُمْ غَافِلُوْنَ﴾ میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے: ایک یہ کہ رسول کی بعثت اس وقت ہوتی ہے جب قوم غفلت اور بے خبری میں مبتلا ہو، انھیں جھنجوڑنے اور زندگی کے انجام سے خبردار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو بھیجتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بے خبروں کے لیے اس میں تنبیہ ہے کہ اگر سمجھانے اور ڈرانے کے باوجود تم نے آنکھیں نہ کھولیں تو اس کا نتیجہ شقاوت و بدبختی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ غفلت شعاروں پر عذاب کا کوڑا تبھی برستا ہے جب انھیں رسول کے ذریعے خبردار کر دیا جاتا ہے:

﴿وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ ①

''ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ﴾ ②

''یہ اس لیے کہ بے شک تیرا رب کبھی بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں جب کہ اس کے رہنے والے بے خبر ہوں۔''

مگر جب نبی کے ذریعے خبردار کر دیا جاتا ہے تو ان غفلت کے ماروں پر عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن جب انھی بدنصیبوں کو جہنم رسید کیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ تو وہ کہیں گے:

﴿قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ﴾ ③

''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا: اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری۔ تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔''

---

① الاسراء15: ② الانعام131: ③ الملك9:

یہی بات سورۃ الزمر میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ①

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد جو عذاب آتا ہے وہ استیصال اور اس قوم کی بربادی پر منتج ہوتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو ماننے کے باوجود نافرمانی کرتے ہیں یا انھیں احکام الٰہی کا علم ہوتا ہے مگر پھر بھی ان کی مخالفت کرتے ہیں تو عذاب ان پر بھی آتا ہے مگر اس میں تمام کی بربادی نہیں ہوتی۔ بسا اوقات یہ مختلف آفات و بلیات کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور یہ عذاب تنبیہ اور خبردار کرنے کے لیے آتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ②

''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ پلٹ آئیں۔''

''عذابِ ادنیٰ'' سے دنیا کا عذاب اور مختلف آفات مراد ہیں تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ صراطِ مستقیم کی طرف پلٹ آئیں۔

ایمان کے بارے میں یہ غفلت و بے خبری جیسے باعث مذمت ہے اسی طرح احکام شریعت و عبادات میں بے خبری بھی باعث مذمت ہے۔ مثلاً نماز کی فرضیت کے بعد نماز کے احکام سیکھنا فرض ہیں۔ حج فرض ہو جانے پر حج کا طریقہ سیکھنا فرض ہے اور اس کی ادائیگی میں بے خبری باعث مذمت اور بہت سی سعادتوں سے محرومی کا باعث ہے۔

---

① الزمر 71: ② السجدة 21:

﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾[یٰسٓ:7]

"بے شک ان کے اکثر پر بات ثابت ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

پہلی آیت میں بیان ہوا ہے کہ قرآنِ حکیم کا نازل کیا جانا اور آپ ﷺ کو رسول بنایا جانا اس لیے ہے کہ آپ ﷺ انھیں اللہ کی نافرمانی اور اس کے نتیجے میں اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔ اب اس آیت میں ایک طرف تو آپ ﷺ کی تسلی وتشفی کا پہلو ہے اور دوسری طرف ایک حقیقت واقعی کا اعلان ہے۔

تسلی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری "إنذار" یعنی ڈرانا اور راہِ ہدایت کی دعوت دینا ہے اور یہ فریضہ آپ ﷺ سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری ہدایت دینا نہیں، اس سے آپ ﷺ پریشان نہ ہوں کہ یہ دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ دراصل ان کے مقدر میں ہدایت نہیں ہے۔ آپ ﷺ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں اور ان کی اکثریت سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ ہدایت قبول کرلیں گے۔

دوسری بات جو فرمائی وہ یہ کہ درحقیقت ان پر "بات ثابت ہو چکی" ہے۔ انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے اللہ نے اپنی کتاب نازل کی، محمد ﷺ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا جنھوں نے پورے دلائل سے حق واضح کر دیا، عقلی ونقلی اور آفاقی وانفسی دلائل سے توحید اور ایمان بالآخرة کی دعوت دی۔ مگر ان کی ضد اور عناد سے ان کے تمرد میں اضافہ ہی ہوا، نبی ﷺ کی دعوت پر کان نہ دھرے بلکہ اس کے سننے میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتے رہے، اور نہ ہی غور وفکر سے کام لیا اور نہ اللہ کی توحید کے آفاقی وانفسی دلائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی کو اختیار کیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ، جو علام الغیوب ہے، ان کے اس طرزِ عمل سے ان کی پیدائش سے بھی پہلے سے واقف ہے۔ اس کے علم میں ہے کہ کون ایمان لائے گا اور کون نہیں لائے گا، اس لیے بعض کے بارے "قولِ حق" صادر

فرما دیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے اور شیطان کے ساتھ جہنم کا ایندھن بنیں گے، چنانچہ ابلیس نے جب کہا تھا کہ میں پوری ذریت آدم کو گمراہ کروں گا اور ان کی اکثریت شکر گزار نہیں ہوگی تو اس کے جواب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾ ①

''فرمایا: پھر حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہتا ہوں، کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

اسی ''قولِ حق'' کا بیان ایک اور مقام پر یوں ہے:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾ ②

''اور اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔''

اس ''قولِ حق'' کو بعض مقامات پر ''کلمة'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾ ③

''اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو یقیناً سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرا ربّ رحم کرے، اور اس نے انھیں اسی لیے پیدا کیا،

---

① صٓ: 85,84 ② السجدة: 13 ③ هود: 119,118

اور تیرے ربّ کی بات پوری ہوگئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا۔''

﴿عَلٰٓی اَکۡثَرِھِمۡ﴾ ان کے اکثر پر قولِ حق ثابت ہو چکا۔اس سے معلوم ہوا کہ اکثر لوگ جہنم میں جائیں گے۔ اللهم لا تجعلنا منهم .

اسی حقیقت کا بیان ایک جگہ یوں ہے:

﴿اِنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ ①

''یقیناً یہی تیرے ربّ کی طرف سے حق ہے اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

یہی بات سورۃ الرعد ② اور سورۂ غافر ③ میں بھی بیان ہوئی ہے۔ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَاۤ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَ لَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ④

''اور اکثر لوگ، خواہ تُو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

دنیا کی اکثریت چونکہ گمراہی میں مبتلا ہے اور وحی الٰہی کی پیروی کی بجائے اپنی عقل وفہم پر یا آباءواجداد کے بندھن میں بندھی ہوئی ہے، اس لیے آپ ﷺ سے فرمایا گیا ہے:

﴿وَ اِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِي الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ﴾ ⑤

''اور اگر تُو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہیں۔''

وحی الٰہی کے علاوہ جو بھی عقلی گھوڑے ہیں یا فکر وفلسفے کی بوقلمونیاں ہیں وہ سب ظن وگمان اور اٹکل پچو ہیں۔انسانوں کی اکثریت اسی پر سر دھنتی ہے اور گمراہی میں مبتلا ہے۔

---

① ھود:17 ② الرعد:1 ③ غافر:59 ④ یوسف:103 ⑤ الأنعام:116

بسا اوقات اکثریت کو دیکھ کر انسان متاثر ہو جاتا ہے اسی سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبردار فرمایا ہے کہ محض اکثریت کوئی دلیل نہیں، دلیل وحی الٰہی ہے، اسی کی پیروی کیجیے۔

قرآنِ حکیم میں جو اکثر انسانوں کا انجام جہنم بتلایا گیا ہے اس کی کچھ تفصیل احادیث مبارکہ میں پائی جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اپنی ذریت میں سے ایک جتھا دوزخ کا نکالو۔ وہ عرض کریں گے: اے پروردگار! دوزخ کا جتھا کتنا نکالوں؟ حکم ہوگا ہر ہزار آدمیوں میں سے نوسو ننانوے (گویا ہزار میں ایک جنتی)۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ بات بڑی سخت گزری، ان کے چہرے مارے ڈر کے بدل گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی تسلی کے لیے) فرمایا: ''اگر یاجوج ماجوج کی نسل تم سے ملائی جائے تو نوسو ننانوے کے مقابلے میں تم میں سے ایک آدمی پڑے گا، پھر تم (حشر کے دن) دوسرے لوگوں کی نسبت (جو دوزخی ہوں گے) ایسے ہو گے جیسے سفید بیل کے جسم پر ایک سیاہ بال ہوتا ہے یا جیسے سیاہ بیل کے جسم پر ایک سفید بال ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ سارے جنتیوں کا چوتھائی ہو گے۔'' یہ سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، تم تہائی حصہ ہو گے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر تکبیر کہی، پھر فرمایا: ''نہیں آدھا، حصہ ہو گے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر تکبیر کہی۔ ①

یہی روایت معمولی اختلاف سے حضرت ابوہریرہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے۔ ②

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رحمت کی بنیاد پر اپنی امت کے افراد کو اہل جنت کا نصف قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امید سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا جس کی طرف اشارہ ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ ③

---

① صحيح بخاري: 3348 ② صحيح بخاري: 6528، 6530
③ الضحى: 5

''اور یقیناً عن قریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا کہ پس تو راضی ہو جائے گا۔'' میں ہے۔

اور مسند احمد اور ترمذی میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی صفیں میری امت کی ہوں گی۔ ①

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں آپ ؐ کی امت کا دو تہائی حصہ ہوگا۔ اللهم أدخلنا الجنة الفردوس.

﴿فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان سے محرومی کا نتیجہ جہنم ہے جس کی وضاحت اوپر ''قولِ حق'' کی تفصیل میں بیان ہوئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ کفار مکہ یہ تو مانتے تھے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمارا خالق ورازق ہے اور موت وحیات اسی کے قبضے میں ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ کا رسول جیسے اللہ کی معرفت اور صرف اسی کی عبادت کی دعوت دیتا ہے اسے بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ انھیں یہ بات گوارا ہی نہ تھی کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے اور وہی سب کا معبود ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قیامت پر ایمان کی دعوت دیتے تھے تو وہ اس پر بھی تعجب کرتے تھے۔ گویا ایمان کی نفی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے جو نہ صرف یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت سے انکار ہے بلکہ قیامت کا انکار بھی ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو مان لینا ایمان نہیں ہے۔

:: :: ::

---

① فتح الباري: 471/11

﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ○﴾ [یٰسٓ:9,8]

''بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں کئی طوق ڈال دیے ہیں، پس وہ ٹھوڑیوں تک ہیں، سو ان کے سر اوپر کو اٹھا دیے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے سے ایک دیوار کردی اور ان کے پیچھے سے ایک دیوار، پھر ہم نے انھیں ڈھانپ دیا تو وہ نہیں دیکھتے۔''

سابقہ آیت مبارکہ میں کفار کی ایمان سے محرومی اور اس کے نتیجے میں ان کے حق میں عذابِ جہنم کے فیصلے کا ذکر تھا، اب ان آیات میں ان کی دائمی محرومی کو ایک مثال سے واضح فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: دولتِ ایمان سے محرومی اس لیے ہے کہ ہم نے ان کی گردنوں میں کئی طوق ڈال دیے ہیں۔

﴿اعناق﴾ یہ ''عنق'' کی جمع ہے۔ جس کے معنی گردن اور گلے کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ اسی مفہوم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ○﴾ (1)

''اور ہر انسان کو ہم نے اس کا نصیب اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ کھلی ہوئی پائے گا۔''

﴿اَغْلٰلٌ﴾ یہ ''غُلٌّ'' کی جمع ہے۔ جس کے معنی طوق ہیں۔ اور یہ خاص طور پر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی کے اعضا کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جائے۔ اور ''غل'' غین کی زیر سے ہو تو اس کے معنی کینہ وحسد ہیں۔

---

(1) الإسراء: 13

اور ﴿الْاَذْقَانُ﴾ ''ذَقَنٌ'' کی جمع ہے جس کے معنی ٹھوڑی ہیں۔ اور ﴿مُّقْمَحُوْنَ﴾ اصل میں ''قَمَحٌ'' سے ہے۔ اور ''قَمَحٌ'' اس گیہوں کو کہتے ہیں جو پکنے کے وقت سے لے کر ذخیرہ اندوزی تک بالی کے اندر ہی رکھا جائے۔ پھر اس گیہوں سے جو ستو بنایا جاتا ہے اسے ''قَمِيْحَةٌ'' کہا جاتا ہے۔ اور ستو کی مناسبت سے کوئی چیز پھانکنے کے لیے سر اوپر اُٹھانے کو ''القمح'' کہتے ہیں۔ پھر محض سر اٹھانے پر خواہ کسی وجہ سے ہو ''قَمَحٌ'' کہا جانے لگا۔ اسی سے ''قَمَحَ الْبَعِيْرُ'' ہے کہ اونٹ نے اوپر سر اٹھالیا۔ ①

اور یہاں بھی ﴿فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾ کے معنی ہیں کہ گردن میں طوق پڑنے کی وجہ سے ان کے سر اوپر اُٹھے ہوئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہاں ہاتھوں کا ذکر نہیں صرف گلے میں طوق کا ذکر ہے مگر مراد صرف گردن کی بندش نہیں بلکہ گردن کے ساتھ ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات ایک چیز کا ذکر کر کے دوسری چیز، جو اسی سے سمجھی جاتی ہے، کا ذکر حذف کر دیا جاتا ہے۔ ''غل'' یعنی طوق کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کو گردن کے ساتھ جکڑنا اور باندھ دینا۔ بلکہ امام ابو جعفر احمد بن محمد نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''فهي'' کی ضمیر ''ایدی'' کی طرف ہے اعناق کی طرف نہیں ہے۔ اور اصل کلام یوں ہے:

«إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَفِيْ اَيْدِيْهِمْ اَغْلٰلاً.»

اس قسم کے حذف کی مثال قرآنِ مجید ہی میں یوں بھی ہے:

﴿وَ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ﴾ ②

''اور تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں۔''

حالانکہ جو قمیص گرمی سے بچاتی ہے وہ سردی سے بھی بچاتی ہے۔ یہاں بھی ایک کا ذکر کیا ہے اور دوسری چیز اس میں شامل ہے۔ ③

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا﴾ اسی

---

① مفردات ② النحل:81 ③ فتح القدير، قرطبي

طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ﴾ ①
یعنی ہم نے ان کے ہاتھ ان کی گردنوں سے باندھ دیے ہیں کسی عمل خیر کے لیے وہ کھل نہیں سکتے۔ گویا ان کے ہاتھوں میں زنجیر اور گلے میں اتنے طوق ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڑی تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یوں ان کی گردنیں اوپر اٹھی اور جکڑی ہوئی ہیں نہ اوپر دیکھ سکتے ہیں نہ ہی نیچے، نہ دائیں نہ بائیں۔ یوں وہ کچھ نہیں کر سکتے نہ کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان سے بچ سکتے ہیں اور ہر قسم کی خیر سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس میں ان کے استکبار کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس طرح طوق کے نتیجہ میں اکڑی اور اوپر اٹھی ہوئی گردن والے کو چلنے کے لیے راستہ نظر نہیں آتا اسی طرح کفار کو بھی راہِ حق نظر نہیں آتا۔ گویا ان کی ضد اور ان کے تکبر سے جو ان کی گردنیں اکڑی ہوئی ہیں ہم نے ان کے اس تکبر کو ان کے گلے کا طوق بنا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ راہِ صواب سے محروم ہوئے ہیں اور کوئی روشن دلیل انھیں نظر ہی نہیں آتی۔

دولت ایمان سے یہ محرومی اور ان کی شقاوت و بدبختی مسلسل ان کے تکبر و تمرد کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لیے اپنے رسول بھیجے ان پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اور انبیاء کی حقانیت کے لیے آیات و براہین دکھائیں۔ مگر ان کی شقاوت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ان کے اسی تمرد کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں مہر لگا دی جیسا کہ متعدد آیات مبارکہ میں اس کی وضاحت ہے، مثلاً فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ﴾ ②

”اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر ایک

---

① الإسراء:29

② البقرة:7 نیز ملاحظہ ہو الکہف (57،101)، الجاثیة (23)، المائدة: 41، الانعام 110، 125، هود: 20

پردہ ہے۔''

﴿اَیْدِیْهِمْ سَدًّا﴾ اس آیت میں انھی محرومین کی دوسری مثال یا دوسری حالت کا ذکر ہوا ہے''سد'' دیوار کو کہتے ہیں۔ سَد اور سُد دونوں لغات ہیں۔ اور دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ بعض نے کہا ہے سُد سین کے ضمہ کے ساتھ ہو تو قدرتی آڑ کو کہا جاتا ہے اور فتحِ سین سے ہو تو بنائی ہوئی اور مصنوعی روک کو کہتے ہیں۔ ①

چنانچہ ان محرومین کی حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آگے اور پیچھے دیوار کھڑی کر دی۔

﴿فَاَغْشَیْنٰهُمْ﴾ پھر ہم نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ لہٰذا یہ متکبرین و متمردین کفر سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں ہو پاتے۔ امام رازیؒ، اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائے، نے یہاں بڑی لطیف بات فرمائی ہے کہ نظر نہ آنے کی دو قسمیں ہیں: ایک اپنے وجود کو نہ دیکھنا اور دوسرا اپنے گردوپیش کو نہ دیکھ سکنا۔ کفار کے لیے یہ دونوں موانع ہیں۔ ''طوق'' کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دیکھ نہیں سکتے، جس کے نتیجہ میں وہ انفسی دلائل کو دیکھنے سے محروم ہیں۔ اور ''سد'' یعنی دیوار اور اوٹ کے نتیجے میں وہ آفاقی دلائل دیکھنے سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ ②

''عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یقیناً یہی حق ہے۔''

لہٰذا کفار کے لیے ان انفسی اور آفاقی دلائل سے راہ پانے کی سبیل ہی بند کر دی گئی ہے کیونکہ وہ درحقیقت اسی لائق تھے۔ بلکہ اس میں ان کی ہلاکت کی طرف بھی اشارہ ہے

---

① مفردات۔ ② حٰمٓ السجدۃ: 53

کہ جب انسان کے لیے آگے چلنے کا راستہ مسدود ہو تو وہ پیچھے نکلنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب راستہ پیچھے سے بھی مسدود ہو تو وہ جگہ ہلاکت کا پیغام بن جاتی ہے گویا وہ ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی طرح ''فَاَغْشَيْنٰهُمْ'' میں ''فاء'' کا تقاضا ہے کہ آگے پیچھے کی دیواریں اس کے بالکل قریب اور متصل ہیں۔ جب دیواروں کا یوں الصاق واتصال ہے تو اس سے وہ اشکال بھی جاتا رہا کہ دائیں بائیں کا ذکر کیوں نہیں ہوا۔ آگے پیچھے راستہ نہ ہو تو دائیں بائیں بھی جایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو تب ہے جب دیواروں کے بُعد کی وجہ سے دائیں بائیں مڑنے کی گنجائش ہو۔ لیکن جب ان کے قرب واتصال کی وجہ سے ادھر ادھر مڑنے کی گنجائش ہی نہ ہو تو وہ مڑے گا کیسے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ میں دوزخیوں کے عذاب کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ سورۃ المؤمن میں ہے:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝﴾ ①

''جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے۔ کھولتے پانی میں، پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔''

بلاشبہ جہنمیوں کے گلے میں بھی طوق ہوں گے مگر سورۂ یٰسٓ کی آیت مبارکہ کے بیّن سیاق میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں کفار کی گمراہی اور ان کے جہنمی ہونے کی علت بیان ہوئی ہے۔

ان آیات کے سبب نزول میں مختلف روایات آئی ہیں اور بعض مفسرین نے انھیں نقل بھی کیا ہے مگر وہ بیشتر ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں۔ انھی میں سے ایک روایت حضرت

---

① المؤمن: 72,71

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں بلند آواز سے قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہے تھے، ادھر قریش کو یہ تلاوت ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ اٹھے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاوت سے روکیں تو ان کے ہاتھ ان کی گردنوں سے جڑ گئے اور ان کی بینائی جاتی رہی۔ وہ پریشانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلہ رحمی کے توسط سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تو ان کی حالت درست ہوگئی اور ان کی تکلیف جاتی رہی۔ اسی پس منظر میں سورۂ یٰس کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ یہ روایت ابن مردویہؒ اور ابو نعیمؒ کی "دلائل النبوۃ" ① کے حوالے سے ہے۔ قاضی شوکانی نے فرمایا ہے:

«وفي الباب روايات في سبب نزول ذلك، هذه الرواية أحسنها وأقربها إلى الصحة.» ②

"اس کے سبب نزول کے باب میں کئی روایات ہیں۔ ان میں یہ روایت احسن اور صحت کے زیادہ قریب ہے۔"

حالانکہ اس روایت کی یہ پوزیشن قطعاً نہیں، نضر بن عبدالرحمٰن ابو عمرو الخزار اس کا راوی متروک ہے۔ ③

اسی طرح حضرت عکرمہؒ سے منقول ہے کہ ابو جہل نے کہا اگر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لوں تو میں انھیں ایسے اور ایسے کردوں گا جس پر ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ...... إلخ﴾ نازل ہوئی۔ کفار اسے کہتے تھے: یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو ابو جہل کہتا: وہ کہاں ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آتے۔ ④

مگر یہ بھی مرسل ہے۔

---

① دلائل النبوۃ" 199,200/1 ② فتح القدير: 362/1

③ تقریب ④ ابن جریر: 152/22

ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور دیگر مخزومیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا پروگرام بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت سن رہے تھے۔ انھوں نے ولید کو بھیجا کہ تم جاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے آؤ، چنانچہ وہ وہاں آیا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ ولید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت تو سن رہا تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ وہ واپس پلٹ گیا اور انھیں خبر کر دی، پھر وہ سب وہاں سے چلے اور اسی جگہ آئے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی تو ادھر کو چل دیے۔ آگے بڑھے تو وہی آواز پیچھے سے سنائی دینے لگی۔ یوں وہ واپس چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ پائے۔ ﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا...... الآیۃ﴾ میں اسی واقعے کا بیان ہے۔ امام بیہقی نے "دلائل النبوۃ" ① میں یہ روایت "محمد بن مروان السدي الصغير عن محمد بن السائب الكلبي عن أبي صالح باذام عن ابن عباس" کی سند سے ذکر کی ہے۔ اور علامہ سیوطی نے بھی اسے "الدر المنثور" میں بیہقی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ مگر یہ سلسلۂ سند سخت ضعیف ہے۔ محمد بن مروان السدی الصغیر اور محمد بن سائب دونوں کذاب ہیں۔ ابو صالح باذام ضعیف اور مدلس ہے بلکہ اس کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سماع ہی صحیح نہیں۔ (تہذیب) اور اس کا شانِ نزول سے بھی تعلق نہیں۔

اسی سے ملتا جلتا قصہ ذرا تفصیل سے علامہ بغوی رحمہ اللہ، علامہ قرطبی رحمہ اللہ، علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے مگر یہ بے سند ہے۔ تتبع کے باوجود اس کی سند نہیں ملی حتی کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی "الدر المنثور" میں ذکر نہیں کیا، اسی لیے ہم نے بھی اسے نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

البتہ کتب تاریخ و سیر میں یہ بات معروف ہے کہ ہجرت کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

① دلائل النبوۃ 197,196/2

اپنے گھر سے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی نو آیات پڑھتے ہوئے اور مٹھی میں مٹی لیے ہوئے نکلے۔ کفار جو دروازے پر آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ آپ ﷺ نے مٹی ان کے سروں کی طرف پھینکی تو وہ ان کے سروں میں پڑی اور وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکے۔

﴿وَ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ○﴾ [یٰسٓ:11,10]

"اور ان پر برابر ہے، خواہ تُو انھیں ڈرائے یا انھیں نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ تُو تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے۔ سو اسے بڑی بخشش اور باعزت اجر کی خوش خبری دے۔"

پہلی آیات میں متکبرین و متمردین کے بارے میں جو فرمایا گیا کہ ان کے گلوں میں ٹھوڑیوں تک طوق ہیں، ان کے آگے اور پیچھے دیواریں ہیں اور انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں ان کے لیے آفاقی و انفسی دلائل سے مستفید ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھیں ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے اور ایمان سے محرومی ان کا مقدر ہے۔ اسی حقیقت کا بیان سورۃ المطففین میں یوں ہوا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ ①

"ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے۔"

یعنی ان کے تمرد و سرکشی اور بدعملی کا زنگ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن العبد إذا أذنب ذنبا كانت نكتة سوداء في قلبه، فإن تاب منها صقل قلبه وإن زاد زادت.)) ②

"بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس سے توبہ کر لے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو سیاہ نقطہ زیادہ

---

① المطفّفين:14 ② ترمذي: 3334

ہو جاتا ہے۔"

دل کے اسی اندھے پن کا ذکر یوں ہے:

﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ ①

"پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"

دل کے اِسی زنگ اور اندھے پن کو مہر، ختم یا پردے کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ مہر دراصل ان کی اپنی بدعملیوں کے نتیجے میں ہے۔ اور یہ ان پر حجت پوری کر دینے کے بعد بطور لعنت لگائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے اور صحیح ہے، اس لیے اس نے اپنے علم ازلی سے خبر دی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، گویا ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ خبر ہے، امر نہیں کہ وہ ایمان نہ لائیں۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اگر کہا جائے کہ جب "إنذار" کا فائدہ نہیں تو انھیں "إنذار" کیوں کیا جائے؟ فرماتے ہیں کہ یہ ڈرانا نہ ڈرانا کفار کے حق میں ہے کہ انھیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ "سواء علیك" نہیں فرمایا گیا، اس لیے دعوت و تبلیغ مؤثر ہو یا نہ ہو داعی اور مبلغ کو فریضے کی ادائیگی کا ثواب بہر حال ملے گا۔ علاوہ ازیں ایسے اشقیاء کو ڈرانا اتمام حجت کے لیے بھی ہے کہ کل قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکیں: ﴿مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ﴾ "ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔"

اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے۔ آپ ﷺ جو شب و روز دعوت حق میں ایک کیے ہوئے تھے اور دعوت و تبلیغ کا ہر طریقہ اپنائے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود کفار کے دلوں میں آئے دن تمرد و سرکشی بڑھتی جا رہی تھی، ایسی حالت میں دلبرداشتہ ہونا اور فکر

---

① الحج:46

مندر رہنا ایک فطری عمل تھا جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ ①

''پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔''

اس آیت میں آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ فکر مند نہ ہوں، ان کے کرتوتوں کے نتیجے میں ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اب انھیں دولت ایمان نصیب نہیں ہوگی۔ نتیجتاً یہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔

﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ﴾ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کفار کے مقابلے میں یہ ''إنذار'' کن کے لیے فائدہ مند ہے، چنانچہ فرمایا کہ آپ ﷺ کا ڈرانا ان کے لیے ہے جو نصیحت کی پیروی کریں اور رحمان سے بن دیکھے ڈریں۔

''إنذار'' کے عموماً معنی ''ڈرانا'' کیے جاتے ہیں مگر درحقیقت محض ڈرانے کو ''إنذار'' نہیں کہتے بلکہ اس سے ایسا ڈرانا مراد ہے جو بربنائے رحمت وشفقت ہوتا ہے اور خوفناک چیز سے آگاہ اور خبردار کرنا ہوتا ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو ''النذیر'' کا لقب دیا گیا ہے تو اس میں بھی یہی معنی پائے جاتے ہیں کہ وہ از راہِ شفقت ورأفت آئندہ عذاب سے ڈراتے ہیں اور اس میں خیر خواہی کا پہلو پایا جاتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ کے عذاب سے ''خوف'' تو دلاتے رہے ہیں مگر وہ ''مُنذِر'' ہیں ''مُخوِف'' نہیں ہیں۔ والدین بھی اولاد کے لیے ''النذیر'' ہیں کہ وہ آگ سے اور دوسری خوفناک اشیاء سے اسی شفقت ومحبت کی بنا پر ڈراتے ہیں۔ اس کے برعکس چور، ڈاکو کا یا کسی ظالم کا ڈرانا ''إنذار'' نہیں کہلاتا، اسے عموماً ''خوف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ محض ڈراتے دھمکاتے ہیں، خیر خواہی یا شفقت ورحمت سے وہ عاری ہوتے ہیں۔

---

① الکہف:6

اس آیت میں آپ ﷺ سے تسلی کے تناظر میں فرمایا گیا ہے کہ کفار کے مقابلے میں آپ ﷺ کے "إنذار" سے وہ مستفید ہوتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرتا ہے اور اس کے دل میں رحمٰن کی خشیت ہے۔ "إنذار" سے مستفید نہ ہونے والوں کی حالت یہ بیان ہوئی تھی کہ ٹھوڑی تک طوق میں ان کی گردنیں اکڑی ہوئی اور نگاہیں اوپر کو اُٹھی ہوئی ہیں، ان کے آگے پیچھے دیوار ہے اور آنکھوں پر پردہ ہے۔ جس شخص کی یہ حالت ہوا سے نہ کوئی راستہ نظر آتا ہے نہ وہ کہیں نکل ہی سکتا ہے۔ اس کے برعکس "إنذار" سے مستفید ہونے والوں کی دو صفات بیان ہوئی ہیں: "الذکر" کی تابعداری اور اللہ کی خشیت۔

''الذکر'' سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ اسی معنی میں اس کا اطلاق قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے۔ ①

سورۂ ق میں ہے:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ ②

سو قرآن کے ساتھ اس شخص کو نصیحت کر جو میرے عذاب کے وعدے سے ڈرتا ہے۔

مذکورہ بالا اور آیت ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ ③ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے، علمی ذوق رکھنے والے احباب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

البتہ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ فرمایا گیا ہے ''جو رحمٰن سے ڈرا'' یہ نہیں فرمایا گیا: ''جو اللہ سے ڈرا'' یعنی اسم جلال نہیں بلکہ اسم جمال کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ رحمٰن سے جتنی زیادہ خشیت ہوگی اتنی ہی زیادہ رحمت ہوگی کیونکہ جو انسان اللہ سے ڈرتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا مستحق ہوتا ہے۔ اور جب انسان اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ اوامر نواہی کی پابندی کرتا ہے۔ یہی پابندی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث بنتی ہے۔

﴿فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ﴾ نصیحت کی پیروی کرنے والے اور تنہائیوں میں اللہ سے ڈرنے والے کو بخشش اور باعزت اجر کی خوش خبری دے۔ یہاں ''مغفرۃ'' نکرہ

---

① ملاحظہ ہو سورۃ الحجر:9 اور سورۃ الانبیاء:50 ② ق:45 ③ ق:33

ہے جس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی وسیع بخشش ہوگی جو تمام پہلوؤں کو ڈھانپ لے گی اور اللہ کے بندے پر گناہ کا کوئی اثر نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ﴾ ①

''یقیناً تیرا ربّ وسیع بخشش والا ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ ②

''اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔''

اللہ کی رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔ یہ بخشش اس کی رحمت کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ ایسا رحیم وغفور ہے کہ بخشنے کے بعد نہ عذاب ہے نہ ہی کوئی عار۔ یہ مغفرت ایمان کا نتیجہ ہے اور ''رزق کریم'' اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۝﴾ ③

''تو وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے سراسر بخشش اور باعزت رزق ہے۔''

گناہ گار مومن بالآخر ایمان کی برکت سے ہی جہنم سے نجات پائے گا۔ ''رِزْقٌ کَرِیْمٌ'' باعزت رزق۔ ''کریم'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے اور یہ ''کرم'' سے مشتق ہے جس کا اطلاق پسندیدہ اخلاق اور صفات محمودہ پر ہوتا ہے۔ اور ''الکریم'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم جنس چیزوں میں سب سے زیادہ صاحب شرف وفضل ہو۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت جب ''الکریم'' ہو اس سے احسان وانعام کرنے والا مراد ہوتا ہے کہ وہ بغیر استحقاق کے انعامات سے نوازتا اور بغیر سوال کے احسان فرماتا ہے۔

---

① النجم: 32 ② الزمر: 35 ③ الحج: 50

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نازل کردہ قرآن بھی ''کتاب کریم اور قرآنِ کریم'' ہے اور رسول بھی ''رسولِ کریم'' ہے، جنت بھی ''مقام کریم'' ہے، جنت کا رزق بھی ''رزق کریم'' ہے اور مومن کا اجر بھی ''اجرِ کریم'' ہے۔ یہاں ''رزق کریم'' جو فرمایا اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کو رزق ایک دوسرے کے باہم تعاون کے نتیجے میں مل رہا ہے، خود بخود رزق کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ گویا دنیا میں حصولِ رزق کے لیے انسان باہم ایک دوسرے کے محتاج اور ممنون ہیں۔ دنیا میں رزق کے حصول کے لیے کوشش اور محنت کی ضرورت ہے اور اس کی تلاش کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے مگر جنت میں ''رزق کریم'' ملے گا اور بلا محنت ومشقت ملے گا، وہ اس کے حصول میں کسی کا ممنون ومحتاج نہیں ہوگا۔ اور وہ ایسا رزق ہوگا جس کے کھانے سے ڈکار آئے گا تو کستوری کی خوشبو آئے گی، کھانے پینے سے بول وبراز کی حاجت نہیں ہوگی۔ ایسی شراب طہور پلائی جائے گی جس کے برتنوں پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔ تختِ شاہی پر حسب خواہش ہر چیز حاضر خدمت کی جائے گی۔ کسی کوفت اور کسی قسم کی محرومی کا وہاں کوئی تصور نہیں ہوگا۔ اہل جنت دنیا میں لذتِ جسمانی سے بے نیاز ہوکر تمام کلفتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے، اب جنت میں ان کی لذت کے لیے وہ سب سامان ہوگا جس کا تصور دنیا میں کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ ①

''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے اُس عمل کی جزا کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

اس لیے رزق جنت ''رزق کریم'' ہے جہاں ہر مقصود حاصل ہوگا اور پورے اعزاز واکرام سے حاصل ہوگا۔

یہ بھی ''اجر کریم'' ہی تو ہے کہ ایک نیکی کے بدلے میں دس سے سات سو نیکیوں کا بدلہ

---

① السجدۃ 17

ملے گا۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس سے زیادہ بھی نواز دے گا۔ دنیا میں ہر عمل کا اجر عمل کے مطابق ہی ملتا ہے، مگر آخرت میں جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے گا، عطا فرمائے گا۔

تنبیہ:

اس آیت میں ''ذکر'' کی پیروی کرنے والے اور ''رحمٰن'' سے ڈرنے والے کے لیے بخشش اور ''اجر کریم'' کی بشارت ہے مگر کیا ان دونوں اوصاف سے متصف شخص کو کہا جا سکتا ہے وہ اس بشارت کا مستحق ہے اور جنتی ہے؟ بالکل نہیں، عمومی طور پر تو ان اوصاف سے متصفین کو اس بشارت کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے مگر کسی متعین شخص کو نہیں۔ کیونکہ اعمال کا دارومدار حسن خاتمہ پر ہے۔ حضرت سہل بن سعد ؓ ساعدی سے ایک طویل روایت میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الرجل ليعمل عمل اهل الجنة فيما يبدو للناس وهو في النار. ①

لوگوں کی نگاہوں میں آدمی اہل جنت کا عمل کرتا ہے مگر وہ جہنم میں جاتا ہے۔

امام بخاری نے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے: ''باب لا يقال فلان شهيد (یہ نہیں کہنا چاہیے کہ فلاں شہید ہے)'' اور معلقاً حضرت ابوہریرہ ؓ کی یہ حدیث بھی ذکر کی ہے کہ: اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور کون اس کی راہ میں زخمی ہوتا ہے۔ اس موضوع میں اور بھی کئی احادیث مروی ہیں، مگر آج کل تو شہید اور جنتی قرار دیے جانے کی بڑی ارزانی ہے۔ جب کہ یہ معاملہ بڑا مشکل ہے۔ نہ نامزد طور پر کسی کو جنتی کہنا چاہیے اور نہ ہی جہنمی، بلکہ کہنا چاہیے: ہم امید رکھتے ہیں کہ اللہ اسے شہادت کا مرتبہ عطا فرمائے گا۔ یا ہم اس کی بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ صرف ان ہی کو جنتی کہا جا سکتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ ﷺ نے جنتی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ شرح عقیدہ طحاویہ ②، النبراس ③ اور دیگر کتب عقائد میں منقول ہے۔

---

① بخاری: 2898 ② شرح عقیدہ طحاویہ: ص 365، 426 ③ النبراس: ص 557

﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [یٰسٓ:12]

’’بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں جو عمل انھوں نے آگے بھیجے اور ان کے چھوڑے ہوئے نشان بھی اور جو بھی چیز ہے ہم نے اسے ایک واضح کتاب میں ضبط کر رکھا ہے۔‘‘

پہلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا ذکر ہوا ہے اور اسی حوالے سے بطورِ تسلی فرمایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرنا دراصل ان کے استکبار کا نتیجہ ہے۔ وہ حقیقت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی اسی ضد کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اندھا کر دیا ہے، انھیں راہِ حق نظر ہی نہیں آتا۔ آپ ﷺ کی دعوت کو وہی قبول کرتے ہیں جو قرآنِ حکیم کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں۔ مگر جو قرآن سننا ہی نہیں چاہتے اس کے سننے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اللہ کا ڈر ان کے دلوں سے نکل گیا ہے، وہ آپ ﷺ کی دعوت کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

اب اس آیت میں منکرین کے اعتراض کا جواب ہے جو ’’اِنذار‘‘ کے جواب میں کہتے تھے:

﴿اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝﴾ ①

’’کیا یہ تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ بے شک جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں بن گئے تو تم یقیناً نکالے جانے والے ہو۔ دوری ہے، دوری ہے اس کے لیے جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔ نہیں ہے یہ (زندگی) مگر ہماری اس دنیا کی زندگی، ہم (یہیں) مرتے ہیں

---

① المؤمنون: 35-37

اور جیتے ہیں اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔‘‘

ایک اور مقام پر ان کے اسی فکر کا یوں بیان ہوا ہے:

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ①

’’اور انھوں نے اپنی پکی قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے، کیوں نہیں! وعدہ ہے اس کے ذمے سچا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

ان کے اسی قسم کے دعووں کے جواب میں یہاں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ ’’بے شک ہم ہی مُردے کو زندہ کرتے ہیں۔‘‘ یہاں ﴿اِنَّا نَحْنُ﴾ میں توحید کی طرف اشارہ ہے کہ ہم ہی زندہ کریں گے، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ ②

’’اور بے شک ہم، یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔‘‘

جس طرح پہلی بار زندگی عطا کرنے والا اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں، اسی طرح موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے والا بھی اللہ ہی ہے، کوئی اور نہیں۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو پہلی بار پیدا کرنے میں کوئی دشواری اور کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ زندہ کرنے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اسی سورۂ یٰسٓ ہی میں فرمایا ہے:

﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ﴾ ③

’’کہہ دے: انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور وہ ہر طرح کی تخلیق کو خوب جاننے والا ہے۔‘‘

---

① النحل:38 ② الحجر:23 ③ یٰسٓ:79

﴿وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ﴾ ”اور ہم لکھ رہے ہیں جو عمل انھوں نے آگے بھیجے اور ان کے چھوڑے ہوئے نشان بھی۔“ اس میں قیامت کے بارے میں کفار کے ایک اشکال کا جواب ہے۔ جس طرح وہ یہ کہتے تھے کہ تمام انسانوں کے اجسام جو مٹی میں دفن ہو جاتے ہیں، ان کے اعضاء بکھر جاتے ہیں، بعض وہ ہیں جو پانی میں ڈوب مرتے ہیں اور دریائی جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں، بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو درندوں کا لقمہ بن جاتے ہیں، اس لیے انسانوں کا اٹھایا جانا ممکن نہیں۔ اسی طرح وہ یہ بھی تصور کرتے تھے کہ تمام انسان جو کچھ کرتے ہیں ان کا ریکارڈ محفوظ کیونکر رکھا جا سکتا ہے۔ اسی شبہ کے ازالے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ جو عمل وہ کرتے ہیں ہم انھیں لکھ رہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ ①

”وہ کوئی بھی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک تیار نگران ہوتا ہے۔“

وہ نگران کراماً کاتبین ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ②

”حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں۔ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔“

اس لیے ہر ایک کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اسی ریکارڈ کے مطابق قیامت کے دن ان کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔

﴿مَا قَدَّمُوْا﴾ سے مراد اعمال ہیں، خواہ وہ نیک ہوں یا بُرے۔ اسی حوالے سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ

---

① ق:18 ② الانفطار:10-12

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ①

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے، اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو۔"

یہودیوں نے کہا: اللہ فقیر اور ہم غنی ہیں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو بھی شہید کیا۔ جس کے نتیجے میں انھیں جہنم واصل کیا جائے گا۔ اسی حوالے سے فرمایا گیا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ ②

"یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ بے شک اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔"

ایمانداروں کے بارے میں اسی اسلوب میں فرمایا ہے:

﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ③

"اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور جو بھی نیکی تم اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پالو گے۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔"

اس لیے کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا جو کچھ کرے گا قیامت کے دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ ④

---

① الحشر 18:59 ② آل عمران 182:3 ③ البقرة 110:2 ④ الزلزال 8,7:99

''تو جو شخص ایک ذرّہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرّہ برابر بُرائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''

منکرین آج جس حقیقت کا انکار کرتے ہیں قیامت کے دن جب یہ منظر دیکھیں گے تو بول اٹھیں گے:

﴿يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ ①

''ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے اور تیرا ربّ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

﴿وَاٰثَارَهُمْ﴾ اور ان کے چھوڑے ہوئے نشان۔ اٰثار، اثر کی جمع ہے۔ جس کے معنی نشان ہیں۔ نقشِ قدم کو بھی ''اثر'' کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کے ہاں گئے اور منزلِ مقصود سے آگے بڑھ گئے تو پھر:

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ ②

''سو وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر پیچھا کرتے ہوئے واپس لوٹے۔''

حدیث نبوی پر بھی ''اثر'' کا اطلاق اسی معنی میں ہوتا ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور نقشِ قدم کا ذکر ہوتا ہے۔ اور ''اثر'' کی نسبت سے حدیث کی پیروی کرنے والے کو ''اثری'' کہا جاتا ہے۔

یہاں ''اٰثار'' کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ انھوں نے اپنے پیچھے جس قسم کے آثار چھوڑے ہم انھیں لکھ رہے ہیں۔ اگر نیک اعمال چھوڑے ہیں تو انھیں ان کا اجر ملے گا اور

---

① الکہف: 49. ② الکہف: 64.

اگر برائیوں کا بیج بو کے گئے ہیں تو اس کا بھی ''وِزر'' ان پر ہو گا۔یہی مفہوم ایک اور مقام پر یوں بیان ہوا ہے:

﴿يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ﴾ ①

''اس (قیامت کے) دن انسان کو بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا۔''

جیسے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا اور ان کے اجروں میں کوئی کمی نہیں ہو گی، اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ جاری کرے گا تو اسے اس برے طریقے کا گناہ ہو گا اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کے برے عملوں کا گناہ اسے بھی ملے گا اور ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ ②

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کا نامۂ اعمال منقطع ہو جاتا ہے: (1) وہ نفع بخش علم چھوڑ گیا، (کسی کو علم پڑھا گیا، یا تحریر وتصنیف کی صورت میں چھوڑ گیا اور لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔) (2) نیک بیٹا چھوڑ گیا جو اس کے لیے دعائے خیر کرے۔ یا (3) صدقہ جاریہ کا اہتمام کر گیا۔ جیسے مسجد و مدرسہ کی تعمیر کر گیا، کنواں یا پانی کا انتظام کر گیا، یا کتب خانہ ولائبریری بنا گیا یا غریبوں کے علاج کے لیے ہسپتال بنوا گیا۔ تو اس نوعیت کے صدقہ جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی انسان کو ملتا رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بھی قتل کیا جائے گا۔ ابن آدم کو اس قتل کے گناہ کا حصہ ملے گا۔ کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کیا۔ ③

---

① القيامة:13 ② صحيح مسلم:1017 وغيره
③ بخاري: 3335، صحيح مسلم وغيره

یہی تفسیر امام سعید بن جبیرؒ سے بھی منقول ہے۔ علامہ بغویؒ وغیرہ نے بھی یہی تفسیر پسند کی ہے۔

دوسرا مفہوم:

﴿وآثارھم﴾ کا دوسرا مفہوم یہ بھی بیان ہوا کہ اس سے امور خیر یا امور شر کے لیے اٹھنے والے قدموں کے نشان مراد ہیں۔ امام مجاہد، حسن بصری اور قتادہ سے یہی قول منقول ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے اللہ کی راہ میں اٹھنے والے آثارِ قدم لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ التوبہ میں ہے:

﴿وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

”اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنو سلمہ نے چاہا کہ ہم مسجد نبوی کے قریب گھروں میں منتقل ہو جائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تمھارا ارادہ ہے کہ ہم مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں۔ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں ہمارا یہی ارادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا بنی سلمة دیارکم تکتب آثارکم، دیارکم تکتب آثارکم.)) ②

”اے بنی سلمہ اپنے گھروں میں برقرار رہو تمھارے قدموں کے آثار لکھے جاتے ہیں، اپنے گھروں میں برقرار رہو تمھارے قدموں کے آثار لکھے

---

① التوبة:121 ② صحیح مسلم: 665

جاتے ہیں۔"

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنوسلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد نبوی سے دوری کی شکایت کی اور مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ جس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا:

((إن آثار کم تکتب))

"تمھارے قدموں کے آثار کو لکھا جاتا ہے۔"

چنانچہ انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ روایت ترمذی ①، طبری، ابن ابی حاتم وغیرہ کتب میں طریف بن شہاب ابوسفیان کے واسطہ سے مروی ہے اور وہ ضعیف ہے مگر مسند بزار وغیرہ میں سعید بن ایاس الجریری ان کا متابع موجود ہے اور وہ ثقہ ہے۔ سعید اگرچہ مختلط ہے مگر یہ روایت ان سے امام شعبہ اور عبدالاعلیٰ روایت کرتے ہیں اور ان دونوں نے سعید الجریری سے اختلاط سے پہلے سماع کیا ہے۔ ②

اس لیے یہ روایت سنداً صحیح ہے مگر حافظ ابن کثیر نے فرمایا ہے اس واقعہ کے تناظر میں اس آیت کے نزول کا ذکر غریب ہے کیونکہ یہ سورت بتمام وکمال مکی ہے۔ اسی نوعیت کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً ابن ماجہ ③ وغیرہ میں مروی ہے کہ انصار کے گھر مسجد سے دور تھے تو انھوں نے مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ ④

اور علامہ منذری نے الترغیب ⑤ میں جو اس کی سند کو جید کہا ہے، محل نظر ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اس کے موقوف ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ کسی آیت کے شانِ نزول میں بسا اوقات "نزلت فی کذا" (یہ فلاں واقعہ پر نازل ہوئی) اس سے مراد یہ بھی ہوتا ہے

---

① ترمذی: 3226 ② تہذیب: 7/4 ③ ابن ماجہ: 785

④ مصباح الزجاجہ: 101/1 ⑤ الترغیب: 209/1

کہ یہ واقعہ بھی اس کا مصداق ہے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مقدمہ فی اصول التفسیر، ص:48 میں، علامہ زرکشی نے البرہان ① میں اور علامہ سیوطی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی واقعہ کے تناظر میں آیت کا نزول دوسری بار بھی ہو۔ لہٰذا جب حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی روایت ثقہ راویوں سے مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے تو ممکن ہے آیت کا نزول مکرر ہو یا راوی نے اسے اس واقعہ کے مصداق کے اعتبار سے روایت کیا ہو۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

مسجد میں دور سے چل کر آنے کی فضیلت میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نماز کا اجر و ثواب سب سے زیادہ اسے ملتا ہے جو سب سے زیادہ دور سے نماز کے لیے آتا ہے۔ ②

حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب فرماتے ہیں کہ انصار میں ایک انصاری صحابی تھے جن کا گھر مسجد سے سب سے دور تھا، تمام نمازیں مسجد میں پڑھتے تھے، کوئی نماز بھی فوت نہیں ہوتی تھی، انھیں کہا گیا کہ کاش تم کوئی گدھا (سواری کے لیے) لے لو اندھیرے میں اور سخت گرمی میں اس پر سوار ہو کے آیا کرو۔ اس نے کہا: مجھے یہ پسند نہیں کہ میرا گھر مسجد کے قریب ہو، میں چاہتا ہوں کہ میرا مسجد کی طرف چل کے آنا اور واپس گھر جانا (میرے اجر میں) لکھا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ سب تمھارے لیے (نامہ اعمال میں) جمع کر دیا ہے۔ ③

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسے اعمال نہ بتلاؤں جن کی بدولت اللہ گناہ معاف کر دیتا ہے اور درجات بلند کر دیتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جی ہاں فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ چاہتے ہوئے بھی

---

① البرھان:32,31/1 ② بخاري: 662 ومسلم
③ مسلم663

پورا پورا وضو کرنا، بکثرت قدموں پر چل کر مسجد کی طرف آنا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا۔ یہی رباط ہے۔ یہی رباط ہے۔ یہی رباط ہے۔ ① اس موضوع کی دیگر روایات کے لیے الترغیب والترہیب ② ملاحظہ فرمائیں۔

ثابت البنانی فرماتے ہیں: میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تیزی سے چلنے لگا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا پھر ہم آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ جب ہم نے نماز مکمل کر لی تو انھوں نے فرمایا: میں زید بن ثابت کے ہمراہ تھا تو میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا، انھوں نے فرمایا: اے انس رضی اللہ عنہ تمھیں معلوم نہیں آثارِ قدم لکھے جاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ اثر نقل کر کے فرمایا ہے کہ اس میں اور پہلی تفسیر میں کوئی منافات نہیں بلکہ اس سے اس کی بالاولیٰ تصدیق ہوتی ہے کہ جب آثارِ قدم لکھے جاتے ہیں تو پھیلائی ہوئی بھلائی اور برائی بالاولیٰ لکھی جائے گی۔

﴿فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ ہر شے ہم نے "امام مبین" میں شمار اور ضبط کر رکھی ہے۔ یعنی انسان جو کچھ کرتا ہے وہ سب "امام مبین" میں محفوظ و منضبط ہے۔ یہاں لفظ "احصیناہ" ہے "کتبناہ" نہیں جو "کتبناہ" سے زیادہ فصیح ہے۔ کتابت کے بعد متفرق اشیاء کو جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر "احصاء" میں گننے اور احاطہ کرنے کا مفہوم بنفسہٖ پایا جاتا ہے۔ یہ لفظ "حصًی" (یعنی کنکریاں) سے ماخوذ ہے۔ عرب گنتی میں کنکریوں پر اعتماد کرتے تھے۔ حدیث میں ہے: ((من أحصاها دخل الجنة.)) "جو اسمائے حسنیٰ کو یاد کر لے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔" ③

"امام" وہ ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا کتاب وغیرہ۔ اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر۔ ④ اس کی جمع "ائمۃ" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے حواریوں کے بارے میں فرمایا ہے:

---

① صحیح مسلم:251 ② الترغیب والترہیب 1/206-213
③ مفردات وغیرہ ④ مفردات

﴿وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ ①

''اور ہم نے انھیں ایسے پیشوا بنایا جو آگ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔''

جس طرح ''ائمة الهدیٰ'' ہیں اسی طرح ''ائمة الكفر'' بھی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ''امام'' بنایا ہے۔ ②

تورات کو بھی ''امام'' کہا گیا ہے:

﴿وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً﴾ ③

''اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی جو امام اور رحمت تھی۔''

قرآن مجید بھی امام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''هو إمامك فإن شئت فأقل منه أو إن شئت فأكثر.'' ④

''وہ (قرآن) تیرا امام ہے اگر تو چاہے تو اس سے تھوڑا پڑھ اور اگر تو چاہے تو زیادہ پڑھ۔''

بلکہ آیت کریمہ ﴿يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ﴾ ⑤ میں بھی امام ابن جریر وغیرہ نے ''امام'' سے مراد قرآن پاک لیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اس آیت میں ''امام'' سے مراد نامۂ اعمال ہے۔ یوں نامۂ اعمال کو امام اس لیے کہا گیا ہے کہ اس پر انسان نے زندگی بسر کی ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں کہ ''امام'' سے مراد نبی ہیں۔ گویا ہر ہر نبی کی امت کو بلایا جائے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''قال بعض السلف هذا أكبر شرف أصحاب الحديث لأن

---

① القصص:41 ② البقرة:124

③ هود:17، الاحقاف:12

④ ابن أبي شيبه:1/317 ⑤ بني اسرائيل:71

إمامهم النبي.» ①

”بعض سلف نے فرمایا ہے کہ اس میں اصحاب الحدیث کا بہت بڑا شرف ہے کہ ان کے امام نبی کریم ﷺ ہیں۔“

کیونکہ وہ ببانگ دہل کہتے ہیں ؂

کسی کا ہو رہے کوئی
نبیؐ کے ہو رہے ہیں ہم

یہاں ”إمـــام مبیـن“ سے مراد لوحِ محفوظ ہے کہ فرشتے احکام کی تنفیذ میں لوحِ محفوظ کی پیروی کرتے ہیں۔ جس کی جتنی عمر، جس قدر اس کا رزق اور جیسا اس کا بخت نیک یا بد ہوتا ہے، اور جن جن حوادث سے اسے گزارنا ہے ان تمام میں وہ لوحِ محفوظ کی پیروی کرتے ہیں۔ انسان نے جو کچھ اس دنیا میں کرنا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کی بنا پر ان تمام اعمال اور اس سے متعلقہ حوادث اور تمام فیصلوں کو پہلے سے اس لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ ”امام مبین“ کی یہی تفسیر امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید سے منقول ہے۔

”لوحِ محفوظ“ کو ام الکتاب، کتاب مکنون اور کتاب مبین بھی کہا گیا ہے۔ گویا اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جو کچھ انھوں نے آگے بھیجا ہے یا جو کچھ پیچھے چھوڑ آئے ہیں اسے ہمارے کراماً کاتبین لکھ رہے ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ ”امام مبین“ میں ہم نے اس حوالے سے ساری باتیں پہلے سے ہی محفوظ کر رکھی ہیں۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ ②

”اور اس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہیں اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

---

① ابن کثیر:3/73 ② الجن:28

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۝﴾ ①

”اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی تر ہے اور نہ خشک مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔“

اس موضوع کی متعدد آیات ہیں۔ مگر ان کا استیعاب یہاں مطلوب نہیں۔ یہاں صحیفہ تقدیر میں انسان کے اعمال وافعال اور دنیا کے احوال وحوادثات اور قیامت میں انسان کے مقدرات ونتائج مراد ہیں۔ جنت میں جانے کے بعد کے لا متناہی حوادث وانعامات مراد نہیں کہ وہ تو غیر محدود ہوں گے جبکہ لوح محفوظ محدود ہے۔ ②

بعض متاخرین نے اس سے صحائف اعمال مراد لیے ہیں اور پہلے جملے کی مزید وضاحت قرار دیا ہے کہ ان کا جو نامۂ اعمال لکھا جا رہا ہے اس کے لکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی اور یہ ایسے نہیں کہ کہیں ضائع ہو جائیں گے، ہرگز ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ہر چیز ایک واضح دفتر میں محفوظ ہو رہی ہے، جیسے ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَ كُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ۝ وَ كُلُّ صَغِیْرٍ وَّ كَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ۝﴾ ③

”اور ہر چیز جسے انھوں نے کیا وہ دفتروں میں درج ہے، اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔“

علامہ آلوسی نے یہاں یہ بات بھی فرمائی ہے جیسے بعض متصوفین نے ”کتاب مبین“ سے مراد انسان کامل لیا ہے اسی طرح غالی رافضیوں نے ”امام مبین“ سے حضرت علی مراد لیے ہیں۔ مگر یہ سراسر قرآن سے جہالت کا نتیجہ ہے۔

---

① الأنعام: 59 ② [illegible] ③ القمر: 52، 53

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝﴾ [یٰسٓ:14،13]

''اور ان کے لیے بستی والوں کو بطورِ مثال بیان کر، جب اس میں بھیجے ہوئے آئے، جب ہم نے ان کی طرف دو (پیغمبر) بھیجے تو انھوں نے ان دونوں کو جھٹلا دیا، پھر ہم نے تیسرے کے ساتھ تقویت دی تو انھوں نے کہا بے شک ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔''

مذکورہ بالا اور ان کے بعد کی آیات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک بستی والوں کا اور ان کی طرف اپنے رسولوں کے بھیجنے کا بطور مثال ذکر کیا ہے۔ جس سے ایک طرف تو اہل مکہ کو خبردار کرنا مقصود ہے کہ اس مثال کے تناظر میں دیکھ لو کہ میرے انبیاء کی تکذیب کا انجام کیا ہے۔ اور دوسری طرف اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے کہ اہل مکہ اگر آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو مکذبین کا یہ کوئی نیا انداز نہیں۔ جس دور میں بھی ہم نے رسول بھیجے ہیں ان کے مخاطبین میں سے اکثر نے ان کی تکذیب کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اس کے علاوہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی ایک اشارہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق میں سعی بلیغ کریں اور اس راہ میں آنے والے مصائب کی کوئی پروانہ کریں۔ ان انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والوں سے سبق سیکھیں۔

یہ کون سی بستی تھی اور وہ رسول کون کون سے تھے؟ اس بارے میں مفسرین کرام کے ہاں اختلاف ہے۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ اس بستی سے مراد انطاکیہ ہے۔ حتی کہ علامہ قرطبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ تمام مفسرین کی یہی رائے ہے۔ اس کے بادشاہ کا نام انطیخس تھا اور تین انبیاء کا نام صادق، صدوق اور شلوم تھا۔ اور بعض نے ان کے نام شمعون، یوحنا اور

بولس ذکر کیے ہیں۔

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ انطاکیہ میں بھیجے گئے یہ رسول نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے۔ علامہ قرطبیؒ وغیرہ نے ان کے بارے بڑا دیو مالائی قصہ بیان کیا ہے جس کی کوئی اصل نہیں اس لیے ہم اسے نقل کرنا ہی مناسب نہیں سمجھتے۔

پہلا قول ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، کعب الاحبارؒ، وہب بن منبہؒ سے بلا سند ذکر کیا ہے جسے وہ "بلغنی" کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ دوسرا قول امام قتادہؒ سے منقول ہے مگر یہ معنوی اعتبار سے بالکل درست نہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس پر تین پہلوؤں سے نقد کیا ہے۔ ہم انھیں تھوڑے سے اضافہ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

1: آیت میں "مرسلون" اللہ کے رسولوں کا ذکر ہے۔ مسیح علیہ السلام کے حواری ہوتے تو وہ کہتے ہمیں مسیح علیہ السلام نے بھیجا ہے۔ اور نہ بستی والے ان پر یہ اعتراض کرتے کہ تم تو ہماری طرح بشر ہو۔ کیوں کہ یہ اعتراض ہمیشہ رسولوں کے بارے میں ہوا ہے کسی حواری یا نقیب کے بارے میں نہیں ہوا۔

2: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے حواریوں کو انطاکیہ بھیجنا بھی محل نظر ہے کیونکہ اہل انطاکیہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں رومیوں کے زیر تسلط تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ غیر اسرائیلیوں کی طرف وہ اپنے حواریوں کو کیونکر بھیج سکتے تھے۔ علاوہ ازیں تاریخی اعتبار سے تمام اہل انطاکیہ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اور باختلاف زمانہ چار شہر ہیں جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پہنچی اور وہاں کے باشندوں نے اس پر لبیک کہا۔ ان میں ایک یہی انطاکیہ، دوسرا اسکندریہ، تیسرا بیت المقدس اور چوتھا اٹلی تھا۔ اس لیے انطاکیہ کو ان آیات کا مصداق قرار دینا اور رسولوں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری لینا درست نہیں۔

3: تیسری بات حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ فرمائی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور دیگر سلف سے منقول ہے کہ نزولِ تورات کے بعد کسی امت کو ہلاک نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی﴾ ①

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد کہ ہم نے پہلی نسلوں کو ہلاک کر دیا۔''

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تورات نازل ہونے کے بعد کسی قوم پر آسمانی یا زمینی عذاب نازل نہیں ہوا سوائے ایک بستی والوں کے جنھیں بندر بنا دیا گیا تھا۔ یہ تفسیر بعض دیگر حضرات سے بھی منقول ہے۔ اہل انطاکیہ کے بارے میں کہیں منقول نہیں کہ ان پر کبھی عذاب آیا ہو نہ ملت نصرانیہ میں نہ اس سے پہلے۔ اگر یہ ''انطاکیہ'' ہی ہے تو یہ اسی نام کا کوئی اور شہر ہے مشہور انطاکیہ شہر مراد نہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے امام قتادہؒ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ رسول تھے۔ اور مسیح علیہ السلام سے پہلے ہوئے ہیں۔ امام بخاریؒ کا بھی یہی رجحان ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوئے ہیں۔ ②

اس کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون ہیں، بستی سے مراد مصر ہے۔ اور تیسرے سے مراد مومن آل فرعون ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں کیونکہ ان رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں جو عذاب اہل قریہ پر آیا تھا وہ ''صیحة واحدة'' ایک چیخ تھی۔ جبکہ فرعون مع اپنے حواریوں کے دریا میں غرق ہوا تھا۔ مولانا اصلاحی نے اس عقدہ کی گرہ کشائی کی جو کوشش کی ہے اس کی وضاحت ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔ صحیح یہی ہے کہ اس بستی کی تعیین نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں اور ان رسولوں کے بارے میں بھی کسی مستند ماخذ سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس زمانے میں تھے اور کون تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی تو محض اسرائیلی اور غیر مستند اقوال سے اس کی تعیین کی ضرورت ہی کیا ہے جو بجائے خود معنوی اعتبار سے بھی درست نہیں ہیں۔ اس قصہ سے مقصود بالذات رسولوں کی تعیین نہیں بلکہ مقصود کفار مکہ کو خبردار کرنا ہے کہ تمھارا حال بھی انھی بستی

---

① القصص:43 ② فتح الباری:6/467

والوں کی مانند ہے۔تم بھی وہی چال چل رہے ہو جو بستی والے چلتے تھے پھران کا جوانجام ہوا اس سے خبردار رہو کہیں تم بھی عذاب میں نہ دھر لیے جاؤ۔

﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ﴾ ''ضرب'' کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنا،اوراس کا استعمال مختلف اعتبارات سے بہت سے معانی میں ہوتا ہے۔مارنے کے معنی میں تو معروف ہے،اس کے علاوہ ''ضرب الارض بالمطر'' کے معنی بارش برسنے کے ہیں کہ وہ بھی اوپر سے زمین پر ٹپکتی ہے۔اسی طرح ''ضرب الدراهم'' کا محاورہ ہے،یعنی دراہم ڈھالنا۔ٹکسال کے سکہ میں اثر کرنے کی مناسبت سے اس مفہوم میں یہ محاورہ ہے۔ ''ضرب في الأرض'' کے معنی سفر کرنے کے ہیں کیونکہ پیدل چلتے ہوئے انسان پاؤں زمین پر مارتا ہے،قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ ①

''اور جب تم زمین میں سفر کرو۔''

اوراس مفہوم میں عموماً ضرب کا استعمال ''في'' کے ساتھ ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ﴾ ②

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا: اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار۔''

مگر سرسیّد اس کے معنی کرتے ہیں: لاٹھی کے سہارے (چشمے والے) پتھر کی طرف چلو۔اسی قسم کا مفہوم غلام احمد پرویز نے بیان کیا ہے۔معجزات سے انکار ان کی مجبوری ہے۔ اسی تناظر میں یہ ''خدمت'' سرانجام دی جارہی ہے۔قرآنِ مجید میں ''ضرب'' کا استعمال جب ''فـي'' سے ہوا ہے تو اس کے معنی چلنے کے آئے ہیں جیسا کہ اوپر سورۃ النساء ③

---

① النساء:101 ② البقرة:60

③ النساء:101

کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ مزید مثالوں کے لیے دیکھیے: النساء①، المائدۃ②،
المزمل③، آلِ عمران۔④

اسی طرح ایک محاورہ "ضرب الخیمۃ" ہے کیونکہ خیمہ لگانے کے لیے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے۔ "ضرب اللبن" یعنی اینٹیں چننا۔ ایک اینٹ کو دوسری پر رکھنا۔ "ضرب" مثل یا مثال کے معنی ومحاورہ میں "ضرب الدراھم" سے ماخوذ ہے کہ کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو جائے۔ یہاں "ضرب" بھی اسی مثال کے معنی میں آیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے "مفردات" ملاحظہ فرمائیں۔ ﴿ھم﴾ ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں کہ ان کے لیے یہ مثال بیان کیجیے۔

﴿إِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُونَ﴾ "جب ان میں بھیجے ہوئے آئے۔" اشارہ ہے کہ ان کا آنا اپنی مرضی سے نہیں تھا، انھیں اسی نے بھیجا ہے جس نے انھیں رسول بنایا۔ اشارہ ہے کہ جس طرح ہم نے اس بستی والوں کے پاس انھیں بھیجا اسی طرح آپ ﷺ کو بھی اس بستی والوں کی طرف ہم نے بھیجا ہے۔

﴿إِذْ أَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمُ﴾ ان بستی والوں کی طرف اللہ نے دو رسول بھیجے مگر انھوں نے ان دونوں کی تکذیب کی اور ان کی دعوت ماننے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تقویت وتائید کے لیے تیسرا رسول بھیجا، تینوں نے انھیں سمجھایا کہ ہم تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ گویا تیسرے آنے والے نے بھی انھیں باور کروایا کہ ہم مرسلین سے ہیں۔ امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "فعززناھما" نہیں کہا کہ مقصود ان دونوں کی تقویت نہیں بلکہ حق کی نصرت ہے، اس لیے صرف "عززنا" ہی کہا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ﴾⑤

"ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے۔"

---

① النساء:94 ② المائدۃ:106 ③ المزمل:20
④ آل عمران:156 ⑤ القصص:35

یہاں مفعول کا ذکر ہے مگر سورۂ یٰسٓ کی مندرجہ بالا آیت میں صرف "فعززنا" فرمایا ہے مفعول کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہاں بھی تو نصرتِ حق ہی مطلوب تھا۔ یہ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل تھے اور موسیٰ علیہ السلام نے انھیں اپنی تائید کے لیے رسول بنانے کی تمنا کی تھی:

﴿وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ﴾ ①

"اور میرا بھائی ہارون وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے، تُو اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج کہ میری تصدیق کرے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔"

مگر اس آیتِ یٰسٓ میں وہ دونوں رسول مستقل ناطق بالحق تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ان کی تائید وتقویت مطلوب تھی اور یہاں حق کی تقویت مراد ہے، اس لیے "فعززنا" کا مفعول یہاں بیان نہیں ہوا۔ ②

﴿فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ﴾ یہ تیسرے رسول کون تھے؟ بعض تفسیری روایات میں، جیسا کہ اوپر ہم نے نقل کیا، ان کا نام "شلوم" آیا ہے۔ مگر یہ روایات درجہ اعتبار سے ساقط ہیں۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

"اس سے وہ مومن آلِ فرعون مراد ہے جس کی جانبازیوں کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں ہوا ہے۔"

اس مومن آلِ فرعون کی جانبازیوں کا تفصیلاً ذکر کرنے کے بعد بالآخر یہ بھی فرمایا ہے:

"یہ اس معنی میں رسول نہیں تھے جس معنی میں حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام رسول تھے لیکن ان کے سب سے زیادہ طاقتور، جانثار اور راست باز ساتھی تھے۔"

مگر ان کا یہ خیال بھی درست نہیں، محض زورِ بیان اور الفاظ کے زیر وبم سے کوئی

---

① القصص 34: ② التفسیر الکبیر

حقیقت ثابت نہیں ہوتی۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صاف لفظوں میں ان تینوں کے بارے میں فرمایا کہ انھوں نے کہا: ﴿إِنَّآ إِلَيۡكُم مُّرۡسَلُونَ﴾ ''بے شک ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔'' اور مخاطبین کی تکذیب پر بھی انھوں نے فرمایا: ﴿إِنَّآ إِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُونَ﴾ ''یقیناً ہم تمھاری طرف بھیجے ہوئے ہیں۔'' جبکہ مومنِ آلِ فرعون کا قرآن میں جہاں جہاں ذکر آیا ہے کسی ایک مقام پر اشارتاً بھی اس کے رسول ہونے کا ذکر نہیں ہوا۔ بلکہ بطور نکرہ ''جاء رجل'' نکرہ یعنی ایک آدمی کا ذکر ہوا ہے۔ مگر یہاں تو پہلے دو رسولوں کی دعوت کی تائید وتقویت کے لیے تیسرے رسول کا ذکر ہے اور ان تینوں رسولوں کی حیثیت، جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے، حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح بالتبع رسول ہونے کی نہیں تھی بلکہ مستقل ناطق بالحق ہونے کی تھی۔ قرآن پاک تو بالصراحت ان کے رسول ہونے کا اعلان کرتا ہے مگر مولانا اصلاحی کا تدبر یہ ہے کہ:

''ان کا ذکر یہاں ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے ہوا ہے۔''

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے۔ اس تیسرے رسول کو جو مومنِ آلِ فرعون باور کرایا گیا اس کی تردید آئندہ آیت سے بھی ہو رہی ہے ① جس میں مومنِ آلِ فرعون ہی کی طرح ''رجل'' کے آنے کا ذکر ہے وہ ان ''رسولوں'' کی تابعداری کا کہتا ہے۔ اس کا کردار مومن آل فرعون کا کردار ہے نہ یہ کہ تیسرے رسول کو ہی مومن آل فرعون قرار دے دیا جائے۔

:: :: ::

---

① یٰس:20

﴿قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۝ قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَ مَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ [یٰسٓ 15-17]

''انھوں نے کہا: تم ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو اور رحمان نے کوئی چیز نازل نہیں کی، تم تو محض جھوٹ ہی کہہ رہے ہو۔ انھوں نے کہا: ہمارا ربّ جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمھاری طرف ضرور بھیجے ہوئے ہیں۔ اور ہم پر صاف پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔''

ان رسولوں کی دعوت کے مقابلے میں قوم نے وہی بات کہی جو عموماً مکذبین انبیائے کرام کی تکذیب میں کہتے تھے کہ تم تو ہماری طرح بشر ہو۔ وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہو سکتا۔ کفارِ مکہ بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہی کہتے تھے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ①

''اور ان لوگوں نے خفیہ سرگوشی کی جنھوں نے ظلم کیا تھا، یہ تم جیسے ایک بشر کے سوا ہے کیا؟''

بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مکذبین کے اسی اعتراض کے حوالے سے فرمایا ہے:

﴿وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝﴾ ②

''اور لوگوں کو کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ ایمان لائیں، جب ان کے پاس ہدایت

---

① الأنبياء:3 ② بني اسرائيل:94

آئی مگر اس بات نے کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے انبیائے کرام کی دعوت کو قبول نہ کرنے کا ایک بڑا بہانہ یہ بھی تھا کہ جو بشر ہوتا ہے وہ رسول نہیں ہوسکتا۔ یہی بات تمام قوموں نے کہی جیسا کہ سورۃ المؤمنون ①، الفرقان ②، الانعام ③، التغابن ④، القمر ⑤، ابراہیم ⑥ وغیرہ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے ہم سورۂ قٓ میں جو کچھ عرض کر آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ⑦

دوسری قوموں کی طرح اس بستی والوں نے بھی رسولوں کو یہی جواب دیا کہ تم تو ہمارے جیسے بشر ہو۔ ہم تمھاری بات کیونکر تسلیم کریں۔ تم جھوٹ کہتے ہو رحمٰن نے کچھ بھی نازل نہیں کیا۔ نہ تم پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے نہ ہی تمھارے پاس اللہ کی کوئی وحی آئی ہے۔ وہ گویا "الرحمٰن" کو تسلیم کرتے تھے مگر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ "الرحمٰن" نے ہماری راہنمائی کے لیے کچھ اتارا ہے۔ نزولِ وحی کا انکار دراصل وہ اپنی آزاد فکری اور آباء واجداد کی پیروی میں کرتے تھے کہ اگر وہ الرحمٰن کی "وحی" کا اعتراف کرلیں تو نہ اپنی من مانی زندگی گزار سکتے ہیں اور نہ ہی آباء واجداد کے طریقہ پر قائم رہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ ⑧

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔"

وحی الٰہی کی پیروی آزاد خیال منافقوں پر بھی گراں گزرتی ہے اور آباء واجداد کے متبعین پر بھی، اگرچہ ان کے آباء انھی کی طرح شرک وخرافات میں مبتلا ہوں۔ عقل پرستی

---

① المؤمنون:34,33,24 ② الفرقان:207 ③ الانعام:91 ④ التغابن:6
⑤ القمر:24 ⑥ ابراھیم:11,10 ⑦ قٓ:2 ⑧ لقمان:21

میں وہ یہ تو کہتے ہیں کہ ''الرحمٰن'' نے کچھ نازل نہیں کیا مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ''الرحمٰن'' کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے وحی نازل کرے۔

وحی کے نزول سے انکار کے جرم کا اعتراف وہ قیامت میں کریں گے، جب وہ جہنم میں ہوں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ تو وہ کہیں گے:

﴿قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ﴾ ①

''وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا: اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری۔''

قیامت میں یہ اعترافِ جرم میں جس ندامت میں کریں گے اس سے وحی اور اس کی پیروی کا انکار کرنے والوں کی آنکھیں کھل جانی چاہییں۔

﴿قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ﴾ مکذبین کے جواب میں ان رسولوں نے فرمایا: تم نہیں بلکہ ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم تمھاری طرف ضرور بھیجے گئے ہیں۔ ﴿رَبُّنَا يَعْلَمُ﴾ کہہ کر انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کو اپنے رسول ہونے پر بطور گواہ پیش کیا ہے۔ اور یہ جملہ قسم کے قائم مقام ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کے علم کو گواہ بنا کر جھوٹی بات کہتا ہے کافر ہو جاتا ہے۔ ②

یہاں ﴿رَبُّنَا﴾ اللہ کی صفت ربوبیت کا ذکر فرمایا ہے جس میں اشارہ ہے کہ جس طرح وہ جسم کی پرورش کرنے والا اور اسے پروان چڑھانے والا ہے اسی طرح روح کو حیات اور بلندی سے سرفراز کرنے والا بھی ہے اس لیے اس کا رب ہونا اس کا متقاضی ہے کہ وہ انسانوں کو روح کی غذا بھی مہیا کرے اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے ان کا تزکیہ بھی کرے۔ وہی ربّ جانتا ہے کہ اس نے ہمیں تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کسے کہاں رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اور یہاں مُرْسَلُوْنَ کے ساتھ لام

---

① الملك:9 ② روح المعاني

(لَمُرْ سَلُوْنَ) ذکر کر کے مزید اس میں تاکید پیدا کر دی کہ ہم ضرور بھیجے ہوئے ہیں۔

غور فرمایئے کہ جس حقیقت کا اظہار انھوں نے قسماً کیا ہو اور مزید ﴿لَمُرْسَلُوْنَ﴾ کہہ کر اپنے رسول ہونے کو مؤکد بیان کیا ہو، کیا اس کے بعد اس کی گنجائش رہتی ہے کہ یہاں تینوں نے اپنے آپ کو تغلیباً رسول کہا ہو یا تیسرا حقیقتاً رسول نہیں تھا بلکہ ان کا وفادار تھا رسول صرف دو تھے۔

﴿وَمَا عَلَيْنَآ﴾ یعنی اگر تم نہیں مانتے تو اس میں ہماری کوئی کوتاہی نہیں ہماری ذمہ داری صاف طور پر تمھیں پیغام پہنچا دینے کی تھی وہ ہم نے پوری کر دی۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ اسے مانو یا نہ مانو۔ ہم سے تمھارے کفر کی بابت باز پرس نہیں ہوگی۔ ﴿الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ صاف صاف پہنچا دینا یہ ہے کہ حق کو باطل سے جدا کر دیا جائے۔ اور یہ عموماً معجزات و آیات سے ہوتا ہے۔ یا یہ کہ تبلیغ ہر ہر فرد تک پہنچ جائے کسی کو تبلیغ حق کے بارے ابہام نہ رہے۔ یا یہ کہ ہر ممکن (عقلی و نقلی دلائل سے) حق ظاہر کر دیا جائے اور کسی کو اشتباہ نہ رہے۔ ①

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ○﴾ ②

”اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پس اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسول کے ذمے تو صرف کھلم کھلا پہنچا دینا ہے۔“

رسول کا فریضہ تبلیغ ہے۔ تسلیم کروانا اور منوانا رسول کی ذمہ داری نہیں ہے البتہ ”تبلیغ“ میں رسول پر لازم ہے کہ اللہ کی ہر بات پہنچا دے کوئی حکم چھپا کے نہ رکھے جیسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا ہے:

---

① التفسير الكبير للرازي ② التغابن:12

﴿يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ ①

''اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو، تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔''

رسول بہر حال امین ہوتا ہے وہ نہ تو تبلیغ احکامات الٰہیہ میں کمی کرتا ہے اور نہ ہی تبیین ارشادات ربانیہ میں کوتاہی برتتا ہے۔

① المائدۃ:67

﴿قَالُوْۤا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِکُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّکُمْ وَ لَیَمَسَّنَّکُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌO قَالُوْا طَآئِرُکُمْ مَّعَکُمْ اَئِنْ ذُکِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَO﴾ [یٰسٓ:18،19]

''انھوں نے کہا: بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے، یقیناً اگر تم باز نہ آئے تو ہم ضرور ہی تمھیں سنگسار کر دیں گے اور تمھیں ہماری طرف سے ضرور ہی دردناک عذاب پہنچے گا۔ انھوں نے کہا: تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔ کیا اگر تمھیں نصیحت کی جائے، بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔''

﴿قَالُوْۤا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِکُمْ﴾ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے انبیاء کی وضاحت اور ان منکرین کے رویے سے براءت یہ کفار کے ردّ عمل کا ذکر کیا ہے۔ '' تَطَیُّر '' کے اصل معنی تو کسی پرندے سے شگون لینے کے ہیں، پھر اس کا استعمال ہر اُس چیز پر ہونے لگا جس سے برا شگون لیا جائے اور اُسے منحوس سمجھا جائے، چنانچہ کفار نے انبیاءِ کرام کی دعوت کے خلاف اپنے ردّ عمل کا اظہار یوں کیا کہ (معاذ اللہ) تمھاری نحوست سے ہمارے معبود ناراض ہیں اور جو آفات ہم پر آ رہی ہیں وہ تمھاری بدولت ہیں۔ تمھارے چہروں سے ہمیں کوئی خیر نظر نہیں آتی۔ تم جیسے جہاں گئے وہاں عذاب ہی آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون اور اس کے حواریوں نے بھی یہی ردّ عمل ظاہر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَ مَنْ مَّعَهٗ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَO﴾ ①

---

① الأعراف: 131

''تو جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے: یہ تو ہمارے ہی لیے ہے، اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔ سن لو! ان کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔''

حضرت صالح علیہ السلام سے بھی قوم ثمود نے یہی کہا تھا:

﴿قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طَائِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ٥﴾ ①

''انھوں نے کہا: ہم نے تیرے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے ہمراہ ہیں، بدشگونی پکڑی ہے۔ کہا: تمھاری بدشگونی اللہ کے پاس ہے بلکہ تم ایسے لوگ ہو جو آزمائے جا رہے ہو۔''

منافقین کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات ذکر فرمائی ہے:

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا٥﴾ ②

''اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے: سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں۔''

منافقین ظاہراً اسلام میں داخل ہوئے تھے مگر ان کی باطنی ہمدردیاں یہود کے ساتھ تھیں۔ کوئی مصیبت ان پر آ جاتی، پھلوں میں یا کھیتی میں نقصان ہو جاتا تو کہتے: یہ سب محمد ﷺ کی اتباع اور اپنا دین چھوڑنے کا نتیجہ ہے۔ (معاذ اللہ)

﴿لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ﴾ ہم تمھیں پتھروں سے سنگسار کر دیں گے۔ ایک دو پتھر نہیں بلکہ اتنے پتھر برسائیں گے کہ تمھیں تکلیف دہ موت آ گھیرے گی۔ ﴿عَذَابٌ

---

① النمل 27:47. ② النساء 4:78.

اَلْيَمُّ﴾ سے مراد یہی موت ہے۔

امام مجاہد نے کہا ہے کہ ﴿لَنَرْجُمَنَّكُمْ﴾ سے مراد زبان سے سب وشتم اور زبان کے تیر برسانا ہے۔ بات یہاں تک نہیں رہے گی ﴿وَ لَيَمَسَّنَّكُمْ﴾ تمھاری ایذا رسانی کے لیے کوئی کمی نہیں رہنے دیں گے حتی کہ حرب وضرب کے ذریعے تکلیف دہ عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔ ①

﴿قَالُوْا طَآئِرُكُمْ﴾ انبیائے کرام علیہم السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: بدشگونی تمھاری تمھارے ساتھ ہے، اپنی بدبختی کا سبب دوسروں کو کیوں قرار دیتے ہو، یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ اپنے گریباں میں منھ ڈالو اور اپنے عقائد واعمال کا محاسبہ کرو، یہی دراصل تمھاری نحوست کا باعث ہیں۔ توحید کی بجائے شرک کو تم نے قبول کیا، حق کا تم نے انکار کیا، اس لیے یہ بے برکتی تمھارے اپنے غلط عقائد واعمال کا نتیجہ ہے۔

بدشگونی کی حرمت:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ "تطیر" کے اصل معنی پرندے سے شگون لینے کے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عموماً پرندوں سے بدشگونی لی جاتی تھی۔ جب سفر پر جاتے یا کوئی کام کرنا ہوتا تو پرندہ اڑاتے تھے، اگر وہ دائیں جانب اڑ جاتا تو اسے بابرکت سمجھتے اور اگر بائیں جانب اڑ جاتا تو منحوس سمجھ کر سفر نہ کرتے۔ سیاہ بلی آگے سے گزر جائے تب بھی اسے منحوس سمجھتے۔ صفر کے مہینے کو بھی منحوس سمجھتے تھے۔ اُلو کی آواز کو منحوس جانتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا عدوى ولا طيرة ولا هامة ولا صفر.)) ②

"نہ کسی کو دوسرے کی بیماری لگتی ہے، نہ بدشگونی کوئی چیز ہے، نہ ہی اُلو کے بولنے میں کوئی تاثیر ہے اور نہ صفر کی کوئی حقیقت ہے۔"

---

① رازی ② بخاري: 5757، مسلم: 5789

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: "الطيرة شرك" ''بدفالی شرک ہے۔'' ①

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من ردّه الطيرة من حاجة فقد أشرك.)) فقالوا: فما كفارة ذلك؟ قال: ((أن تقول: اللهم لا خير إلا خيرك، ولا طير إلا طيرك ولا إله غيرك.)) ②

''جس شخص کو بدشگونی نے کسی کام سے روک دیا تو اس نے شرک کیا۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یوں کہو: اے اللہ! تیری بھلائی کے علاوہ کوئی بھلائی نہیں، اور یہ پرندہ بھی تیرا پرندہ ہے اور تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔''

بدشگونی کی بجائے اچھی چیز یا اچھے نام سے اچھے تفاول کی اجازت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مشن پر روانہ ہوتے تو "یا نجیح!" (اے کامیاب!)، "یا راشد!" (اے ہدایت یافتہ!) قسم کے الفاظ سننا پسند کرتے تھے۔ ③

صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار کا نمائندہ سہیل بن عمرو آیا تو آپ نے فرمایا: اللہ آسان معاملہ فرمائے گا۔ ④

اس قسم کے فال میں شرک کا کوئی عنصر نہیں ہے بلکہ یہ پسندیدگی فطرت انسانی کا ایسا اقتضا ہے جس کی طرف انسانی فطرت کا میلان ہوتا ہے جیسے اچھے نام کو سن کر انسان خوش ہوتا ہے۔ پھر تفاول میں تو حسن ظن ہے جبکہ بدشگونی میں بلا وجہ اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ بدشگونی سے متعلقہ دیگر احادیث کے لیے مشکاۃ "باب الفال

---

① أبو داود: 3910 ② مسند أحمد: 220/2

③ ترمذي: 1616 ④ الرحيق المختوم ص 556

والطیرۃ" ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔

﴿اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ﴾ یہ جو تم الزام تراشی کر رہے ہو اور ہمیں مستوجب سزا قرار دے رہے ہو تو کیا ہماری نصیحت اور ہماری صداقت پر براہین کے باوجود بھی تمھارا یہی فیصلہ رہے گا۔ ①

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ کیا اس بات پر تم ہمیں منحوس سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں نصیحت کی اور تمھیں صحیح اور غلط سے خبردار کیا۔ برے کام خود کرتے ہو اور منحوس انھیں کہتے ہو جو تمھیں برائی سے منع کر رہے ہیں، بلکہ امر واقع یہ ہے کہ تم حد سے بڑھنے والے ہو کہ وعظ و نصیحت کا بدلہ سخت سزا اور رجم و سنگسار قرار دیتے ہو۔ اور عین طریقہ سعادت کو نحوست سمجھتے ہو۔

---

① رازی

﴿وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ○ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ○﴾ [یٰسٓ: 21,20]

''اور شہر کے سب سے دور کے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ ان کی پیروی کرو جو تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے اور وہ سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔''

پہلی آیات میں تین رسولوں کے منکرین کا ذکر ہے جنھیں اہل مکہ کے لیے بطورِ مثال ذکر کیا گیا ہے کہ اہل مکہ آج رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا اسی طرح انکار کر رہے ہیں جس طرح ایک اور بستی والوں نے ایک رسول کا کیا، تین رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا تھا۔ جس طرح اس بستی والوں کو یکے بعد دیگرے تین رسولوں کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ الٹا رسولوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے اور انھیں قتل کی دھمکیاں دینے لگے، اسی طرح اہل مکہ پر کسی برہان کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس سطح پر ہیں کہ انھیں ڈرانے اور سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ اس بستی میں کوئی بھی ''رجل رشید'' نہ تھا اور کسی کے دل میں اللہ کا ڈر اور اس کے رسولوں کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بلکہ رسولوں کی تکذیب و تہدید کے علی الرغم ایک ایسا شخص تھا جس کا دل اللہ کے خوف سے لبریز تھا اور ان رسولوں پر ایمان رکھتا تھا اور ان کی دعوت کا مؤید بھی تھا۔ بعینہٖ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی تائید میں اور ''رجل مومن'' نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت میں کہا تھا:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ﴾ ①

''کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔''

---

① المؤمن:28

﴿أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ﴾ " أقصى " "قَصِیَ" سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی زیادہ بُعد اور زیادہ دوری کے ہیں۔ "المسجد الأقصیٰ" سے مراد بیت المقدس ہے کیونکہ یہ مکہ مکرمہ سے دوری پر تھا۔ یہاں لفظ "المدینۃ" (شہر) آیا ہے جبکہ شروع قصہ میں "القریۃ" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عموماً بستی کیے جاتے ہیں مگر اس کا اطلاق شہر پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ طائف اور مکہ مکرمہ کے حوالے سے قرآنِ مجید میں کفارِ مکہ کا قول ذکر ہوا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ ①

"اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟"

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ﴾ ②

"اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو تیری اُس بستی سے قوت میں زیادہ تھیں جس (کے رہنے والوں) نے تجھے نکالا، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی ان کا مددگار نہ تھا۔"

بلکہ "القریۃ" وہ جگہ ہے جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو جائیں، تو بحیثیت مجموعی لوگ اور جگہ دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ پر انفراداً بھی "قریۃ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ③

﴿رَجُلٌ يَّسْعٰى﴾ ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا نام حبیب نجار تھا۔ امام مجاہدؒ، مقاتلؒ اور قتادہؒ کا یہی قول ہے۔ ابن اسحاق نے یہی نام حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ حتی کہ یاقوت الحموی

---

① الزخرف 31:43 ② محمد 13:47 ③ المفردات

نے معجم البلدان ① میں انطاکیہ شہر کے تعارف میں یہ بھی لکھا ہے کہ حبیب نجار کی قبر انطاکیہ میں معروف ہے اور دور دور سے لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں، حالانکہ اس بستی یا شہر کو انطاکیہ قرار دینا ہی درست نہیں جیسا کہ پہلے ہم امام ابن کثیر سے نقل کر آئے ہیں چہ جائیکہ وہاں حبیب نجار کی قبر ہو۔ قبر پرستی اور قبروں کی تجارت کے نتیجے میں کتنی جعلی اور بے اصل قبریں وجود میں آئی ہوئی ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ دمشق میں حضرت ابی بن کعب کی قبر ہے، حالانکہ بالاتفاق وہ مدینہ طیبہ میں فوت ہوئے۔ جامع دمشق کے قریب حضرت ہود علیہ السلام کی قبر ہے، حالانکہ کسی صاحب علم نے دمشق میں ان کی وفات ذکر نہیں کی۔ ان کی بعثت یمن میں تھی۔ قوم کی ہلاکت کے بعد وہ مکہ مکرمہ چلے آئے اور وہیں فوت ہوئے۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ یمن میں ہی فوت ہوئے تھے۔ اسی طرح دمشق کے مغربی دروازے کے باہر حضرت اویس رحمہ اللہ کی قبر ہے، حالانکہ کسی نے بھی ذکر نہیں کیا کہ وہ دمشق آئے ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ صفین میں شہید ہوئے تھے۔ بعض نے فارس کی سرزمین کے نواح میں ان کی وفات ذکر کی ہے۔ اسی طرح ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی دمشق میں قبر ہے، حالانکہ بالاتفاق ان کا انتقال مدینہ میں ہوا بلکہ وہ شام تشریف ہی نہیں لے گئیں۔ ②

یہ "قبروں کی تجارت" کا اثر ہے کہ ایسی بہت سی بے اصل اور جعلی عالیشان قبریں ہیں جہاں کسی بزرگ کا کوئی وجود نہیں بس اس کے نام کی قبر ہے بلکہ ایک بزرگ کے نام پر متعدد قبریں ہیں اور ان سب کو "مرجع خلائق" سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان ہی وہاں "حاضری" نہیں دیتے ہندو اور عیسائی بھی "حاضر" ہوتے ہیں اور "مرادیں" پاتے ہیں۔ اب کیا عامۃ الناس کے اس اجتماع سے سمجھ لیا جائے کہ واقعی وہاں بزرگ مدفون ہیں؟ اس لیے انطاکیہ میں حبیب نجار کی قبر سے یہ ثابت کرنا کہ یہ قصہ اسی بستی کا ہے اسی طرح عامۃ الناس کا اس کی زیارت کے لیے دور دراز سے جانا اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ اولیاء اللہ کی قبروں کی طرف

---

① معجم البلدان: 269/1

② مزید تفصیل کے لیے إقتضاء الصراط المستقیم ص 316-319 ملاحظہ فرمائیں۔

دور دراز کا سفر کرنا جائز ہے۔ یہ طریقہ قدیم سے یہود ونصاریٰ کا تھا۔ ان کی قبر پرستی کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ان پر لعنت کی ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

علامہ آلوسی نے حبیب نجار کے حوالے سے مختلف حکایات ذکر کر کے بالآخر کہا ہے:

«لم يتحقق عندي صحة شيء منها.» ①

''ان میں سے کسی شے کی صحت میرے نزدیک متحقق نہیں۔''

اس لیے ان بے اصل حکایات کو ذکر کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔

مولانا اصلاحی کا خیال ہے کہ ﴿رَجُلٌ يَّسْعٰى﴾ سے مراد ''مومنِ آلِ فرعون'' ہے جس کا ذکر سورۃ المومن، الاعراف اور القصص میں ہے۔ حالانکہ القصص میں ﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ﴾ ② آنے والا آدمی موسیٰ علیہ السلام کے اعلانِ نبوت سے سالہا سال پہلے کا ہے جب موسیٰ علیہ السلام سے آل فرعون کا شخص مارا گیا تھا، جب کہ سورۃ المومن ③ کی آیات میں تنہا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرعون کے ارادۂ قتل کا ذکر ہے۔ اور ''رجل مومن'' نے بھی یہی کہا تھا:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ﴾

''کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے۔''

مگر یہاں تو تینوں انبیاء کو قتل کرنے کی دھمکی مل رہی ہے اور یہ ''رجل'' صرف ''مرسلین'' کی اتباع کی ترغیب دیتا ہے اور ان کی رسالت پر دلیل بیان کرتا ہے، اس لیے سورۂ یٰسٓ میں اس ''رجل'' سے ''مومنِ آلِ فرعون'' مراد لینا بہر نوع درست نہیں۔

صحیح یہی ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یا اس کے رسول ﷺ نے یہ تعیین نہیں کی اور نہ ہی صحابہ سے کسی قابل اعتبار سند سے اس کا ثبوت ہے تو اس کی تعیین محض تکلف ہے۔

---

① روح المعاني: 208/22 ② القصص: 20 ③ المؤمن: 28

یہاں ﴿اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ﴾ کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان انبیائے کرام کی دعوت شہر میں پھیل گئی تھی اور انبیائے کرام نے ابلاغِ مبین سے ان پر حجت تمام کر دی تھی۔ اور جس کے نصیب میں ہدایت تھی اس نے بُعدِ مکانی کے باوجود ان کی دعوت کو قبول کیا بلکہ آگے بڑھ کر ان کے دفاع کی کوشش کی۔ لفظ ''رجل'' کو نکرہ ذکر کرنے میں اس آدمی کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا﴾ اس سلیم الفطرت اور حق پرست مردِ مومن نے کہا: اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ یعنی اس مردِ مومن نے ''مرسلین'' کہہ کر اپنے ایمان کا اظہار کیا اور ''یاقوم'' کہہ کر بڑی شفقت سے انھیں رسولوں کی پیروی کی ترغیب دی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ''مومنِ آلِ فرعون'' نے تو کہا تھا:

﴿يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِیْ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ﴾ ①

''اے میری قوم! میرے پیچھے چلو میں تمھیں بھلائی کا راستہ بتاؤں گا۔''

جب کہ اس مردِ مومن نے رسولوں کی پیروی کا کہا تھا۔ دونوں کی دعوت کا یہ فرق بھی بجائے خود اس فکر کی تصدیق کر رہا ہے کہ یہ مردِ مومن ''مومنِ آلِ فرعون'' نہیں تھا۔

﴿اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا﴾ یہ ان رسولوں کی پیروی کے حق میں اور ان کی صداقت میں دو دلیلیں ہیں:

1: ایک ان کی سیرت و کردار کہ اس دعوت میں ان رسولوں کا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ وہ تم سے کسی اجر کا اور کسی سیادت و ریاست کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ وہ محض اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے یہ ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں، اور اس راہ میں تمام دکھ درد خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں۔ یہاں بھی ان کی جس خصوصیت کا ذکر ہے وہ یہی ہے جو جا بجا قرآن مجید میں انبیائے کرام کے حوالے سے بیان ہوئی ہے کہ ﴿لَا

---

① المؤمن:38

أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ ''میں اس دعوت پر تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔''
''مردِ حق'' کا رسولوں کو اس وصف سے متصف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تینوں رسول تھے۔ یوں نہیں کہ تیسرے کا بطور رسول ذکر تغلیباً ہوا ہے۔

2: ﴿وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ دوسری دلیل یہ کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ انھی کی راہ راہِ حق ہے اور ان کی دعوت دلیل و برہان پر مبنی ہے، لہٰذا جب ان کا اَخلاق و کردار درست ہے اور ان کی دعوت میں کوئی خودغرضی اور لالچ بھی نہیں اور وہ راہِ ہدایت پر بھی ہیں تو ایسے بے لوث بزرگوں کی اتباع کرنی چاہیے۔

یہ دونوں دلیلیں اس بات کی مُشعِر ہیں کہ وہ مردِ حق ان رسولوں کے احوال اور ان کی دعوت سے پوری طرح آگاہ تھا مگر اپنے ایمان کے اظہار سے پہلے اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور رسولوں کی اتباع کا مشورہ دیا کیونکہ وہ دوڑتا ہوا نصیحت کے لیے آیا تھا اور رسولوں کی مخالفت کی بجائے ان کی اتباع اس کا اصل مقصود تھا۔

﴿وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝﴾ [يٰسٓ:22-25]

''اور مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اس کے سوا ایسے معبود بنا لوں کہ اگر رحمان میرے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے بچائیں گے۔ یقیناً میں تو اس وقت ضرور کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ بے شک میں تمھارے رب پر ایمان لایا ہوں، سو مجھ سے سنو۔''

اس مردِ مومن کی دعوت اور رسولوں کی ہمنوائی کا سن کر کفار کو تعجب ہوا کہ یہ ان کا ہمنوا کہاں سے نکل آیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس سے پوچھا: کیا تم ان رسولوں کے دین پر ہو؟ تو ان کے جواب میں مردِ مومن نے فرمایا: میں اس کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے، عدم سے وجود بخشا ہے، یعنی جب پروردگار وہی ہے کوئی دوسرا نہیں تو عقل وفکر کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے۔ اللہ کے علاوہ باقی سب مفطور ومخلوق ہیں۔ مخلوق کو چاہیے کہ وہ اپنے خالق کی پرستار اور عبادت گزار بنے، نہ کہ مخلوق کی ۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو خالق ہے وہی مستحق عبادت ہے۔ قرآنِ مجید کی ابتدا میں مومن، کافر اور منافق کے عقیدہ وطرزِ عمل کی وضاحت کے بعد جو پہلی دعوت ہے وہ اسی حوالے سے ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ①

① البقرۃ:21

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔''

یہی مضمون قرآنِ مجید میں کئی بار آیا ہے کہ عبادت اس کی جس نے پیدا کیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کی جاتی ہے ان کے بارے میں یہ وضاحت بار بار بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے کوئی چیز پیدا نہیں کی، چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝﴾ ①

''اور انھوں نے اس کے سوا کئی اور معبود بنا لیے جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، اور اپنے لیے نہ کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ ②

''یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہے تو پیدائش ان پر گڈ مڈ ہو گئی ہے؟ کہہ دے اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ایک ہے، نہایت زبردست ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور زمین میں حیوانات کو پیدا کرنے، بارش اور اس کے ذریعے طرح طرح کی کھیتیوں کو اُگانے کا ذکر کر کے فرمایا ہے:

﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ ③

---

① الفرقان:3 ② الرعد:16 ③ لقمان:11

’’یہ ہے اللہ کی مخلوق، تو تم مجھے دکھاؤ کہ ان لوگوں نے، جو اس کے سوا ہیں، کیا پیدا کیا ہے؟ بلکہ ظالم لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔‘‘

تقریباً یہی بات سورۂ فاطر میں کہی گئی ہے۔ ①

یہاں بھی اس مردِ مومن کا یہی کہنا ہے مجھے کیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے؟ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، اس لیے کہ یوں کہنے کا نتیجہ اوّل وہلہ میں یہ ہے کہ انھیں گمراہ اور خطا کار قرار دیا جائے، پھر انھیں کہا جائے کہ تم اللہ کی عبادت کیوں نہیں کرتے جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی گمراہی کا سن کر مخاطبین اشتعال میں آ جاتے ہیں اور مخالفت پر اُتر آتے ہیں اور کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ اس لیے اس مردِ مومن نے حکیمانہ اسلوب اختیار کیا کہ اس نے نصیحت کے طور پر اپنے آپ کو مخاطب بنایا مگر مقصود قوم کو نصیحت کرنا اور ایک حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ لیکن اس قول کو اگر قوم کے سوال کا جواب قرار دیا جائے جیسا کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے تو پھر اس توجیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

﴿وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ یہاں ”إليه أرجع“ (اسی کی طرف مجھے لوٹنا ہے) نہیں کہا بلکہ فرمایا: ﴿إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ ’’کہ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔‘‘ اس لیے کہ یہ بطورِ تنبیہ وتہدید فرمایا ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا ہے اس نے پیدا کر کے آزاد نہیں چھوڑا، اس نے سب کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ رب کی بندگی آج تمھیں ناگوار گزر رہی ہے۔ ایک دن آنے والا ہے کہ اسی کے حضور تمھیں حاضر ہونا ہے۔ اس روز یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اللہ کے علاوہ جن کی تم عبادت کرتے ہو اُن کی پوزیشن کیا ہے اس روز تمھیں تمھارے شرک وکفر کا نتیجہ بھی مل جائے گا۔

---

① فاطر:3

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں بھی حسب طبع عجیب بات فرمائی ہے کہ ﴿اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ﴾ میں خوف کے ساتھ ساتھ رجا اور امید کا پہلو بھی ہے۔ کیونکہ جس کے ہاں پہنچنا ہے اس سے خوف بھی ہے اور اس سے امید بھی وابستہ ہے۔ اس کا لطیف پہلو یہ ہے کہ عبادت گزار کی تین نوعیتیں ہیں:

1: وہ اللہ کی اس لیے عبادت کرتا ہے کہ وہ معبود ہے یا مالک ہے۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ عبادت کے نتیجے میں اسے کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ جیسے غلام ہے، اس پر اپنے مالک کی خدمت واجب ہے، خواہ اُسے کچھ ملے یا نہ ملے۔

2: وہ عبادت اس لیے کرتا ہے کہ اللہ کے اس پر بے شمار انعامات ہیں۔

3: وہ عبادت اللہ کے عذاب سے خوف اور ڈر سے کرتا ہے۔

اس مردِ مومن نے پہلی قسم کے عبادت گزاروں میں ہونے کا تأثر دیا کہ میں اللہ کی اس لیے عبادت کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پیدا کیا ہے، عدم سے وجود بخشا ہے، وہ میرا مالک ہے، اس لیے اس نے کہا:

﴿وَمَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ﴾

مگر منکرینِ رسل کے بارے ﴿والیه ترجعون﴾ کہہ کر انھیں خوف دلایا کہ تم بھی اس سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت پر اُمید کے سہارے عبادت کرو، اس کی تم عبادت کیوں نہیں کرتے؟

﴿ءَ اَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً﴾ اس آیت میں پہلی بات کی مزید وضاحت ہے کہ جس اللہ نے مجھے پیدا کیا، کیا میں اُس کے سوا اور معبود بنا لوں؟ میں اللہ کے سوا کسی کو ہرگز معبود نہیں بناؤں گا کیوں کہ عبادت کا حق دار تو وہ ہے جس نے پیدا کیا ہے، عدم سے وجود بخشا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں لہٰذا دوسرا کوئی عبادت کا حق دار ہی نہیں۔ یہاں "الھة" جمع کا لفظ استعمال کیا ہے، "إلٰـهًا" مفرد نہیں، کیوں کہ اگر غیر خالق کو الٰہ و معبود تسلیم کیا جائے تو اللہ کے سوا ہزاروں معبودوں کی پرستش لازم آتی ہے۔ مگر جب میرا الٰہ میرا

خالق ہی ہے تو پھر اس کے سوا کوئی بھی مستحق عبادت نہیں ہے۔

﴿اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ﴾ پھر وہ معبود بھی ایسے بے بس کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو نہ ان کی سفارش میرے لیے کچھ سودمند ہوسکتی ہے اور نہ ہی بذات خود کسی اختیار کے مالک ہیں کہ وہ مجھے اللہ کی پکڑ سے چھڑا لیں۔

﴿لَا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ﴾ اس میں دراصل ان کی شفاعت کے نافع ہونے کی نفی نہیں بلکہ ان کے ''شفیع'' ہونے کی ہی نفی ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں شفاعت کا اختیار نہیں۔ بالفرض ان کی شفاعت ہو بھی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

اللہ کے سوا ان معبودوں کے بارے میں جن دو حقیقتوں کا ذکر ہوا ہے قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۝﴾ ①

''کہہ تو کیا تم نے دیکھا کہ وہ ہستیاں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو کیا وہ اس کے نقصان کو ہٹانے والی ہیں؟ یا وہ مجھ پر کوئی مہربانی کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روکنے والی ہیں؟ کہہ دے: مجھے اللہ ہی کافی ہے، اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِیْلًا۝﴾ ②

---

① الزمر:38 ② الإسراء:56

”کہہ: پکارو اُن کو جنھیں تم نے اس کے سوا (معبود) گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔“

یہی بات سورۂ سبا ① اور یونس ② میں بھی بیان ہوئی ہے۔ شفاعت کے بارے میں بھی فرمایا:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ ③

”اور وہ اللہ کے سوا اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں، اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے: کیا تم اللہ کو اُس چیز کی خبر دیتے ہو جسے (گویا) وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔“

فرشتوں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ ④

”اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے۔“

شفاعت تو کجا بلا اجازت وہ بول بھی نہیں سکیں گے:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ ⑤

---

① سبا: 22 ② یونس: 106

③ یونس: 18 ④ النجم: 26 ⑤ النبا: 38

"جس دن روح (جبرائیل) اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، وہ کلام نہیں کریں گے مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔"

بلکہ علی الاطلاق فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ ①

"کون ہے وہ جو اُس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے!"

گناہ گار مومنوں کی شفاعت مومن کریں گے مگر وہ بھی تبھی جب انھیں شفاعت کی اجازت ہوگی۔ سیّد الشفعاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی تبھی شفاعت کریں گے جب آپ ﷺ کو شفاعت کی اجازت ملے گی:

((فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰی رَبِّي فَیُؤْذَنُ لِي))

"میں اجازت طلب کروں گا تو مجھے اجازت دی جائے گی۔"

پھر آپ ﷺ عرشِ الٰہی کے نیچے سجدے میں اللہ کی تسبیح وتحمید بیان کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

اے محمد ﷺ سر اٹھاؤ، کہو، تمھاری بات سنی جائے گی۔ مانگو، جو مانگو گے دیا جائے گا۔ سفارش کرو، تمھاری سفارش قبول ہوگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"میں امت کی شفاعت کروں گا، ((فَیَحُدُّ لِي حَدًّا فَأُخْرِجُ فَأُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ)) "میرے لیے حد مقرر کی جائے گی تو میں اس کے مطابق جہنم سے نکال کر جنت میں لے جاؤں گا۔" یوں کئی بار ہوگا حتی کہ میری امت کا وہی بدنصیب جہنم میں باقی رہے گا جسے قرآن نے روک لیا۔ ②

قرآن نے جن کو روکنا ہے وہ کفار ومشرکین ہیں جن کے بارے میں قرآن ہی میں ہے کہ ان پر جنت حرام ہے۔ ③

---

① البقرۃ:255 ② بخاری:7440 ومسلم ③ المائدۃ:72

اللہ تعالیٰ جس گناہ گار مسلمان کو چاہے گا معاف کر دے گا مگر مشرک کو معاف نہیں کرے گا۔ انبیائے کرام، فرشتے اور صلحائے اُمت کے علاوہ قرآن، روزہ اور بعض دیگر اعمال بھی شفاعت کریں گے۔ مگر یہ شفاعت دنیا کے شفعاء وسفارشیوں کی طرح عام نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا شفاعت کی اجازت دے گا۔ اور وہ بھی انھی کی سفارش کریں گے جن کے بارے میں انھیں شفاعت کی اجازت ہوگی۔

شفاعت کبریٰ میں بھی آپ ﷺ کی تکریم و تعظیم مقصود ہے اور دیگر سفارش کرنے والوں کی بھی دراصل تکریم ہی مقصود ہے۔ یہ سب اس لیے کہ اس دن کا مالک وہی ہے:

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ ①

''اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔''

یہاں دو باتیں مزید غور طلب ہیں جن کی طرف امام رازی رحمہ اللہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ پہلی یہ کہ یہاں سورۂ یٰسٓ میں ﴿اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ﴾ فرمایا ہے، جب کہ سورۃ الزمر ② میں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، ﴿اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ﴾ فرمایا ہے۔ یعنی ایک جگہ ''الرحمٰن'' کی نسبت سے یہ بات ہے جب کہ دوسری جگہ ''اللہ'' کی نسبت سے یہی بات فرمائی گئی ہے۔ یہ اس لیے کہ سورۃ الزمر کی آیت میں اللہ کی عظمت اور ہیبت کا بیان مقصود ہے۔ وہاں اللہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ﴾ ③

''کیا اللہ سب پر غالب انتقام لینے والا نہیں ہے!''

پھر فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کو بنانے والا اللہ ہے۔ اسی تناظر میں وہاں ''اللہ'' ہی کی نسبت سے یہ بات فرمائی گئی ہے کیوں کہ اس اسم مبارک میں عظمت وہیبت کا بیان ہے جب کہ ''الرحمٰن'' میں رافت ورحمت کا بیان ہے۔ اور یہاں صفت ''فاطر'' کے

---

① الانفطار:19 ② الزمر:38 ③ الزمر:37

تناظر میں اس اسم مبارک کے حوالے سے یہ بات فرمائی گئی ہے کیوں کہ "فاطر" یعنی پیدا کرنا عدم سے وجود بخشنا اس کی رحمت کا ہی نتیجہ ہے۔ اور یہ دونوں نام اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہیں، چنانچہ فرمایا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ①

"کہہ دے: اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، تم جس کو پکارو گے سو یہ بہترین نام اسی کے ہیں۔"

دوسری بات یہ کہ اس آیت میں بتلا دیا گیا ہے کہ بہر نوع اللہ ہی عبادت کے لائق ہے کیوں کہ وہی "فاطر" و مالک ہے۔ اس کا کوئی انعام واحسان نہ ہو تب بھی وہی معبود ہے، اس لیے کہ مخلوق اور غلام کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی ہی بندگی کرے اور اگر اس کے انعام واحسان پر آئیں تو وہ "رحمٰن" ہے۔ اس سے بڑھ کر منعم و محسن اور کون ہے۔ اور اگر خوف و ڈر کے پہلو سے دیکھیں تو بھی مصائب سے بچانے والا وہی ہے اور نجات دینے والا بھی وہی ہے، جب کہ اللہ کے سوا کوئی مصائب سے بچانے والا نہیں، تو اللہ کے سوا کوئی معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مصائب و مشکلات سے نجات دہندہ تب ہو سکتا ہے جب اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ اور جب اللہ کی طرف سے مدد کا فیصلہ ہو جائے تو کسی اور کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

﴿اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ﴾ اگر میں خالق کے علاوہ کسی اور کو معبود بنالوں جو نہ مجھے تکلیف سے نجات دینے پر قادر ہے اور نہ ہی اس کی سفارش میرے کچھ کام آ سکتی ہے تو یہ میری کھلی گمراہی ہوگی جو میری بربادی کا باعث بنے گی۔

﴿اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ وعظ و تلقین کے بعد اُس مردِ حق نے برملا اپنے ایمان کا بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ میری بات کان لگا کر سن لو! میں تمھارے ربّ پر ایمان لے آیا ہوں۔ یعنی جیسے وہ میرا ربّ ہے اسی طرح وہ تمھارا بھی ربّ ہے۔ میں نے اسے اپنا

---

① الاسراء:110

ربّ تسلیم کر کے کوئی غلطی نہیں کی، غلطی تو تمھاری ہے کہ تم اس پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کی بجائے ان کو معبود بنا لیا ہے جو نہ تمھیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی پکڑ سے بچا سکتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی تاویل وتعبیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ ایمان کا یہ اظہار اُس نے رسولوں کے سامنے انھیں اپنے ایمان پر گواہ بنانے کے لیے کیا کہ میں تمھارے ربّ پر ایمان لے آیا ہوں اور تمھاری تابع داری کا اعتراف کرتا ہوں، مجھ سے میرے ایمان کا اعلان سن لو تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ہاں میرے ایمان کی گواہی دے سکو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ قول معناً زیادہ واضح ہے بلکہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس تاویل کا انتساب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف کیا ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ وغیرہ کا مختار قول بھی یہی ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جوں ہی اس نے ایمان کا اعلان کیا پوری قوم اس پر اٹھ پڑی، پتھر مار مار کے اسے شہید کر دیا اور وہ آخر دم تک کہتا رہا:

«اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.»

"اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔"

ایمان کا یہ اظہار کفار کو مخاطب کر کے کیا ہو یا رسولوں کو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حق کا علم بردار کتنا بے باک اور نڈر ہوتا ہے۔ ساری قوم ایک طرف، ان کے لیڈر ایک طرف بلکہ ان کے مذہبی پیشوا ایک طرف، اس بھڑکتے ماحول میں ایک مردِ مومن بلند آواز سے کہتا ہے: ﴿اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ﴾ سب سن لو! میں تمھارے ربّ پر ایمان لایا ہوں۔ یہی ماحول مکہ مکرمہ میں تھا جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ، اللہ اللہ پکارتے تھے۔ یہ داستان سنا کر دراصل اہل مکہ کو ہی خبردار کیا جا رہا ہے۔

﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ۝﴾ [يٰسٓ: 27،26]

''اسے کہا گیا: جنت میں داخل ہو جا، اس نے کہا: اے کاش! میری قوم جان لے اس بات کو کہ میرے ربّ نے مجھے بخش دیا اور مجھے معزز لوگوں میں سے بنا دیا۔''

جب اس مردِ مومن کو شہید کر دیا گیا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اسے یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ جیسے شہید کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝﴾ ①

''اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے ربّ کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔''

شہید کی یہ زندگی کیسی ہے، اس کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝﴾ ②

''اور ان کو جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جائیں، مردے مت کہو، بلکہ زندہ ہیں اور لیکن تم نہیں سمجھتے۔''

احادیث میں ہے کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے اجواف میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرش کے نیچے قندیلوں کے ساتھ آویزاں رہتی ہیں۔

---

① آلِ عمران: 169 ② البقرۃ: 154

بعض نے یہ مفہوم بھی لیا ہے کہ اس سے مراد جنت کی بشارت دینا ہے کہ تمھارا مقام جنت میں متعین ہو چکا ہے جو تمھیں حشر ونشر کے بعد حاصل ہوگا۔ ①

﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ﴾ جب اس نے جنت کا نظارہ کیا تو وہ پکار اٹھا: کاش میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ میرے ربّ نے مجھے بخش دیا ہے۔ اور انھیں یہ راز معلوم ہو جائے کہ یہ تمام تر ثمرہ ایمان اور اتباعِ مرسلین کا نتیجہ ہے تا کہ وہ بھی ایمان لا کر جنت کی مستحق بن جائے۔

اس مردِ مومن کے اخلاص کا اندازہ کیجیے کہ شہید ہو جانے کے بعد بھی اس نے اپنی قوم کے حق میں بددعا یا ان کے خلاف کسی غصے کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی خیر خواہی چاہتے ہوئے یہی کہا کہ کاش! میرے انجامِ خیر کا علم میری قوم کو ہو جائے۔ انھوں نے میری زندگی میں میرے وعظ وتلقین سے کوئی سبق نہیں لیا تو میری موت کے بعد ہی میرے احوال معلوم ہونے سے سبق حاصل کرلیں۔ وہ ظالموں کے لیے ان کے ہاتھوں مرنے کے بعد بھی جنت کی راہ سوچتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«نصح قومه في حياته وبعد مماته.» ②

”اس نے زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مرنے کے بعد بھی۔“

﴿بِمَا غَفَرَلِيْ﴾ کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ترجمے میں نقل ہوئے ہیں، اس میں ”ما“ کو مصدری معنی میں لیا گیا ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہیں: ”کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ کس چیز کی بدولت میرے ربّ نے مجھے بخش دیا ہے؟“ یہ ترجمہ ”ما“ کے استفہامیہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ درست نہیں کیوں کہ ”ما“ استفہامیہ ہوتا تو (الف کے حذف کے ساتھ) ”بم“ ہوتا، یہی بات امام کسائی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ مگر کلامِ عرب میں یہ ”بما“ (الف کے ساتھ) استفہام کے معنی میں بھی

---

① قرطبی ② ابن کثیر

استعمال ہوا ہے۔ ①

صاحب ِ یٰسٓ نے وعظ و تلقین اور اپنی قوم کی خیر خواہی کی جو مثال قائم کی اس کی نظیر حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں بھی ملتی ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں قوم کو اسلام کی دعوت دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے خطرہ ہے کہ کہیں وہ تمھیں قتل نہ کر دیں۔'' حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ اس بات کا احتمال نہیں۔ انھیں مجھ سے اتنی الفت ہے کہ میں سویا ہوا ہوں تو وہ مجھے جگائیں گے بھی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھا تو پھر چلے جاؤ۔''

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ قوم کے پاس گئے۔ جب وہ لات اور عزیٰ کے پاس سے گزرے تو فرمایا: میں صبح تم سے نمٹوں گا۔ یہ سن کر ثقیف غضب ناک ہو گئے۔ حضرت عروہؓ نے فرمایا: اے میری قوم! یہ لات اور عزیٰ کوئی شے نہیں، اسلام لے آؤ، تمھیں سلامتی ملے گی۔ اے میرے بھائی بندو! لات و عزیٰ کچھ بھی نہیں ہیں، اسلام لے آؤ تمھیں سلامتی ملے گی۔ یہ دعوت انھوں نے تین بار دی۔ ایک بدنصیب نے تیر مارا جوان کی رگِ اکحل پر لگا اور وہ شہید ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ویسا ہی تھا جیسا صاحب ِ یٰسٓ تھا جس نے کہا تھا:

﴿قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ○ ﴾ ②

حبیب بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مسیلمہ کذاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ وہ اللہ کے رسول ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: بالکل وہ اللہ کے رسول ہیں۔ مسیلمہ نے کہا: کیا تم میری نسبت بھی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول

---

① فتح القدير

② ابن كثير، طبراني: 148,147/17، مجمع الزوائد: 286/9، دلائل النبوة للبيهقي: 299/5 وغيره

ہوں؟ انھوں نے فرمایا: میں نہیں سنتا تم کیا کہتے ہو۔ مسیلمہ کذاب بولا: ان کی نسبت تم سن لیتے ہو اور میری نسبت پر بہرے بن جاتے ہو۔ حضرت حبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، ایسے ہی ہے۔ اس پر اس نے ان کا ایک ایک عضو کٹوایا۔ ہر عضو کاٹنے کے بعد پھر یہی پوچھتا تو وہی جواب پاتا۔ یوں ان کے جسم کا ایک ایک جوڑ کٹوایا تا آنکہ وہ اس کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ کعب الاحبار سے جب یہ واقعہ بیان کیا اور انھیں بتلایا گیا کہ اس صحابی کا نام حبیب تھا تو انھوں نے فرمایا: صاحبِ یٰسٓ کا نام بھی حبیب تھا۔ ①

مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے ہے کہ مردِ مومن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کو شہید کیے جانے کے بعد نہیں بلکہ اس کی ہجرت یا اس کی وفات کے وقت بطور بشارت تھا۔ اور یہ تکلف انھوں نے صرف اس بنا پر کیا ہے کہ سورۃ المومن ② میں صراحت ہے کہ مومن آلِ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون کی سازشوں سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ سورۂ یٰسٓ کے مردِ مومن کو مومن آلِ فرعون باور کرانا ہی بنیادی طور پر درست نہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ پھر یہاں دخولِ جنت کی بشارت ہی نہیں ﴿قِیۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّۃَ﴾ کے الفاظ ہیں جس کے معنی خود اصلاحی صاحب نے یہ کیے ہیں: ''ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔'' بلکہ یہ بھی فرمایا ہے:

> ''سیاق وسباق کی روشنی میں یہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے کہ اشرار نے ان کو شہید کر دیا اس وقت اسے یہ بشارت ملی۔''

لہٰذا جب سیاقِ کلام کا یہی تقاضا ہے تو پھر کسی قوی دلیل کے بغیر اسے ہجرت یا وفات کے وقت بشارت پر محمول کرنا قرین انصاف نہیں۔

حُسنِ خاتمہ کا عجیب واقعہ:

سورۂ یٰسٓ کی یہ آیات تو بندۂ مومن کے جنت میں چلے جانے کے بعد کی ہیں،

---

① ابن کثیر ② المؤمن: 45،44

جب اُسے جنت میں جانے کا حکم مل گیا تو اُس نے کہا:

﴿ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ ﴾ ①

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسی نوعیت کا ایک عجیب واقعہ امام ابوالوقت عبدالاول السجزیؒ الہروی المتوفیٰ 553ھ) کے بارے میں ذکر کیا ہے جنھیں انھوں نے "الشیخ، الإمام، الزاهد، شيخ الاسلام، مسند الافاق" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کے حلقۂ تلمذ میں امام ابن عساکرؒ، علامہ ابن جوزیؒ اور علامہ سمعانیؒ جیسے اعیان شامل ہیں۔ خود اُن کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن عبدالرحمٰن بن محمد داودیؒ سے صحیح بخاری کے سماع کے لیے میں اپنے والد گرامی امام عیسیٰ بن شعیبؒ کے ہمراہ "بوشنج" جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ میری عمر دس سال سے کم تھی۔ میرے والد نے میرے ہاتھوں میں دو پتھر تھما دیے، میں ان کے خوف سے انھیں اٹھائے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً میری طرف دیکھتے تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ میں تھک گیا ہوں تو انھوں نے فرمایا: ایک پتھر پھینک دو، میں نے ایک پتھر پھینک دیا۔ پھر ہم چلتے رہے تا آنکہ میں تھک گیا تو انھوں نے فرمایا: کیا تھک گئے ہو؟ میں نے ڈرتے ہوئے کہہ دیا: نہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ پھر تم آہستہ کیوں چل رہے ہو؟ میں کچھ دیر تیزی سے ان کے ساتھ چلا اور مزید تھک گیا تو انھوں نے دوسرا پتھر مجھ سے لے کر پھینک دیا۔ پھر چل پڑے۔ جب میں تھکن سے چور چور ہو گیا تو انھوں نے مجھے اٹھا لیا۔ راستے میں ایک قافلہ ملا، انھوں نے کہا: شیخ عیسیٰ! آپ یہ بچہ ہمیں دے دیں بلکہ آپ بھی ہمارے ساتھ سواری پر بیٹھ جائیں، ہم آپ کو "بوشنج" پہنچا دیں گے مگر والد صاحب نے فرمایا:

---

① یٰسٓ: 27,26

«"معاذ الله أن نركب في طلب أحاديث رسول الله ﷺ بل نمشي."»

''اللہ کی پناہ کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی طلب میں سوار ہو جائیں۔''

یہ تھک جائے گا تو میں حدیثِ رسول کی تکریم اور ثواب کے لیے اسے کندھے پر بٹھا لوں گا۔ میرے والد صاحب کی حُسنِ نیت کا نتیجہ ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ کتبِ حدیث کے سماع کی نعمت حاصل ہوئی۔ میرے اقران میں کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ تمام امصار سے لوگ اب میرے پاس سماع کے لیے آتے ہیں۔

امام عبدالاول کے تلمیذ عبدالباقی الہرویؒ کا بیان ہے کہ امام صاحب بیمار ہو گئے۔ ایک دن وہ میرے سینے کا سہارا لیے لیٹے ہوئے تھے اور مسلسل اللہ کے ذکر میں مشغول تھے۔ محمد بن قاسمؒ آئے تو انھوں نے کہا:

يا سيّدي! قال النّبي ﷺ: ((من كان آخر كلامه لا إلٰه إلا الله دخل الجنّة.))

''اے میرے سردار! نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: جس کا آخری کلام لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ہوگا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

انھوں نے اپنی آنکھ کھولی اور پڑھا:

﴿ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ ﴾ ①

محمد بن قاسم اور سب حاضرین حیران ہو گئے، پھر اُنھوں نے سورۂ یٰسٓ مکمل کی، تین بار اللہ، اللہ، اللہ کہا اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ ②

---

① یٰسٓ: 27,26

② سير أعلام النبلاء: 309/20

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ہی ذکر کیا ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بوقت وفات اپنے اہل خانہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: کمرے سے نکل جاؤ۔ اہل خانہ کمرے سے باہر دروازے کے قریب بیٹھ گئے تو انھوں نے سنا کہ حضرت عمر رحمہ اللہ فرما رہے ہیں:

«مرحبا بهذه الوجوه.»

''ان آنے والے چہروں کو مرحبا!''

پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ۝﴾ ①

پھر آواز رک گئی، افراد خانہ اندر داخل ہوئے تو وہ فوت ہو چکے تھے۔ ②

امام ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رازی رحمہ اللہ کا شمار کبار محدثین میں ہوتا ہے۔ مرض الموت میں ان کے پاس امام ابوحاتم، ابن وارہ اور منذر بن شاذان رحمہم اللہ وغیرہ تھے۔ انھوں نے کلمے کی تلقین کرنا چاہی لیکن وہ امام ابوزرعہ رحمہ اللہ کی عظمت کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکے۔ بالآخر انھیں ایک ترکیب سوجھی کہ وہ اس حدیث کا ذکر کریں، چنانچہ امام ابن وارۃ رحمہ اللہ نے کہا:

«حدثنا أبو عاصم حدثنا عبدالحميد بن جعفر عن صالح.»

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ پھر امام ابوحاتم رحمہ اللہ نے فرمایا:

«حدثنا بندار حدثنا أبو عاصم عن عبد الحميد بن جعفر عن صالح.»

اور وہ بھی خاموش ہو گئے۔ امام ابوزرعہ رحمہ اللہ فرمانے لگے:

«حدثنا بندار حدثنا أبو عاصم عن عبد الحميد بن جعفر

---

① القصص 83:28 ② سیر أعلام النبلاء: 142/5

عن صالح عن كثير بن مرة عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((من كان آخر كلامه لا إله إلا الله، دخل الجنة.)) ومات رحمه الله.»»①

گویا انھوں نے مکمل حدیث مع سند پڑھی اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے مرض الموت میں جو نصیحتیں کیں وہ ''فتوح الغیب'' کے آخر میں قابلِ مراجعت ہیں۔ انھی میں یہ بھی مذکور ہے کہ آخری وقت میں وہ فرمانے لگے:

''میرے پاس سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمھارے ساتھ ہوں لیکن باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں۔ میرے پاس تمھارے سوا اور لوگ حاضر ہیں، ان کے لیے جگہ خالی کر دو اور ان کے ساتھ ادب کرو، یہاں بڑی رحمت کا نزول ہے، ان کے لیے جگہ تنگ نہ کرو، تم پر سلام اور برکت ہو..... الخ'' ②

اللہ والوں کے اس نوعیت کے بہت سے واقعات ہیں۔ انسان کو فوت ہوتے وقت احساس ہو جاتا ہے کہ انجام کیا ہونے والا ہے، چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندۂ مومن جب دنیا سے آخرت کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے تو اُس کے پاس آسمان سے فرشتے سورج کی مانند روشن چہروں سے آتے ہیں، جنت کا کفن اور جنت کی خوشبو لیے ہوئے ہوتے ہیں اور نظر جہاں تک پہنچتی ہے اتنی دور بیٹھ جاتے ہیں۔ تا آنکہ ملک الموت علیہ السلام آتا ہے اور اس کے سر کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے:

«أيتها النفس الطيبة! أخرجي إلى مغفرة من الله ورضوان.»

''اے پاکیزہ روح! اللہ کی بخشش اور خوشنودی کی طرف نکلو۔''

---

① معرفة علوم الحديث، ص:76 ② فتوح الغيب

تو وہ جسم سے یوں نکلتی ہے جیسے مشکیزے سے پانی کا قطرہ نکلتا ہے۔

مگر کافر جب دنیا سے جا رہا ہوتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ کے (ڈراؤنے) چہرے والے فرشتے آتے ہیں اور حد نظر پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر ملک الموت علیہ السلام آتا ہے اور اس کے سر کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے:

««أيتها النفس الخبيثة! أخرجي إلى سخط من الله.»»

''او خبیث روح! اللہ کے عذاب کی طرف نکل۔''

تو روح جسم میں پھیل جاتی ہے۔ ملک الموت اس کی روح کو اس طرح کھینچتا ہے جیسے لوہے کی سیخ سے ترصوف کو کھینچا جاتا ہے۔ ①

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ٥ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ٥﴾ ②

''اور کاش تُو دیکھے جب فرشتے ان لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا، ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں اور (کہتے ہیں) جلنے کا عذاب چکھو۔ یہ اس کے بدلے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ یقیناً اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔''

لہٰذا انسان کو اس دنیا سے جاتے وقت احساس ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ بندۂ مومن کو بسا اوقات اس کے نطق و اظہار کی توفیق عطا فرما دی جاتی ہے، زبان سے ایمان و اسلام پر یقین و اعتراف کے کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

اللهم أحينا مسلما وأمتنا مسلما واحشرنا مع النبيين والصديقين و الشهداء والصالحين. آمين يا رب العالمين.

---

① أحمد:18534، أبو داود:4753 ② الأنفال:51،50

﴿وَمَا اَنزَلْنَا عَلٰی قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُندٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنزِلِيْنَ ۝ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ۝﴾ [یٰسٓ: 29,28]

''اور ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا اور نہ ہم اتارنے والے تھے۔ وہ نہیں تھی مگر ایک ہی چیخ، پس اچانک وہ بجھے ہوئے تھے۔''

ان دونوں آیات میں اس بستی والوں پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر ہے کہ مردِ مومن کو شہید کر دیے جانے کے بعد اس قوم کی تباہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر نازل نہیں کیا۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کا لشکر ہیں۔ انھی کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ ① تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ بھی فرمایا: ﴿وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ ② اور بے شک ہمارا لشکر، یقیناً وہی غالب آنے والے ہے۔ ان بے چاروں کی ہمارے نزدیک حیثیت ہی کیا تھی کہ ان کی بربادی کے لیے ہم فرشتوں کا لشکر اتارتے بلکہ کسی قوم کی تباہی کے لیے فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، ان کی تباہی کے لیے ہمارا ایک فرشتہ ہی کافی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انھیں تو اپنی قوت وطاقت پر ناز تھا اور اسی بنا پر وہ جوشِ انتقام کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مگر ہمارے فرشتے کی محض چیخ سے ان کا یہ خمار اُتر گیا اور وہ بھسم ہو کر رہ گئے۔

اور یہ اس لیے بھی کہ ان کی تباہی کے لیے فرشتوں کو اتارنے کا ہمارا کوئی فیصلہ نہیں تھا:

«أي ما صح في قضائنا وحكمتنا.»

بلکہ فیصلہ کچھ اور تھا کہ ایک فرشتے کی آواز سے ان کی تباہی مقدر ہے۔ ③

چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ جل شانہ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ انھوں نے شہر کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ایک ہیبت ناک چیخ لگائی جسے ان میں سے کوئی بھی

---

① المدثر:31 ② الصّٰفّٰت:173 ③ فتح القدیر

برداشت نہ کر پایا اور یوں ایک چیخ سے ہی وہ آناً فاناً موت کے منہ میں چلے گئے۔ ان کے اس انجام کو اللہ تعالیٰ نے "خامدون" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو "خمد" سے ہے۔ "خَمَدَتِ النَّارُ" کے معنی ہیں آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا۔ اسی سے بطورِ استعارہ "خَمَدَتِ الْحُمّٰی" کا محاورہ ہے جس کے معنی بخار کا جوش کم ہونے کے ہیں اور بطورِ کنایہ لفظ "خمود" موت کے معنی میں آتا ہے۔ ①

کیوں کہ اس سے بھی مرنے والے کی حرارت غریزی موقوف ہو جاتی ہے۔ سورۃ الانبیاء میں بعض قوموں کی تباہی کے ذکر میں بھی یہی لفظ آیا ہے:

﴿فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ﴾ ②

"تو ان کی پکار (کہ ہم ظالم تھے) ہمیشہ یہی رہی، یہاں تک کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے بجھے ہوئے بنا دیا۔"

جیسے فصل اور کھیتی کو تباہی کی غرض سے کاٹ دیا جاتا ہے، ویسے ہی ہم نے ان کو بھی کاٹ کر ان کی بستیوں کو برباد کر دیا۔ پھر ان کی کٹی اور گری پڑی لاشوں کی حرکت وحرارت بھی ٹھنڈی پڑ گئی، ان کا چیخنا چلانا، بھاگنا دوڑنا ختم ہو گیا ہے۔ اس قوم کا مقدر ہمارے نزدیک یہی تھا۔ اس سے غزوۂ بدر میں فرشتوں کے نزول کا اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ وہاں اپنے نبی کی ﷺ تکریم کے لیے فرشتوں کا نزول اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی بنا پر تھا۔

﴿فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ﴾ کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہلاکت سے دوچار ہونے والی بستی کو انطاکیہ قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ تورات کے بعد اس قسم کا عذاب کسی پر نہیں آیا، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

یہاں چند باتیں مزید غور طلب ہیں:

1: یہاں ﴿عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ﴾ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی تباہی مردِ حق کو شہید کرنے کے نتیجے میں ہوئی۔ اس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ رسول کے ساتھی رسول کے ترجمان ہوتے ہیں، اس لیے ان کی تکذیب

---

① مفردات ② الأنبياء:15

وتعذیب دراصل رسول کی تکذیب وتعذیب ہے۔ اور بسا اوقات اس کا وہی انجام اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن اللّٰہ تعالی قال: من عادی لي ولیا فقد آذنته بالحرب)) ①

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جو میرے دوست سے دشمنی رکھتا ہے میرا اُس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''

حضرت ابوہُبیرہ عائذ بن عمرو مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے حضرت سلمان، صہیب اور بلال رضی اللہ عنہم کے پاس چند افراد کی موجودگی میں آئے تو ان تینوں نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر کہا: اللہ کی قسم! اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں کی گردنوں سے اپنا حق وصول نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم یہ بات قریش کے بزرگ اور سردار کے متعلق کہہ رہے ہو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ذکر کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا أبا بکر! لَعَلَّكَ أغضبتهم؟ لئن کنت أغضبتهم لقد أغضبت ربك.))

''اے ابوبکر! شاید تو نے ان کو ناراض کر دیا ہے؟ اگر (واقعی) تُو نے انھیں ناراض کر دیا تو تُو نے اپنے ربّ کو ناراض کر دیا۔''

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے اور کہا: بھائیو! کیا میں نے تمھیں ناراض کر دیا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں، اے ہمارے بھائی! اللہ تمھاری مغفرت فرمائے۔ ②

☆ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی اللہ کی ناراضی ہے۔

2: مردِ حق کے اس واقعہ سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد قیامت تک کا زمانہ بالکل عدم اور خاموشی کا زمانہ نہیں۔ انسان کا جسم موت سے دوچار ہو کر بکھر سکتا

---

① بخاري: 5602

② صحیح مسلم: باب فضائل سلمان وصهيب وبلال

ہے مگر اس کی روح زندہ رہتی ہے، جذبات واحساسات رکھتی ہے اور خوشی وغمی کو محسوس کرتی ہے۔ گویا ان آیات سے حیاتِ برزخی کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر احساسات کا شعور ہی نہ ہو تو اس مردِ حق کا اپنی قوم کے بارے میں اس تمنا کا اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا کہ کاش! وہ میرے انجامِ خیر سے آگاہ ہو جائیں۔ اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ فوت ہو جانے کے بعد میت اس دنیا میں نہیں آتی جاتی، اس کا اس دنیا سے علاقہ منقطع ہو جاتا ہے۔

3: اس واقعہ کی ابتدا میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس کے تناظر میں دراصل اہل مکہ کو خبردار کرنا مقصود ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی تمھاری تمام تر ستم ظریفیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود تمھارے اسی طرح سچے خیر خواہ ہیں جس طرح یہ رسول اور ان کا ہم نوا مردِ مومن۔ اگر تم نے ہمارے رسول اور ان کے ساتھیوں کے اخلاص کی کوئی پروانہ کی تو تمھارا بھی وہی انجام ہوگا جو اُن رسولوں اور مردِ مومن کی تکذیب وتعذیب کرنے والوں کا ہوا تھا۔

4: اس قصے کا ایک اہم پہلو داعی اور مدعو کے ایک دوسرے کے بارے میں احساسات کا ہے کہ رسولوں کی دعوت کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ (1) تم ہماری طرح کے انسان ہی تو ہو۔ (2) رحمٰن نے کچھ بھی نہیں اتارا، تم اس کے نام سے جھوٹ بولتے ہو۔ (3) تمھاری نحوست ہم پر پڑ رہی ہے۔ (4) تم اس دعوت سے باز نہ آئے تو ہم تمھیں سنگسار کر دیں گے۔

اس اشتعال انگیزی کے جواب میں ان رسولوں نے کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ فرمایا: (1) ہمارا ربّ جانتا ہے کہ ہم رسول ہیں، ہم نے فریضۂ رسالت ادا کیا ہے۔ تمھاری مرضی ہے تم مانو یا نہ مانو۔ (2) تمھاری نحوست تمھارے اعمال کا نتیجہ ہے، گویا جو فصل بو رہے ہو، وہی کاٹ رہے ہو۔ (3) ہم نے تو تمھاری خیر خواہی کی ہے، کیا اس کا بدلہ یہی ہے کہ تم ہمیں سنگسار کرنے پر اتر آئے ہو! یہ تمھاری سراسر زیادتی ہے۔

ایک طرف انکار اور اشتعال انگیزی کا مظاہرہ ہے، دوسری طرف ناصحانہ اور مشفقانہ

انداز ہے۔ان کی صاف دھمکیوں کے جواب میں بھی زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی وہ یہی کہ ﴿اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾ ''تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔'' کیا ہماری بے لوث خیر خواہی کا یہی صلہ ہے؟ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے بعد مردِ مومن کی نصیحت وتلقین کا ذکر ہے کہ یہ رسول تم سے کچھ مانگے بغیر تمھیں نصیحت کر رہے ہیں، انھیں کسی سیادت وقیادت سے بھی کوئی غرض نہیں۔ ایسے بے غرضوں کی بات کو سننا اور تسلیم کرنا چاہیے۔ پھر وہ جو کچھ کہتے ہیں، حق وہدایت کی بات کہتے ہیں۔ عبادت کا وہی حق دار ہے جو خالق ہے، ''میں اس خالق کی عبادت کیوں نہ کروں۔'' آخر تمھارا بھی تو وہی خالق ہے۔تم اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ کیا میں اس کی بجائے ان کی بندگی کروں جو نہ مجھے اللہ کی پکڑ سے چھڑا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی سفارش کسی کام آ سکتی ہے۔اس مشفقانہ تلقین کے باوجود قوم نے اسے شہید کر دیا تو کسی بد دعا کی بجائے اس کی زبان سے جو کلمہ نکلا، وہ یہی تھا:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.))

''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما۔ وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔''

حتی کہ جنت کے مشاہدے پر بھی اپنی ظالم قوم کے بارے میں یہی ارمان تھا کہ کاش! میری قوم کو علم ہو جائے کہ میرے ربّ نے مجھے کس کس انعام واِکرام سے نوازا ہے تاکہ انھیں میری موت سے ہی سبق حاصل ہو جائے اور وہ دولتِ ایمان سے سرفراز ہو جائیں۔ یہ ہے دعوت وارشاد کا حُسن اور اللہ کے بندوں سے خیر خواہی کا اسلوب جو ایک سچے داعی کے رگ وریشے میں رچا بسا ہوتا ہے۔ اور ایسی دعوت ہی صحیح نبوی دعوت ہے جس کی مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

❁❁❁

﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ○﴾ [یٰسٓ: 30-32]

''ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا رہا مگر وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا! ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے کہ بے شک وہ ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔ اور نہیں ہیں وہ سب مگر اکٹھے ہمارے پاس حاضر کیے جانے والے ہیں۔''

پہلی آیت کریمہ میں مکذبین کے انجام اور ان کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے۔ ''حسرۃً'' کے معنی افسوس اور غم کے ہیں۔ کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے پر پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے، اس پر انسان کفِ افسوس ملتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مکذبین یہ افسوس و ندامت قیامت کے روز کریں گے، یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ یہ حسرت قیامت کو اپنے آپ پر کریں گے بلکہ بعض قراءتوں میں یہ بھی ہے:

«یا حسرة العباد علی أنفسهم.»

جس سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے کہ وہ قیامت کو اپنے آپ پر افسوس کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہم نے کیوں رسولوں کی تکذیب کی اور کیوں اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی کی۔ دنیا میں جو رسول ہمارے پاس آیا، ہم اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ قرآنِ مجید میں اس کا ذکر ایک مقام پر یوں ہے:

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ

بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ○ ﴾ ①

''یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آ پہنچے گی، کہیں گے: ہائے ہمارا افسوس! اس پر جو ہم نے اس میں کوتاہی کی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ سن لو! بُرا ہے جو وہ بوجھ اٹھائیں گے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر یہ بات کہتے ہوئے کہ تمھاری طرف جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر عذاب آنے سے پہلے عمل کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ:

﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ﴾ ②

''(ایسا نہ ہو کہ) کوئی شخص کہے: ہائے افسوس! اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کی جناب میں کی اور بے شک میں تو مذاق کرنے والوں سے تھا۔''

قیامت کا دن'' یَوْمُ الْحَسْرَةِ ''''حسرت کا دن ہے۔'' ③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ معنی ''یا ویلا للعباد'' ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایسے بندوں کے لیے ہلاکت ہے۔

بعض نے کہا کہ یہ حسرت ملائکہ اور مومنین صادقین کی طرف سے مکذبین کے بارے میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حسرت ان رسولوں کی طرف سے ان مکذبین کے بارے میں تھی جنھوں نے مردِ حق کو شہید کر دیا تھا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حسرت کا اظہار اللہ جل شانہ کی طرف سے استعارۃً ومجازاً ہے معاملے کی اہمیت کی بنا پر کہ مکذبین نے اپنے لیے صراطِ مستقیم کی بجائے صراطِ جحیم کو پسند کیا ہے۔

---

① الأنعام:31 ② الزمر:56 ③ مریم:39

علامہ رازیؒ نے تو کہہ دیا ہے: ''حسرت'' کا لفظ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں اسی طرح سے ہے جیسے ضحک، نسیان، سخر، تعجب اور تمنی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

اگر اِس حسرت کا اظہار اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرار دیا جائے تو یہ کمال شفقت کے اظہار کے لیے محض انسانی محاورے کے طور پر ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ میرا بندہ جہنم کا ایندھن بنے، اسی لیے اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی رسول کا انکار کرکے جہنم کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کو کوئی ندامت اور افسوس نہیں، نہ کسی کے انکار سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہے۔

﴿مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ﴾ یہ حسرت کا سبب بیان ہوا ہے کہ جب بھی ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول آیا تو انھوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام امتوں نے اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ہے۔ یوں نہیں کہ کسی امت نے بحیثیت مجموعی یا ان کی اکثریت نے رسول کی دعوت کو قبول کیا ہو۔ نکرہ سیاق نفی میں ذکر ہو اور اس سے پہلے ''مِن'' کا اضافہ ہو تو وہ نکرہ عموم کا فائدہ دیتا ہے جیسے یہاں ﴿مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ﴾ ذکر ہوا ہے۔ قرآنِ مجید ہی میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، مثلاً ایک مقام پر ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ ①

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اُس کے خوش حال لوگوں نے کہا: بے شک ہم اس چیز کے جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، منکر ہیں۔''

لیکن اس عموم سے ایک امت فی الجملہ خاص ہے اور وہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ہے۔ جنھوں نے ابتداءً تو اُن کی تکذیب کی۔ حضرت یونس علیہ السلام انھیں عذاب سے ڈراتے

---

① سبا 34: نیز دیکھیے الاعراف: 95،94، الزخرف: 23، المومنون: 44

تھے مگر وہ ایک نہ سنتے، حضرت یونس علیہ السلام کے شہر نینویٰ کو چھوڑ دینے کے بعد جب عذاب کے آثار محسوس ہوئے تو پوری بستی تائب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ﴾ ①

"سو کوئی ایسی بستی کیوں نہ ہوئی جو ایمان لائی ہو، پھر اُس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، یونس کی قوم کے سوا۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم یونس علیہ السلام ایمان لے آئی تھی۔ صرف یہی ایک قوم مندرجہ بالا آیات کے عمومی حکم سے مستثنیٰ ہے۔

رسول کی تکذیب کو امام رازیؒ نے ایک مثال سے واضح کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: اسے یوں سمجھو کہ کسی شخص کے پاس بادشاہ آئے، وہ اسے بتلائے کہ میں بادشاہ ہوں اور اس سے کوئی معمولی چیز طلب کرے مگر وہ شخص اسے بادشاہ ماننے سے انکار کر دے اور طلب کی ہوئی چیز دینے سے بھی انکار کر دے۔ ایک مدت بعد اتفاقاً وہی شخص بادشاہ کے پاس جائے۔ بادشاہ تخت شاہی پر بیٹھا ہو اور وہ اس کے سامنے کھڑا ہو اور اسے پہچان رہا ہو کہ یہ تو وہی ہے جو مجھے ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ میں بادشاہ ہوں، اس نے معمولی چیز مجھ سے طلب کی تھی مگر میں نے اسے بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی مطلوبہ چیز بھی نہیں دی تھی تو اس وقت وہ کس قدر نادم و پشیمان ہوگا۔ اسی طرح اللہ کے رسول بہ منزلہ بادشاہ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو انھیں اپنا نمائندہ ہونے کا اعزاز بخشا ہے تو یہ اعزاز انھیں بادشاہ بننے سے بھی زیادہ معظم و مکرم بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ②

"کہہ دے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

---

① یونس:98 ② آل عمران:31

رسول دنیا میں تشریف لائے۔ انھوں نے لوگوں کو اپنا تعارف کرایا مگر ان کے پاس کوئی ظاہری عظمت نہ تھی، اس لیے لوگوں نے ان کی قدر و منزلت نہ پہچانی مگر قیامت کے دن ان کی عظمت ظاہر ہوگی۔ اللہ کے نزدیک ان کی عظمت و مرتبت کو وہ معلوم کریں گے اور خیال کریں گے کہ یہ رسول دنیا میں ایک اللہ کی عبادت کے معمولی کام کی دعوت دیتے تھے جس کا نفع ہمیں ہی حاصل ہونا تھا، جب کہ وہ اس دعوت پر کوئی اُجرت طلب نہیں کرتے تھے، تب انھیں سخت ندامت ہوگی کہ انھوں نے رسول سے رُوگردانی ہی نہیں کی بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا۔ اور اس کے درپے آزار ہوئے، اس کے استخفاف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی انھی حرکتوں کے نتیجے میں وہ کف افسوس ملیں گے۔

امام رازی رحمہ اللہ کی اس تمثیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت اور ندامت کا یہ اظہار منکرین قیامت کے دن کریں گے جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

﴿كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ وہ ان کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔ یہ ہے ان کفار کی ہلاکت و بربادی کا سبب کہ وہ رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ ①

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے اگلے لوگوں کے گروہوں میں رسول بھیجے۔ اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا تھا مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کفار مکہ کے اسی کردار کا ذکر یوں ہوا ہے:

﴿وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا﴾ ②

---

① الحجر:11،10 ② الفرقان:42،41

''اور جب وہ تجھے دیکھتے ہیں تو تجھے نہیں بناتے مگر مذاق، (کہتے ہیں) کیا یہی ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ بے شک یہ تو قریب تھا کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے گمراہ ہی کر دیتا، اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم ان پر جمے رہے۔''

یہی بات سورۃ الانبیاء ① میں بھی بیان ہوئی ہے۔ کفار اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام کا ہی نہیں، اللہ کی آیات واحکام کا بھی مذاق اڑاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کردار کے حاملین کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ۝﴾ ②

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا ان لوگوں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کفار کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ اور جب تم نماز کی طرف آواز دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔''

دین کا اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ دوستی کی ممانعت کو جس اسلوب میں بیان کیا گیا ہے وہ ایمان کے مدعیوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ان سے دوستی و محبت کا دم بھرنا چھوڑ دو۔ گویا دین و ایمان کا دعویٰ کرنا اور پھر دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں سے دوستی کا دم بھرنا باہم دو متضاد باتیں ہیں۔ دورِ حاضر میں تو دشمنانِ دین کی شقاوت کی انتہا ہو گئی ہے کہ وہ شعائر اسلام کا مذاق ہی نہیں اڑاتے بلکہ انھیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ، قرآنِ مجید اور بیت اللہ شریف کے بارے

---

① الانبیاء: 36 ② المائدۃ: 58,57

میں ان کے عزائم اور آئے دن ان کی توہین کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں مگر وائے افسوس کہ مسلمان حکمران عموماً انھی کا دم بھرتے اور انھی سے اپنی مودّت وقربت کا قولاً وعملاً اظہار کرتے ہیں۔ ان دشمنانِ دین سے دوستی تو کجا، اللہ تعالیٰ نے تو اس مجلس میں بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دی جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَیْکُمْ فِی الْکِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِهَا وَ یُسْتَهْزَاُ بِهَافَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖٓ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعَا﴾ ①

”اور بلاشبہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں، بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو، بے شک اللہ منافقوں اور کافروں، سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔“

سورۃ النساء مدنی سورت ہے اور اس میں جو یہ فرمایا ہے کہ ”تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے۔“ تو کتاب میں یہ حکم پہلے مکی سورۃ الانعام ② میں بیان ہوا ہے۔ ان آیات میں ایسی بیہودہ مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو۔ اگر انسان بطیب خاطر ایسی مجلس کی زینت بنتا ہے تو وہ بھی ﴿اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ ان کے گناہ میں برابر کا شریک ہے۔ برضا ورغبت وہاں بیٹھنا اس بات کا غماز ہے کہ وہ بھی اس کفر کو پسند کرتا ہے اور انھی کی طرح کا کافر ہے۔ اگر کوئی ان کے کفریہ قول وکردار پر راضی نہیں تب بھی ان کا ہم نشین بننا ان کی مجلس سجانے اور خاموش تماشائی بننے کے مترادف ہے اور ”من کثر

---

① النساء: 140 ② الانعام: 68

سواد قوم فھو منھم" ① ''جو کسی قوم کی کثرت کا باعث بنتا ہے وہ انھی میں سے ہے'' کا مصداق ہے۔

انبیائے کرام کا یا دین اسلام کا مذاق کفر ہے اور جہنم میں جلنے کا باعث ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا﴾ ②

''یہ ان کی جزا جہنم ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مذاق بنایا۔''

ایک اور مقام پر منافقوں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ ③

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے تو ضرور ہی کہیں گے ہم تو صرف شغل کی بات کر رہے تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دے: کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کر رہے تھے؟ بہانے مت بناؤ، بے شک تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔''

اللہ تعالیٰ کی تمام آیات کا مذاق اڑانا ہی کفر نہیں بلکہ ایک آیت کا مذاق اور دین اسلام کے ایک حکم کا مذاق اڑانا اور اسے ناپسند سمجھنا بھی کفر ہے۔ کفار کا یہ جرم بھی تھا کہ وہ احکامِ الٰہی کو ناپسند کرتے تھے:

---

① المقاصد الحسنة، ص:426 ② الكهف:106 ③ التوبة:66,65

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ﴾ ①

''یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔''

کسی مسلمان کے لیے اس کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ دین اسلام کے ایک حکم کا یا رسول اللہ ﷺ کا کسی پہلو سے مذاق اڑائے یا آپ کا استخفاف کرے، حتی کہ قاضی عیاض نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے جو شخص رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہہ کر عیب جوئی کرے کہ آپ ﷺ کی چادر میلی کچیلی تھی اسے قتل کیا جائے گا۔ ②

چہ جائیکہ کوئی رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں بدکلامی کا مرتکب ہو۔ اس بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول کر کے اس کی سزائے قتل موقوف نہیں کی جائے گی۔

کیوں کہ اس کا یہ جرم رسول اللہ ﷺ کے حق میں ہے۔ آپ کسی کو اپنا حق معاف کر دیں تو فبہا، ورنہ اسے قتل ہی کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کے اس حق کی معافی کا علم کسی کو نہیں اس لیے وہ مستوجب سزا ہے اور واجب القتل ہے۔

اسی طرح اسلام کے کسی حکم کا انکار و استخفاف موجب کفر ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ دین اسلام کے تمام احکام پر رضامندی کا اظہار و اعتراف کرے۔ پانچ نمازوں، زکاۃ، روزہ، حج کو فرض مانے اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے انھیں حرام سمجھے۔ اگر وہ کسی حرام کو حلال یا کسی فرض کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لیکن اگر کوئی حرام کو حرام سمجھتا ہے لیکن اس کا کبھی ارتکاب کر بیٹھتا ہے یا فرض کو فرض و لازم سمجھتا ہے مگر کوتاہی و کاہلی کی بنا پر چھوڑ دیتا ہے تو وہ کافر نہیں گناہ گار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام

---

① محمد 9: ② الشفاء: 191/2، الصارم المسلول: 979/3

وفرامین پر راضی ہونا ایمان ہے اور ان پر ناک بھوں چڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

علامہ علی قاری نے تو فرمایا ہے کہ جو شخص خبر واحد کا انکار استخفافاً و استحقاراً کرتا ہے وہ بھی کافر ہے۔ ①

اس لیے رسول اللہ ﷺ کا مذاق ہو، یا دین اسلام کے کسی حکم کا مذاق یا استخفاف، موجبِ کفر ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

﴿اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ﴾ اہل مکہ کے لیے رسولوں اور ان کے ساتھ مردِ حق پرست کی مثال بیان کر کے رسولوں کی تکذیب اور ان پر ایمان لانے والوں کی تعذیب کے انجام سے خبردار کرنے کے بعد اب انھیں براہِ راست خطاب ہے اور انھیں ماضی کے تناظر میں بتلایا جا رہا ہے کہ جو خطرناک کھیل وہ کھیل رہے ہیں، یہ کھیل کھیلنے والوں کا انجام ہمیشہ ان کی تباہی و بربادی ہوا ہے۔ انھیں ہم نے ایسے مٹایا کہ پھر وہ اٹھ نہ سکے اور نہ ہی واپس دنیا میں آ سکے، اب ان کی حاضری ہمارے پاس ہوگی اور ہم ان سے ان کے اعمال کا حساب لیں گے۔

﴿اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ ایسی ہلاکت سے دوچار ہوئے کہ وہ ان کی طرف نہیں آ سکتے۔ اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جو دنیا سے چلے جانے کے بعد دوبارہ پلٹ آنے کا تصور رکھتے ہیں۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنی جہالت کی وجہ سے کہتے تھے:

﴿مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ②

”ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی (زندگی) نہیں، ہم (یہیں) جیتے اور مرتے ہیں اور ہمیں زمانے کے سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا۔“

یہ دہریہ صفت لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہم مرتے ہیں اور پھر کسی شکل و صورت میں دنیا میں آ جاتے ہیں، حالانکہ یہ محض ان کا وہم ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد کوئی واپس پلٹ کر

---

① شرح فقه الاکبر، ص 166 ② الجاثیه: 24

نہیں آتا۔

شہداء کے بارے میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنی تعظیم وتکریم دیکھ کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں دوبارہ جائیں تاکہ دوسری بار پھر شہید ہوں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا:

''تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے باپ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، جو اُحد میں شہید ہوئے تھے، کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا، پھر فرمایا: بتلاؤ کیا چاہتے ہو؟ تو تمھارے باپ نے کہا: مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیجیے تاکہ دوسری بار شہادت کا مرتبہ پاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

««إني قضيت الحكم أنهم إليها لا يرجعون.»» ①

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں آنے والے دوبارہ دنیا میں نہیں جائیں گے۔''

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ہے:

««وهذه الآية ردّ على من زعم أن من الخلق من يرجع قبل يوم القيامة.»» ②

''یہ آیت اُس کی تردید کرتی ہے جو خیال کرتا ہے کہ مخلوق میں کچھ ایسے ہیں جو قیامت سے پہلے دنیا میں آجاتے ہیں۔''

علامہ آلوسی نے بھی کہا ہے کہ اس آیت سے روافض کی تردید ہوتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رجعت کے قائل ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قیامت سے پہلے دنیا میں آئیں گے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا: پھر تو ہم بہت بُرے لوگ ہوئے۔ ہم نے ان کی بیویوں سے نکاح کیے اور ان کی میراث کو تقسیم کیا، تم قرآنِ مجید کی یہ آیت نہیں پڑھتے: ﴿اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ الآية﴾۔ یہاں سے چلے جانے کے بعد شہداء کی دوبارہ واپسی ممکن نہیں تو کسی اور کی واپسی

---

① مسند أحمد: 361/3 ② قرطبي: 24/15

کا تصور کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

کفار کے بارے میں قرآنِ مجید ہی میں ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾ ①

"یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آتی ہے تو کہتا ہے: اے میرے ربّ! مجھے واپس بھیجو تا کہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں کوئی نیک عمل کرلوں۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک بات ہے جسے وہ کہنے والا ہے اور ان کے پیچھے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے، ایک پردہ ہے۔"

یہاں سے چلے جانے کے بعد ہر ایک کا ٹھکانا "برزخ" ہے۔ نیک ہیں تو یہ برزخ اعلیٰ علیین میں ہے اور اگر بُرے ہیں تو ان کا ٹھکانا سجین ہے۔ وہ وہاں سے ایک دوسرے کے ہاں جانے کے اور مزاج پرسی کے مجاز نہیں چہ جائیکہ دنیا میں آنے جانے کے مجاز ہوں اور کسی کی بگڑی سنوارنے کا اختیار رکھتے ہوں۔ کفار تو قیامت کے روز اور پھر جہنم میں چلے جانے کے بعد بھی دنیا میں لوٹ آنے کا مطالبہ کریں گے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآنِ مجید میں ہوا ہے۔ ②

﴿وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ اور وہ سب ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔ تمام انسان، کیا پہلے کیا پچھلے، سب ہمارے پاس حاضر ہوں گے۔ ہم انھیں ان کے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ اگر نیک ہوں گے تو بدلہ اچھا اور بھلا ملے گا، اگر بُرے ہوں گے تو انجام بُرا ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس سب نے جمع ہونا ہے، اللہ ہی نے حساب لینا ہے

---

① المؤمنون: 100,99

② ملاحظہ فرمائیں: سورۃ الانعام: ۲۷، الاعراف: 52، إبراهيم: 41، السجدة: 12، المنافقون: 11,10 وغیرہ۔

اور اللہ ہی نے اعمال کی جزا دینی ہے۔ پہلی آیت میں تھا کہ جو یہاں سے چلے گئے وہ واپس نہیں آئیں گے۔ اس آیت میں ہے کہ جو یہاں سے آگے چلے گئے، اسی پر ان کا معاملہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ ہمارے پاس سب آئیں گے اور اپنے اپنے اعمال کی جزا پائیں گے۔ ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں، اس لیے مکذبین پر افسوس ہے کہ انھوں نے زندگی ضائع کر دی، ہمارے رسول کا انکار بلکہ استہزا کیا، دوسرے مکذبین کے انجام سے بھی انھوں نے کوئی سبق نہیں لیا۔ اب ہمارے پاس اس کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔

﴿وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ ٥ وَجَعَلْنَا فِیْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْهَا مِنَ الْعُیُوْنِ ٥﴾ [یٰسٓ: 34,33]

''اور ایک نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے غلہ نکالا تو وہ اسی میں سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے کئی باغ بنائے اور ان میں کئی چشمے پھاڑ نکالے۔''

اس سے پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے کہ سب انسانوں نے بالآخر ہمارے ہاں حاضر ہونا ہے۔ اور اس سے پہلے رسولوں کی دعوت توحید کا قصہ بیان ہوا ہے۔ یہی دونوں، یعنی توحید اور آخرت کا عقیدہ رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تو کفار نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آئندہ کی آیات میں انھی دونوں کے بارے میں آفاقی وتکوینی دلائل کا بیان ہے۔

﴿وَاٰیَةٌ لَّهُمْ﴾ میں ''اٰیة'' نکرہ تفخیم شان کے لیے ہے کہ اگر وہ ان بنیادی عقائد کے بارے میں کوئی نشانی طلب کرتے ہیں تو اس کے لیے اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں، خود اُن کے پاؤں کے نیچے موجود زمین ان حقائق کی بڑی نشانی ہے۔

﴿الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا﴾ مردہ زمین، یعنی بنجر زمین جس میں نباتاتی زندگی کی کوئی رمق نہیں ہوتی، اسے ہم زندگی بخشتے ہیں۔ ہمارے سوا نہ کوئی بارش برسانے والا ہے اور نہ ہی بارش کے بعد بنجر زمین سے کوئی نباتات اُگانے والا ہے۔ قرآنِ مجید میں توحید کی ابتدائی دعوت کے ضمن میں اسی حقیقت کا بیان ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥﴾ ①

---

① البقرۃ:22

"(اس کی عبادت کرو) جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک بچھونا اور آسمان کو ایک چھت بنایا اور آسمان سے کچھ پانی اُتارا، پھر اس کے ساتھ کئی طرح کے پھل تمھاری روزی کے لیے پیدا کیے، پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ جب کہ تم جانتے ہو۔"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۝﴾ ①

"پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟ کیا تم نے اسے بادل سے اُتارا ہے یا ہم ہی اُتارنے والے ہیں۔"

زمین سے پیدا ہونے والی کھیتیوں کے بارے میں بھی فرمایا:

﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ۝﴾ ②

"پھر کیا تم نے دیکھا جو کچھ تم بوتے ہو؟ کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم ہی اُگانے والے ہیں؟"

اسی حقیقت کا بیان اس سے بعد کی آیت میں ہوا کہ ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ حالاں کہ ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور اس کے حکم سے ہوا ہے۔ اس کی معرفت کی نشانی یہ زمین ہے، کہیں ریتلی ہے کہیں پتھریلی اور پہاڑی، کہیں بھربھری، کہیں بھوری، کہیں سفیدی مائل ہے۔ یہ زمین اور اس کے بنانے میں یہ تنوع اللہ تعالیٰ نے قائم رکھا ہے، اسی پر تمھارا بسیرا ہے، اسی پر چلتے پھرتے ہو اور اسی سے تمھارے کھانے کی اشیاء نکل رہی ہیں، اسی میں بالآخر تمھیں دفن ہونا ہے:

---

① الواقعة:68،69 ② الواقعة:63،64

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝﴾ ①

''کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندوں کو اور مردوں کو۔ اور ہم نے اس میں بلند پہاڑ بنائے اور ہم نے تمھیں نہایت میٹھا پانی پلانے کے لیے دیا۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔''

زندہ انسان زمین پر ہی بستے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اسی میں دفن ہوتے ہیں اور جو دفن نہیں ہوتے آگ سے جلنے یا پانی میں ڈوبنے کے بعد یا کسی نہ کسی واسطے سے اسی زمین کا حصہ بنتے ہیں، اس لیے اوّلاً تو یہ زمین بجائے خود ایک بڑا انعام اور اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔ ثانیاً جو ہستی زمین بنانے پر قادر ہے، اس کے لیے انسان کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝﴾ ②

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''

زمین و آسمان کی تخلیق سے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا یہ استدلال ایک اور مقام پر یوں ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ

---

① المرسلٰت: 25-28 ② الأحقاف:33

اِلَّا كُفُوْرًا۝ ﴾ ①

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے جس میں کچھ شک نہیں، پھر (بھی) ظالموں نے کفر کے سوا (ہر چیز سے) انکار کر دیا۔''

اس لیے جو ہستی زمین وآسمان بنانے پر قادر ہے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ انسان کو دوبارہ زندہ کرے مگر اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آئے گا تو اُس کے ایک حکم سے انسان قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اوّلاً تو یہ زمین بجائے خود اس حقیقت پر دلیل ہے مگر اِس پر دوسری دلیل اور نشانی یہ ہے کہ

﴿اَحْيَيْنَاهَا﴾ ہم نے اس مردہ زمین کو حیات بخشی۔ اسے زندگی اور تازگی عطا کی جو تمھارے لیے رعنائی اور دل رُبائی کا باعث بنتی ہے۔ غور کرو! جس طرح ہم اس مُردہ زمین کو زندگی بخشنے پر قادر ہیں اسی طرح تمھارے مرنے اور مٹی میں دفن ہونے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہیں۔ حیات بعد الممات پر یہ استدلال قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

''اور ہم نے آسمان سے ایک بہت بابرکت پانی اُتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کاٹی جانے والی کھیتی کے دانے اُگائے۔ اور کھجوروں کے درخت لمبے لمبے جن کے تہ بہ تہ خوشے ہیں۔ بندوں کو روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہے۔'' ②

ایک اور جگہ فرمایا:

---

① الإسراء:99 ② ق:9-11

﴿وَاللّٰهُ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ﴾ ①

''اور اللہ ہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، پھر وہ بادل کو اُبھارتی ہیں، پھر ہم اسے ایک مردہ شہر کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر ہم اس کے ساتھ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح اٹھایا جانا ہے۔''

زمین کی زندگی سے حیات بعد الممات پر استدلال کی مزید ضروری تفصیل کے لیے سورۂ فاطر اور سورۂ قٓ کی انھی آیات کے تحت جو کچھ ہم لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

﴿وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا﴾ زمین کی زندگی کے نتیجے میں ہم نے اس سے غلہ نکالا۔ ''حَبٌّ'' اور ''حَبَّةٌ'' گندم، جو، باجرہ، مکئ اور چنا وغیرہ کے دانے کو کہتے ہیں، یعنی اناج کی تمام اقسام پر ''حَبٌّ'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور خوش بُو دار پودوں اور پھلوں کے بیج کو ''حِبٌّ'' اور ''حِبَّةٌ'' کہا جاتا ہے۔ ②

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ غلے کی صورت میں متعدد اجناس پیدا کیں۔ اگر غلے کی صرف ایک ہی قسم ہوتی تو انسان اکتا جاتا۔ بنی اسرائیل تو ''من وسلویٰ'' سے اکتا گئے تھے۔ بیماری کی صورت میں اگر ایک کو دل نہ چاہے تو دوسری متبادل اشیاء موجود ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فیضانِ کرم کا نتیجہ ہے۔

﴿جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ﴾ اناج کے دانے تو ہر سال بوئے جاتے ہیں۔ اور سال بہ سال ان کا بڑھنا، پھلنا پھولنا دیکھا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایسے درختوں کے باغات سجائے گئے ہیں جو سالہا سال تک رہتے ہیں اور تم ان سے مختلف قسموں کے پھل کھاتے ہو۔ ''جَنّٰتٍ'' یعنی باغات۔ یہ ''جَنَّةٌ'' کی جمع ہے اور اس کا اصل مادہ ''جَنَّ'' ہے جس کے معنی پوشیدہ کرنے اور چھپانے کے ہیں۔ باغات کے گنجان درخت زمین کو چھپا

---

① فاطر 9: ② مفردات

لیتے ہیں، اسی لیے انھیں "جَنَّاتٍ" کہا گیا ہے۔ دل کو "اَلْجِنَان" کہا جاتا ہے کہ وہ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ "جُنَّةٌ" ڈھال کو کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے انسان چھپ جاتا ہے۔ جن کو "جِنّ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسانوں کی آنکھوں سے چھپا ہوا ہے۔ اسی سے ماں کے پیٹ میں بچے کو "جنین" کہا گیا ہے، یہ جنین فعیل بمعنی مفعول ہے، یعنی چھپا ہوا۔ اسی سے جُنُوْن (دیوانگی) ہے۔ جنون اس بیماری کو کہتے ہیں جو دماغ میں چھپی ہوتی ہے۔

پھلوں کے باغات میں سے یہاں صرف کھجور اور انگور کا ذکر ہے کیوں کہ یہ اپنی حلاوت اور قوت وتوانائی میں دیگر پھلوں کی نسبت ممتاز ہیں۔ تر وتازہ اور خشک دونوں صورتوں میں ان کا استعمال ہوتا ہے اور سال بھر استعمال ہوتا رہتا ہے۔ پھلوں میں یہ دونوں سال بھر بطور غذا بھی مستعمل رہتے ہیں۔ "نخیل" کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں "عنب" یا "أعناب" انگور کا ذکر ہوا ہے، اس کے درخت کا نام "الکرم" استعمال نہیں ہوا کیوں کہ انگور کا درخت اس کے پھل سے حقیر اور فائدے میں کم تر ہے جب کہ کھجور کا درخت بھی کھجور کی مانند سودمند ہے۔ وہ اونچا سر بلند ہوتا ہے، قطار اندر قطار لگا ہوا خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے تنے مکان کے لیے شہتیر بنتے ہیں۔ تنے کو کرید کر اس سے برتن بنتے ہیں۔ قلب النخلہ، جسے حدیث میں ''الجمار'' کہا گیا ہے۔ ① پیٹ کے امراض کے لیے مفید ہے۔ اس کے پتوں سے چٹائی، رسی اور دستی پنکھے بنائے جاتے ہیں، اس کی گٹھلی بالخصوص عجوہ کی گٹھلی دل کی بیماریوں میں مستعمل ہے اور دانت صاف کرنے کے لیے منجن میں استعمال ہوتی ہے، جانوروں کی غذا ہے۔ اس کا سفوف اسہال میں بھی مفید ہے۔ اور کھجور کے درخت کا تازہ رس سل اور دق کے مریضوں کو استعمال کرایا جاتا ہے۔ کھجور کے درخت کی اسی افادیت کی بنا پر اس کے پھل کا نہیں، درخت کا ذکر ہوا ہے جب کہ انگور کے درخت میں افادیت کم تر ہونے کی وجہ سے اس کے پھل کا ذکر ہوا ہے۔

---

① بخاری:2209

بعض نے کہا ہے کہ کھجور کی فضیلت کا راز یہ ہے کہ یہ اس بقیہ مٹی سے بنی ہے جس سے آدم علیہ السلام کا وجود بنایا گیا تھا، مگر یہ بے اصل اور موضوع روایت ہے۔ ①

"حَبًّ" یعنی غلے کا ذکر پہلے ہے کیوں کہ اس کی پیداوار اور افادیت خوراک کے اعتبار سے زیادہ ہے، پھر کھجور اور پھر انگور کا کہ یہ پھل بھی ہیں اور خوراک بھی بنتے ہیں۔ عرب کے ہاں ان کی پیداوار بھی زیادہ ہے اور ان کے ہاں یہ مرغوب بھی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مسلمان کی مثل ہے، مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے؟'' مجلس میں بیٹھے صحابہ کرام کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف گیا مگر میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے لیکن مجھے (بڑوں کی موجودگی میں بولنے پر) شرم آئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی بتلائیں یہ کون سا درخت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کھجور کا درخت ہے۔'' ②

بعض روایات میں ہے کہ وہاں دس صحابہ تھے جن میں سے ایک میں تھا اور سب سے صغیر السن تھا۔ مجلس میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے، وہ بھی خاموش رہے تو مجھے بھی ناگوار گزرا کہ بات کروں۔

مجلس برخاست ہوئی تو میں نے والد گرامی عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے دل کی بات کہہ دی۔ انھوں نے فرمایا: اگر تم یہ بات کہہ دیتے تو مجھے سرخ اونٹ سے زیادہ یہ جواب محبوب ہوتا۔ ③

اس حدیث سے بھی کھجور کے درخت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

﴿وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ﴾ اور اس زمین میں چشمے جاری کر دیے۔ پہاڑوں کی بلندی پر چشموں کا ظہور، بعض پہاڑوں پر ان کا وجود اور بعض پر اس کا کوئی نشان نہ ہونا

---

① فتح الباری: 147/1، سلسلة الاحاديث الضعيفه رقم 261,263

② صحيح بخاري، رقم الحديث: 62,61 ③ فتح الباري: 146/1

بجائے خود اللہ کی قدرت کا عظیم کرشمہ ہے۔ چشموں کا پانی دریاؤں اور نہروں کے ذریعے کھیتوں تک پہنچتا ہے اور وہ سرسبز و شاداب ہوتی ہیں۔

"فَجَرَ" کے معنی پھاڑنا اور شق کرنا ہے۔ گویا پتھروں کو پھاڑ کر ان میں چشمے جاری کر دیے۔ "عُیُوْنٌ" "عَیْنٌ" کی جمع ہے جس کا معنی آنکھ ہے۔ پانی کے چشمے کو "عَیْنٌ" اس لیے کہا گیا ہے کہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ جس طرح "عَیْنٌ" ہڈیوں کے درمیان ہے اسی طرح "عُیُوْنٌ" پتھروں کے درمیان ہوتے ہیں۔

﴿لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [يٰس:36,35]

''تاکہ وہ اس کے پھل سے کھائیں، حالانکہ اسے ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا، تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ پاک ہے وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے ان چیزوں سے جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود اُن سے اور ان چیزوں سے جنھیں وہ نہیں جانتے۔''

یہ باغات اس لیے ہیں کہ وہ ان کا پھل کھائیں۔ بعض نے کہا ہے: ﴿ثمرہ﴾ میں ضمیر چشموں کی طرف ہے۔ ① چشموں کا پانی ہی دریاؤں اور نہروں کے ذریعے باغات تک پہنچتا ہے۔ اور گندم، جو، چنے کی فصل تو بسا اوقات برسات اور شبنم سے سیرابی پر تیار ہو جاتی ہے۔

علامہ زمخشریؒ وغیرہ نے یہ بھی کہا ہے کہ ﴿من ثمرہ﴾ سے مراد ''من ثمر اللّٰہ'' ہے کیوں کہ پانی کے جاری ہونے اور پودوں کی پرورش کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ پھل نہ لگائے یا پھل لگے بھی مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے اسے برباد کر دے تو کون ہے جو پھل دے سکتا ہے! اس لیے یہ پھل اللہ ہی کی عطا ہیں۔

مگر علامہ رازیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ضمیر کا مرجع لفظ اللہ کی طرف ہوتا تو جیسے پہلے ﴿جعلنا﴾، ﴿فجرنا﴾ فرمایا ہے کہ ہم نے اس میں باغات پیدا کیے، ہم نے چشمے جاری کیے اسی طرح یہاں بھی ''من ثمرنا'' کہا جاتا، یعنی ہم نے پھل لگائے۔

---

① فتح القدیر

فرماتے ہیں: اقرب بات یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع ﴿فجرنا﴾ کی طرف ہے کیوں کہ یہ نخیل سے اقرب ہے۔ اور ﴿ثمرہ﴾ سے مراد فوائد اور نتائج ہیں جیسے تجارت کا ثمرہ نفع ہے اور عبادت کا ثمرہ ثواب اور جنت ہے۔ معنی یوں ہوں گے: ''ہم نے چشمے جاری کیے تا کہ ان چشموں کے فوائد و نتائج کو کھاؤ۔'' چشموں کے فوائد صرف پھل نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا o ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا o فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا o وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا o وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا o وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا o وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا o مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ o﴾ ①

''کہ بے شک ہم نے پانی برسایا خوب برسانا۔ پھر ہم نے زمین کو پھاڑا ایک عجیب طریقے سے پھاڑنا۔ پھر ہم نے اس میں اناج اُگایا۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور زیتون اور کھجور کے درخت۔ اور گھنے باغات۔ اور پھل اور چارا۔ تمھارے لیے اور تمھارے مویشیوں کے لیے زندگی کا سامان۔''

یہ سب انھی چشموں کے پانی کے ثمرات ہیں۔

بلاشبہ ''ثمر'' کا لفظ مجازاً ہر چیز کے نفع پر اور پیداوار پر بھی بولا جاتا ہے۔ سورۃ الکہف میں دو آدمیوں کی مثال میں ذکر ہوا ہے کہ ان میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیے۔ دونوں باغات کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کچھ کھیتی تھی۔ دونوں کے درمیان نہر جاری کر دی۔ یہ کہہ کر فرمایا:

﴿وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ﴾ ②

(یوں) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔

یہاں ثمر کا یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا ہے۔ ③

---

① عبس: 25-32 ② الکہف: 34 ③ مفردات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب وادیِ مکہ میں اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام اور سیّدہ ہاجرہ علیہا السلام کو لا بسایا تو ان کے لیے یہ دعا بھی کی:

﴿وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ ①

''اور انھیں پھلوں سے رزق عطا کر۔''

اس دعا کی اثر پذیری کا نتیجہ تھا کہ اہلِ مکہ سے فرمایا گیا:

﴿اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ②

''اور کیا ہم نے انھیں ایک باامن حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔''

یہاں ہر چیز کے پھل فرمایا ہے، ہر درخت کے پھل نہیں فرمایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں دنیا بھر کی اشیاء اور مصنوعات پہنچتی ہیں۔ مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات ہیں۔ ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ اُجرت ہے بلکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت سے فرماتے ہیں:

((يَا مَلَكَ الْمَوْتِ! قَبَضْتَ وَلَدَ عَبْدِي! قَبَضْتَ قُرَّةَ عَيْنِهِ وَثَمَرَةَ فُؤَادِهِ.)) ③

''اے ملک الموت! تُو میرے بندے کے بیٹے کو لے آیا ہے! تُو اس کی آنکھ کی ٹھنڈک اور اس کے دل کا پھل لے آیا ہے۔''

اس لیے ''ثمر'' کے معنی پھل ہی نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں کے نتائج اور ان کے ثمرات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی بنا پر امام رازیؒ نے یہاں ﴿ثمرہ﴾ کو چشموں کے نتائج اور ثمرات سے متعلق کہا ہے۔

---

① إبراهيم:37 ② القصص:57 ③ مسند أحمد

﴿وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ پانی کے نتیجے میں زمین سے نکلنے والے اناج، پھلوں اور سبزیوں کو انسانوں نے نہیں بنایا بلکہ ان سب کو اللہ ہی نے بنایا ہے۔ پانی برسانے والا اور چشمے جاری کرنے والا بھی اللہ ہی ہے اور ان سے انواع واقسام کے اناج، پھل اور ترکاریاں پیدا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔ اللہ کے علاوہ پانی کو جاری کرنے اور کھیتیوں کو پیدا کرنے میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں تو پھر وہ اللہ کا شکر کیوں نہیں کرتے۔ جمہور مفسرین نے ''ما'' کو نفی کے معنی میں لیا ہے۔ انسان بلاشبہ زمین کو پانی سے سیراب کرتا ہے، ہل چلاتا ہے، بیج بوتا ہے، خس وخاشاک سے صاف کرتا ہے اور محنت کرتا ہے مگر اس بیج سے نرم ونازک کونپل کو زمین سے نکالنے والا، اسے پتوں اور شاخوں سے سجانے والا، اس کو پھول اور پھل لگانے والا کون ہے؟ اسی حقیقت کی طرف اشارہ سورۃ الواقعہ میں یوں ہے:

﴿اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝﴾ ①

''کیا تم نے دیکھا جو کچھ تم بوتے ہو؟ کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم ہی اُگانے والے ہیں۔''

جب ان سب کو پیدا کرنے والا اللہ ہے، ان کے پیدا کرنے میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ نے ہی تمھیں ان کا مالک بنایا ہے، کھانے پینے کا سلیقہ بھی بتلایا تو تم اس کا شکر کیوں نہیں کرتے؟ یہ سب دی ہوئی نعمتیں تو تم اللہ کی کھاؤ اور شکر کسی اور کا کرو، اس سے بڑی احسان فراموشی اور کیا ہوگی۔ کھانا کھانے کے بعد حسب ذیل دعا کا مصداق یہی ہے:

«الحمد لله الذي أطعمني هذا الطعام ورزقنيه من غير حول مني ولا قوة.» ②

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور بغیر میری کسی طاقت

---

① الواقعة: ٦٣، ٦٤ ② أبوداود: 4023، ترمذي: 3458

اور قوت کے مجھے عطا کیا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص کھانے سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھتا ہے اس کے سابقہ (صغیرہ) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کے بعد کی مزید ادعیہ مسنونہ کتب احادیث میں موجود ہیں، ان تمام میں اللہ کی حمد قدر مشترک ہے۔

امام ابن جریر اور دیگر بعض مفسرین نے یہاں "مَا عَمِلَتْهُ" میں "ما" کو موصولہ بمعنی "الذي" قرار دیا ہے۔ اس طرح آیت کا مفہوم یوں ہے: "تا کہ وہ کھائیں اس کے پھلوں اور ان چیزوں کو جو ان کے اپنے ہاتھوں سے تیار ہوتی اور بنائی جاتی ہیں۔" مثلاً: اچار، مربے، تیل چٹنیاں، سالن، حلوے وغیرہ۔ گویا اللہ نے پھل وغیرہ بھی دیے اور یہ سلیقہ بھی دیا کہ ایک پھل یا مختلف پھلوں سے مختلف خوش ذائقہ اور مفید چیزیں تیار کرتے ہیں۔ یہ سلیقہ گویا دوسری نعمت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں ﴿مِمَّا عَمِلَتْهُ اَيْدِيُهِمْ﴾ ہے، یعنی "ما" نافیہ نہیں ہے۔

اس تفسیر میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں باقی جان دار صرف ایک چیز کھاتے ہیں، کوئی پھل کھاتا ہے تو کوئی گوشت، کوئی گھاس کھاتا ہے، تو کوئی دانے اور چارہ۔ مگر انسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھانے تیار کرنے کا سلیقہ دیا ہے۔ وہ مختلف اشیاء کو مرکب کر کے خوش ذائقہ بنا لیتا ہے اور نوش جان کرتا ہے اور ان متنوع مرکب کھانوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں اور صلاحیتوں پر چاہیے تو یہ کہ وہ اللہ کا شکر گزار رہے، آخر وہ شکر کیوں نہیں کرتا جب کہ حکم یہ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۝﴾ ①

---

① البقرة 2:172

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

یہی حکم سورۃ النحل میں ہے۔ ①

﴿اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ﴾ یعنی ہم نے انھیں اتنی نعمتوں سے نوازا ہے تو وہ شکر کیوں نہیں کرتے۔ ''شکر'' کا اوّلین تقاضا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہی احسان مند ہوں جس نے ان کے لیے انواع واقسام کے اناج اور باغات پیدا کیے، ان کے لیے چشمے جاری کیے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے منعم ومحسن کو پہچانتے اور اس کے شکر گزار بنتے مگر اس کی نعمتیں کھا کے اور اس کے جاری کیے ہوئے چشموں کا پانی پی کر وہ ان کے شکر گزار بنتے ہیں اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنھوں نے ایک دانہ بھی پیدا نہیں کیا حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر سُو پھیلی ہوئی نعمتوں سے اللہ تعالیٰ ہی نے نواز رکھا ہے:

﴿یَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنۡکِرُوۡنَہَا وَ اَکۡثَرُہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ﴾ ②

''وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔''

شکر صرف زبان سے نہیں بلکہ دل اور جوارح سے بھی لازم ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ انسان دل سے اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ یہ نعمت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ وہ نعمتِ نفع ہو یا نعمتِ دفع ہو۔ اس کو اپنی قابلیت، اپنی محنت وکوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کا نتیجہ سمجھے۔ زبان کا شکر یہ ہے کہ اس سے منعم کی حمد وثنا بیان کرے، الحمد للہ، الحمد للہ کہے اور زبان سے اقرار کرے کہ تمام نعمتوں سے نوازنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ جوارح سے شکر یہ ہے کہ انھیں اللہ کی عبادت میں اور اس کے واجبات کی ادائیگی میں لگائے رکھے۔ عبادت سے روگردانی کرنے والا شکر گزار نہیں ہوسکتا جیسا کہ

---

① النحل :114 ② النحل:83

ابتدائے سورت میں بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ ①

''اور اللہ کا شکر کرو اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے کہ جو زبان سے شکر کرتا ہے مگر جوارح سے شکر نہیں بجالاتا اس کی مثال یوں ہے کہ انسان کے پاس لباس ہو، وہ اسے کونے سے پکڑ لے مگر اسے زیب تن نہ کرے۔ وہ لباس اسے نہ گرمی سے بچا سکتا ہے نہ ہی سردی سے، نہ بارش سے نہ برف باری سے۔ ②

اسی طرح اللہ کی نعمتوں کو انھی مصارف میں صرف کرے جہاں انھیں صرف کرنے کا حکم ہے۔ یہ بھی جوارح کا شکر ہے کہ نعمت کا اظہار اچھے لباس، اچھی سواری کے استعمال سے کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ میں جس کو نعمت دوں اس پر اس کا اثر بھی دیکھوں۔

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا﴾ ''پاک ہے وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے۔'' ﴿سبحان﴾ کلمہ تنزیہ ہے کہ اللہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اللہ خالقِ ازواج ہے، اس کا کوئی زوج نہیں، وہ ہر قسم کے زوج سے پاک ہے۔ ﴿ازواج﴾ ''زوج'' کی جمع ہے جو جوڑے کے معنی میں آتا ہے اور انواع واقسام کے معنی میں بھی آتا ہے۔ زوج میں دو متقابل چیزیں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہتے ہیں جیسے مرد عورت کا اور عورت مرد کا زوج ہے، اسی طرح حیوانات میں نر اور مادہ ایک دوسرے کا زوج ہیں بلکہ درختوں اور نباتات میں بھی یہ نر اور مادہ کا سلسلہ موجود ہے۔ جب پھل لگنے کا موسم آتا ہے تو نر درختوں کا بیج ہواؤں کے ذریعے یا پرندوں کے ذریعے مادہ درختوں پر ڈال دیا جاتا ہے تو پھل وغیرہ کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ اور

---

① البقرۃ:172 ② عدۃ الصابرین، ص:136

کچھ بعید نہیں کہ ازواج کا یہ سلسلہ جمادات میں بھی پایا جاتا ہو جس کی طرف آیت کے اختتام میں ﴿وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح دو متقابل ومتعارض چیزوں پر بھی زوج کا اطلاق ہوتا ہے جیسے موت وحیات، سردی وگرمی، موسم بہار اور موسم خزاں، خشکی وتری، خوشی وغمی، صحت اور بیماری، دن اور رات، دھوپ اور سایہ، روشنی اور تاریکی حتی کہ برقی توانائی میں بھی سرد وگرم کا تصور ہے۔ اس کے علاوہ رنگ ونسل کا فرق، عاقل وبیوقوف، شقی وسعید، طویل وقصیر بھی اسی زوج کے دائرے میں آتے ہیں۔

بلکہ زوج کا اطلاق مماثلت رکھنے والی اشیاء پر بھی ہوتا ہے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کا زوج، یعنی جوڑا ہے۔ اسی معنی میں قرآنِ مجید میں آیا ہے:

﴿وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ۝﴾ ①

''اور دوسری اس کی ہم شکل کئی قسمیں۔''

یوں ہر چیز کا زوج بنانے والا اور ان ازواج کے مابین جوڑ جوڑنے والا صرف اللہ ہے۔ قرآنِ مجید میں ﴿زوج﴾ چودہ معنوں میں استعمال ہوا۔ شائقین اس کی تفصیل علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی کی کتاب ''بصائر ذوي التمييز'' ② میں ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی آیت کے اختتام پر فرمایا گیا تھا کہ اللہ کا شکر کیوں نہیں کرتے، اس آیت میں مزید اشارہ ہے کہ یہ صرف ناشکر گزار ہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا دوسروں کے عبادت گزار بن کر شرک کے بھی مرتکب ہوتے ہیں حالانکہ اللہ پاک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، ہر ایک کا جوڑا بنانے والا وہی ہے، اس کا کوئی زوج نہیں اور نہ کسی کو اس سے کوئی مماثلت ہے، ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کے وصف سے وہی متصف ہے، نہ ہی کوئی اس کے مقابل ہے ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ ''وہی سب پر غالب ہے'' اور وہ ہر قسم کے شرک سے

---

① صٓ:58 ② بصائر ذوي التمييز: 144/3

پاک ہے۔

﴿الْاَزْوَاجَ﴾ کا ذکر ﴿مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ﴾ یعنی نباتات اور زمینی اشیاء کے انواع واقسام سے پہلے ہوا ہے، پھر ﴿مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ یعنی خود انسانوں میں ازواج (جوڑوں) کا ذکر ہے، پھر ﴿مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ میں سب زمینی مخلوقات شامل ہیں جن کا انکشاف ابھی تک انسان پر نہیں ہوا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ بحر وبر میں کتنی انواع واقسام از قسم حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں جنھیں لوگ نہیں جانتے، اللہ نے تو اپنے فرشتوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ ①

''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

اس کی ساری مخلوق کا شمار وقطار کون کر سکتا ہے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ②

''اور تمھیں علم میں سے بہت تھوڑے کے سوا نہیں دیا گیا۔''

یہ ساری مخلوقات اور ان کے جوڑے اللہ ہی نے بنائے اور بسائے ہیں۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی کامل مخلوق سے ہی بے خبر ہے کہ وہ کہاں اور کیسے بس رہی ہے۔ جو نہ خالق ہے، نہ ہی ساری مخلوق سے واقف ہے، وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ صرف ایک اللہ ہے جو سب کچھ جانتا ہے بلکہ:

﴿وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ ③

''اور زمین میں کوئی چلنے والا (جان دار) نہیں مگر اُس کا رزق اللہ ہی پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے، سب کچھ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔''

صرف انسان ہی نہیں ہر جان دار کی جگہ ور ہائش سے وہ واقف ہے، اسی کو علم ہے

---

① المدثر 31:31 ② بني إسرائيل:85 ③ هود:6

کہ یہ کب تک دنیا میں رہے گا اور کب دنیا سے جائے گا، اُس کے علاوہ کسی کو اُس کے اِن اَحوال کا کوئی علم نہیں، اس لیے اللہ کے سوا جنھیں معبود بنایا جاتا ہے اللہ اس شرک سے پاک ہے۔

اس آیت میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ جیسے یہاں دنیا میں ہر ایک کا جوڑا ہے؛ موت وحیات ہے، صحت و بیماری ہے، نر اور مادہ ہے، اسی طرح دنیا کا زوج اور جوڑا بھی ہے اور وہ آخرت ہے۔ اگر آخرت اس کا جوڑا نہ ہو تو دنیا ایک بے مقصد اور کھلنڈرے کا کھیل بن کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کا خالق حکیم بھی ہے، یہ اس کی حکمت کے منافی ہے کہ وہ کوئی بے مقصد کام کرے یا جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ گویا اس آیت میں جہاں توحید کا اِثبات اور شرک کا اِبطال ہے وہاں قیامت کے وجود کی طرف بھی اشارہ ہے۔

آیت مذکورہ بالا میں ہر ایک کے جوڑے بنائے جانے کا ذکر ہے جیسے ایک اور مقام پر بھی ذکر ہوا ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ ①

''اور ہر چیز سے ہم نے دو قسمیں بنائیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

مگر اللہ تبارک وتعالیٰ جوڑے سے پاک ہے۔ ان تمام جوڑوں کے بارے میں مخلوق کو علم نہیں لیکن ان کے خالق کو علم ہے جس سے خالق ومخلوق کا فرق وتفاوت بالکل عیاں ہے۔ یہی تقابل ایک جگہ یوں بھی بیان ہوا ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ○﴾ ②

''ہر ایک جو اِس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والا ہے۔ اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو بڑی شان اور عزت والا ہے۔''

اس لیے مخلوق کو خالق سے کوئی نسبت نہیں۔ مخلوق ناتواں، جوڑوں کی محتاج، موت وفنا سے دوچار ہونے والی، جب کہ خالق قوی اور عزیز ہے، سبحان ہے اور حي وقیوم ہے۔

---

① الذاریات:49 ② الرحمٰن: 27,26

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ۝﴾ [یٰسٓ:37]

''اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اس پر سے دن کو کھینچ اُتارتے ہیں تو اچانک وہ اندھیرے میں رہ جانے والے ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توحید، اس کی قدرتِ کاملہ اور قیامت کے وقوع کی دوسری دلیل بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے زمین کے احوال سے انھی امور پر دلیل کا ذکر ہوا ہے اور اب رات کے حوالے سے ہو رہا ہے۔ ساری مخلوق چونکہ مکان و زمان سے وابستہ ہے، انسان کا زیادہ تعلق زمین سے ہے، یہ اس پر رہتا اور چلتا پھرتا ہے، اس لیے پہلے مکانی دلیل، یعنی زمین کا ذکر کیا ہے اور اب زمانی دلیل، یعنی رات اور دن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

زمین کی طرح رات اور دن میں بھی ایسی نشانیاں ہیں کہ بادی النظر میں انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کے آنے کی روشن دلیلیں ہیں۔ رات دن کا یہ انقلاب، اپنے وقت مقررہ پر یہ طلوع و غروب اور اس میں یہ دوام اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ یہ سارا نظام ایک قادر مطلق کے حکم سے قائم ہے۔ دن جب غالب آتا ہے تو رات کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا اور جب رات چھا جاتی ہے تو دن کی اثر پذیری کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظام خود بخود نہیں چل رہا بلکہ ایک ہستی ہے جو یہ نظام بدستور چلا رہی ہے، ورنہ غالب آنے والا مغلوب کو کبھی ابھرنے نہ دیتا۔ اس کے چلانے میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہیں ہے۔ اگر کوئی اور بھی اس میں دخل انداز ہوتا تو اپنے غالب کیے ہوئے عنصر کو مغلوب نہ ہونے دیتا۔ ایک قاعدہ اور ترتیب کے مطابق رات اور دن کا یہ انقلاب اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ایک قادر مطلق ہستی کے علاوہ یہاں کسی دوسرے کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

یہاں ﴿نَسۡلَخُ مِنۡهُ النَّهَارَ﴾ کے الفاظ ہیں۔ "سلخ" کے اصل معنی کھال کھینچنے کے ہیں جس میں اشارہ ہے کہ رات سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔ کھال کھینچنے میں یک بارگی نہیں ہوتی، ایسے ہی دن بھی آناً فاناً نہیں آجاتا بلکہ آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے گویا رات کو نور کی چادر اُڑھائی جا رہی ہو۔ اور رات آنے پر دن کی نورانی چادر کو ہم کھینچ لیتے ہیں تو پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

مگر قرآنِ مجید میں ایک جگہ بیان ہوا ہے کہ رات اور دن کا یہ انقلاب بڑی تیزی سے ہوتا ہے:

﴿يُغۡشِي الَّيۡلَ النَّهَارَ يَطۡلُبُهٗ حَثِيۡثًا﴾ ①

"رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے جو تیز چلتا ہوا اُس کے پیچھے چلا آتا ہے۔"

یہ تیزی اپنے اصل مدار میں ہے۔ ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ سورج اپنے پورے نظام کو لیے ہوئے ۲۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ زمین سے سورج کی دوری کی بنا پر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اسی لیے رات اور دن کے انقلاب میں آہستگی ہے، لہٰذا دونوں میں کوئی حقیقی منافات نہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوۡلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيۡلِ﴾ ② کی کیفیت بھی اسی طرح بیان کی ہے جیسا کہ سورۂ فاطر ③ میں ہم ذکر کر آئے ہیں۔

اسی طرح ﴿يُكَوِّرُ الَّيۡلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيۡلِ﴾ ④ "رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔" میں بھی یہی مفہوم ہے کہ یہ لپیٹنا یک بارگی اور آناً فاناً نہیں ہوتا بلکہ ایک ترتیب و ترکیب کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کر رہے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نورانی چادر نہ اوڑھائیں تو ہمیشہ رات چھائی رہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ الَّيۡلَ سَرۡمَدًا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ

---

① الأعراف:54 ② الحج:61 ③ فاطر:3 ④ الزمر:5

مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○ ﴾ ①

''کہہ کیا تم نے دیکھا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی روشنی لے آئے! تو کیا تم نہیں سنتے۔ کہہ: کیا تم نے دیکھا کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک دن کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے پاس کوئی رات لے آئے جس میں تم آرام کرو! تو کیا تم نہیں دیکھتے۔''

اس کے باوجود اگر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ سارا نظام خود بخود چل رہا ہے یا اس کے چلانے میں متعدد ہستیوں کا عمل دخل ہے تو یہ سراسر نامعقول بات ہے جو دلیل سے بالکل عاری ہے۔

گزشتہ آیت میں جو جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کرنے کا ذکر تھا، یہ رات دن بھی اسی جوڑے کی ایک صورت ہے بلکہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ ②

''اور ہر چیز سے ہم نے دو قسمیں بنائیں۔''

یعنی ہر کسی کی ضد اور مقابل چیز بنائی ہے کیوں کہ تقابل سے ہی خوبیوں کا پتا چلتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی ایک جگہ پر بھی صرف رات کو یا صرف دن کو نشانی قرار نہیں دیا گیا۔ اس کائنات میں یہ مجموعۂ اَضداد جو ایک ڈھب سے چل رہا ہے اور اس سے پوری کائنات مستفید ہو رہی ہے، کیا یہ کارسازی اس بات کی دلیل نہیں کہ اس مجموعۂ اَضداد کو ایک سلیقے سے چلانے والی ایک ہی قادرِ مطلق ہستی ہے۔

لیل و نہار کا یہ نظام جس طرح معبود کے ایک ہونے کی دلیل ہے اسی طرح یہ قیامت کے

---

① القصص: 72,71 ② الذاریات: 49

آنے کی بھی دلیل ہے، یعنی جو ہستی دن کو رات میں اور رات کو دن میں یوں تبدیل کر رہی ہے کہ دن کے آنے پر رات کہیں نظر نہیں آتی اور رات آنے پر دن کی روشنی کا نشان باقی نہیں رہتا۔ جو ہستی ایک کو ختم کر کے دوسرے کو لانے پر قادر ہے اور اپنی باری پر دوسرے کو ختم کر کے پھر پہلے کو لے آتی ہے تو وہ انسان کو موت دینے حتی کہ اس کے وجود کے آثار تک مٹا دینے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہیں ہو سکتی! گویا لیل و نہار کی آئے روز یہ تبدیلی حیات بعد الممات کی دلیل ہے۔ رات کی تاریکی موت اور قبر کی تاریکی کے مترادف ہے اور دن کی روشنی بہ منزلہ حیات کے ہے بلکہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ﴾ ①

''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے۔''

اس آیت میں رات کی نیند کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ تبدیلی تو تم روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو مگر موت کے بعد حیات پر یقین نہیں رکھتے۔

﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى﴾ ②

''کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے۔''

لیل و نہار کا یہ نظام اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس کارساز ہستی کا علم ذاتی اور ازلی ہے جس نے جب یہ نظام چلایا تو اسے آیندہ آنے والوں کی ضروریات و حاجات کا علم تھا۔ زمین و آسمان کو ایک متعین فاصلے پر رکھنا، سورج کو بھی ایک مقرر فاصلے پر رکھنا، زمین میں ہوا، پانی، آگ، حیوانات، نباتات اور جمادات حتی کہ مختلف معدنیات کا وجود بھی اس کے علم ذاتی و ازلی کی دلیل ہے کہ آیندہ اس میں بسنے والی مخلوق کی حیات کا یہ جزو لازم ہے۔ اگر زمین سے سورج کا فاصلہ کم ہوتا یا زیادہ ہوتا، دن اور رات کا آنا جانا بہت تیز یا سست رفتار ہوتا، اس میں باقاعدگی نہ ہوتی، کبھی اچانک دن نکل آتا اور کبھی آناً فاناً رات چھا جاتی تو

---

① الأنعام:60 ② القيامة:40

اس پر یہ نظامِ حیات برقرار نہ رہ سکتا۔ زمین وآسمان اور لیل ونہار کا جب سے یہ نظام اللہ تعالیٰ نے چلایا ہے تب سے اس میں بسائے جانے والوں کے لیے یہ اہتمام اس کے علمِ ذاتی وازلی کی روشن دلیل ہے کیوں کہ جس کا علمِ ذاتی ہوتا ہے اس پر نہ کوئی حالت مخفی ہوتی ہے اور نہ ہی اسے کوئی چیز عاجز کر سکتی ہے۔

ایک ترتیب کے ساتھ لیل ونہار کا یہ نظام اس بات کی بھی دلیل ہے کہ زمین گول ہے چپٹی نہیں، اگر زمین چپٹی ہوتی تو رات دن کے آنے میں یکبارگی اور تیزی ہوتی، آہستہ آہستہ رات دن میں اور دن رات میں داخل نہ ہوتا۔

﴿فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ﴾ دن کی نورانی چادر اُتر جانے اور رات کے چھا جانے پر اچانک وہ اندھیرے میں رہ جانے والے ہوتے ہیں، یعنی اب ان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ اندھیرے کو دور کر دیں۔ کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ رات کے اندھیرے کو دن کی روشنی میں تبدیل کر سکے اور اپنے آپ کو اندھیرے سے بچا لے بلکہ رات کی جگہ دن اور دن کی جگہ رات کی تبدیلی میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ رات آتی ہے تو اس کا اندھیرا سب پر چھا جاتا ہے، کوئی چاہے یا نہ چاہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ﴿اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ﴾ فرمایا ہے کہ ان کے لیے رات نشانی ہے اور اس پر سے دن کو کھینچ لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رات ہے، پھر دن ہے۔ اور سورج کی روشنی بہر حال حادث ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی رات اور دن کا ذکر ہوا ہے وہاں دن سے پہلے رات کا ذکر ہوا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ﴾ ①

''اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ②

---

① حم السجدۃ: 37 ② آلِ عمران:190

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔“

اس سے بھی علمائے کرام نے یہ سمجھا ہے کہ رات اصل ہے۔ رات دن کی مدت جو عموماً 24 گھنٹے رہتی ہے، اس کا آغاز رات سے ہوتا ہے۔ گویا رات مقدم ہے اور دن مؤخر ہے۔ سورج غروب ہونے پر جب ہلال نمودار ہوتا ہے تو تاریخ اور مہینے کا آغاز رات سے ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کا ہلال ہو یا عیدین کا، آغاز رات سے ہوتا ہے۔ صرف امت کی سہولت کے لیے ایام حج کی راتیں دنوں سے مؤخر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی کسی عذر کی وجہ سے 9 ذوالحج کو میدان عرفات میں نہیں پہنچ سکا بلکہ رات کو عرفات پہنچا اور صبح کی نماز مزدلفہ آ کر پڑھ لیتا ہے تو اس کا حج ہو جاتا ہے جیسا کہ ترمذی میں حضرت عروہ بن مُضَرِّس اور عبدالرحمٰن بن یعمر سے روایت ہے۔ ①

اسی طرح جمرات کو کنکریاں دن کو نہ ماری جا سکیں تو رات کو بھی ماری جا سکتی ہیں۔ طواف افاضہ بھی رات کو جائز ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن الله عزوجل خلق خلقه في ظلمة ثم ألقى عليهم من نوره يومئذ فمن أصابه من نوره يومئذ اهتدى، ومن أخطأه ضل، فلذلك أقول: جف القلم على علم الله عزوجل.)) ②

”اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ظلمت میں پیدا کیا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا، جس نے اس روز اس کے نور سے حصہ پالیا وہ ہدایت پا گیا اور جو نور کو نہ پا سکا گمراہ ہو گیا، اسی لیے میں تمھیں کہتا ہوں کہ قلم اللہ کے علم کے مطابق لکھ کر خشک ہو گیا ہے۔“

---

① ترمذي: 890,889

② (مسند أحمد: 197,176/2، السنة لابن أبي عاصم: 243، صحيح ابن حبان: 6136 وغيره)

یہ روایت مسند احمد میں دو اسناد سے مروی ہے، ان میں سے ایک سند کے راوی ثقہ ہیں اور اسے امام طبرانی ؒ اور بزار ؒ نے بھی روایت کیا ہے۔ ①

اس سے معلوم ہوتا ہے ظلمت پہلے ہے اور نور اس کے بعد۔ مگر امام ابن جریر ؒ نے امام ابن اسحاق ؒ کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور اور ظلمت کو پیدا کیا، پھر ان دونوں کو جدا کیا تو ظلمت کو رات بنا دیا اور نور کو روشن دن بنا دیا۔ ② واللہ اعلم

---

① مجمع الزوائد، 7/193،194

② البدایۃ: 1/9

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ [یٰسٓ: 40-38]

’’اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کردیں یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہوجاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لیے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔‘‘

رات دن کا انقلاب شمس وقمر کے آنے جانے سے وابستہ ہے، اس لیے اب اسی حوالے سے دونوں کا ذکر ہے۔

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ ’’اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے۔‘‘ عینی مشاہدے کی بنا پر زمانہ قدیم سے یہ تصور پایا جاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ سائنس دان ایک دور میں سورج کے چلنے کا انکار کرتے تھے مگر اب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظام کے ساتھ بیس کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔

﴿تَجْرِیْ﴾ یہ الجری سے ہے جس کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ ①

سورج کی اس تیزی کے بارے میں یہ اندازہ سائنس دانوں کا ہے، حقیقی رفتار تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ سورج کے حجم اور فوائد کی بنا پر عموماً اس کا ذکر چاند سے پہلے ہوا ہے۔

---

① مفردات

﴿مُسْتَقَرٍّ﴾ (ٹھکانا) اس سے مراد اُس کی جائے قرار ہے اور وہ عرش کے نیچے کی سمت ہے جو بجانب زمین ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آیت ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مستقرها تحت العرش.)) ①

''اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں کہ میں غروبِ آفتاب کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يا أبا ذر! أتدري أين تغرب الشمس؟)) قلت: الله ورسوله أعلم، قال: ((فإنها تذهب حتى تسجد تحت العرش فذلك قوله تعالى: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا)) ②

''اے ابوذر! کیا تمھیں معلوم ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے؟'' میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی خوب جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ چلتا ہے'' مفہوم ہے۔''

بلکہ صحیح بخاری ہی میں یہ بھی ہے کہ سورج چلتا ہے تا آنکہ وہ رب تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا اور واپسی کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اجازت عطا فرماتے ہیں تو وہ اپنے مستقر سے طلوع ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث میں ہے کہ روزانہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور طلوع کے لیے اجازت طلب کرتا ہے، اجازت پا کر نیا دور شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ نئے دور کی

---

① صحيح بخاري: 4802

② صحيح بخاري: 4801

اجازت طلب کرے گا مگر اسے اجازت نہیں ملے گی بلکہ اسے حکم ہوگا کہ جس جانب سے آئے ہو اسی جانب پلٹ جاؤ۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہوگی اور اس کے بعد قیامت کے دن تک جو ایمان لائے گا اس کا ایمان معتبر نہیں ہوگا اور اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ ①

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے "مستقر" سے مکانی مستقر مراد ہے جہاں اس کا ایک دور مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ مستقر عرش الٰہی کے نیچے ہے، وہاں سورج سجدہ کرتا ہے اور دوسرے دور کی اجازت طلب کرتا ہے اور اجازت ملنے پر دوسرا دور شروع کرتا ہے۔

سورج کا سجدہ کرنا:

قرآنِ پاک کی تعبیر میں ان احادیث پر مشاہدات اور ماہرین فلکیات کے بیان کی روشنی میں کئی اشکال وارد ہوتے ہیں:

1: ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنی رفتار ختم کر کے اپنے مستقر پر سجدہ ریز ہوتا ہے اور دوسرے دور کی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجازت ملتی ہے تو دوسرے دور کا آغاز کرتا ہے، حالانکہ سورج کی حرکت کا کسی وقت بھی انقطاع مشاہدے کے منافی ہے بلکہ سورج کا طلوع وغروب تو کسی نہ کسی مقام پر ہر وقت ہو رہا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر لحظہ وقفہ کرتا ہے اور رک رک کر آگے بڑھتا ہے۔

2: سورج کے سجدے کا مفہوم بھی مبہم ہے بلکہ طلوع وغروب میں ایک تسلسل ہے۔ ایک جگہ طلوع ہوتا ہے تو دوسری جگہ غروب ہو رہا ہوتا ہے تو غروب ہونے کے بعد سجدہ کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

3: عرش کے بارے میں قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں کو محیط ہے اور ساری مخلوق عرش کے نیچے ہے، پھر غروبِ آفتاب کے بعد عرش کے نیچے جانے کا مطلب کیا ہے؟

---

① فتح الباري: 542/8، ابن کثير

وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صَافَّاتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ﴾ ①

”کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔“

❀...... ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ ②

”ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں ہیں اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھے۔“

ساری مخلوق کی نماز اور تسبیح کیسی ہے؟ اس کی کیفیت بھی اسی کو معلوم ہے جس کی یہ تسبیح کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان کے سجدے کی حالت کو بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح سورج کے سجدہ کرنے اور اجازت لینے کی کیفیت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔

ہمارے مشاہدے کے مطابق آفتاب طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے، اسی مشاہداتی پہلو کو ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ﴾ ③

”یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) سورج غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے۔“

یہ بھی ذوالقرنین کے مشاہدے کے مطابق ہے کہ وہ زمین کے مغربی جانب وہاں

---

① النور:41 ② الإسراء:44 ③ الكهف:86

وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ①

''کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے۔''

❀...... ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ②

''ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ بھی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں ہیں اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھے۔''

ساری مخلوق کی نماز اور تسبیح کیسی ہے؟ اس کی کیفیت بھی اسی کو معلوم ہے جس کی یہ تسبیح کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان کے سجدے کی حالت کو بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اسی طرح سورج کے سجدہ کرنے اور اجازت لینے کی کیفیت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔

ہمارے مشاہدے کے مطابق آفتاب طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے، اسی مشاہداتی پہلو کو ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ ③

''یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) سورج غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو اسے پایا کہ وہ دلدل والے چشمے میں غروب ہو رہا ہے۔''

یہ بھی ذوالقرنین کے مشاہدے کے مطابق ہے کہ وہ زمین کے مغربی جانب وہاں

---

① النور:41 ② الإسراء:44 ③ الكهف:86

تک پہنچے جہاں آگے دلدل تھی اور انھیں یہی نظر آیا کہ سورج اس دلدل میں غروب ہو رہا ہے۔ کہاں سورج اور کہاں دلدل! قرآن پاک نے ﴿وَجَدَهَا تَغْرُبُ﴾ فرمایا ہے، "کانت تغرب" تو نہیں فرمایا۔ اسی طرح انسان کو مشاہداتی طور پر آفتاب طلوع ہوتا اور غروب ہوتا نظر آتا ہے، ورنہ حقیقت میں زمین پر اس کے ڈوبنے کی کوئی جگہ نہیں۔ اور حدیث میں ڈوبنے اور سجدہ ریز ہونے کا ذکر "تحت العرش" ہے۔

عرشِ عظیم زمین اور ساتوں آسمانوں کو محیط ہے بلکہ کرسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾ ①

"اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے ایک چھلا چٹیل میدان میں ہو۔ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کرسی عرش کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے ایک لوہے کا چھلا چٹیل میدان میں ہو۔ ②

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اس خلا کی وسعتوں کا اندازہ کیجیے کہ اس میں ایسے سیارے بھی ہیں تخلیق سے لے کر اب تک جن کی روشنی زمین پر نہیں پہنچی۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ جو اَجرامِ فلکی موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں ان کی روشنی زمین تک پہنچنے میں دس کروڑ سال لگ سکتے ہیں۔ اتنی وسیع و عریض فضا میں سورج کے تحت العرش سجدہ کرنے اور دورِ ثانی کے لیے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرنے کی کیفیت کو حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جو آلات و تجربات ابھی تک ساری کائنات کے مشاہدے سے قاصر ہیں ان کے ذریعے اگر سورج کی اس حالت کو سمجھنے میں بظاہر مشکل پائی جاتی ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔

---

① البقرۃ:255 ② ابن کثیر:1/415

سورج کے بارے میں یہ بات بھی قرآنِ مجید سے ثابت ہوتی ہے کہ اس کا مطلع ایک نہیں بلکہ ہر روز نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے طلوع وغروب کی سمت مشرق ومغرب ہے مگر یہ نت نئے زاویے سے طلوع وغروب ہوتا ہے۔ سردی وگرمی میں مطالع ومغارب کا یہ اختلاف بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی کو ایک مقام پر ﴿رَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ﴾ ① کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی ہے اور ماہرین فلکیات بھی یہی کہتے اور بتلاتے ہیں کہ سورج کے 360 یا 365 مطالع ہیں، اس لیے کیا بعید ہے کہ جب ایک مطلع کا دور پورا ہوتا ہے تو دوسرے مطلع پر طلوع ہونے کی اجازت لے کر طلوع ہوتا ہو، گویا یہ مطالع اس کے ''مستقر'' ہیں۔

ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ سورج جو عرش عظیم کے زیر سایہ ہے وہ اپنے دائرے میں حرکت کرتا اور تسلسل سے غروب ہوتا اور طلوع ہوتا ہے اور ہر لحظہ آگے بڑھنے کے لیے اذن طلب کرتا ہے، بال برابر بھی اس کی حرکت اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ اس کی یہ حرکت ﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ یعنی ایک قادر مطلق اور علیم وخبیر ذات کے حکم کے تابع ہے۔

شمس وقمر اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت کی نشانیاں ہیں، گویا یہ مظاہر قدرت الٰہیہ میں سے ہیں اور سرِ مُو حکم الٰہی سے انحراف نہیں کرتے۔ ان مظاہرِ قدرت کو انسان نے اپنی غفلت اور جہالت کی بنا پر قادر و مقتدر سمجھ لیا اور بڑا سمجھ کر انھیں معبود بنا لیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے کہ وہ تو قادر مطلق کے حکم سے چل رہے ہیں اور ان کی ایک ایک حرکت اللہ کی اجازت سے ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ سورج آگے بڑھنے کی اجازت طلب کرے گا مگر اسے اجازت نہیں ملے گی، حکم ہوگا کہ واپس پلٹ جاؤ تو وہ الٹی سمت از جانب مغرب طلوع ہوگا۔ یہ قربِ قیامت کی علامت ہوگی کہ اب پہلا نظام الٹ دیا جائے

---

① المعارج 40:

گا۔ تب کسی کا بھی ایمان معتبر نہ ہوگا اور توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا۔

مستقر کا دوسرا مفہوم:

دوسرا مفہوم جسے امام قتادہؒ نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ یہاں مستقر زمانی مراد ہے اور وہ قیامت کا دن ہے، یعنی یہ سورج اپنے وقت مقررہ کی طرف بڑھ رہا ہے، یہ اپنی رفتار یوں ہی جاری و ساری رکھے گا، ایک لمحہ بھی اس میں تعطل نہیں آئے گا مگر یہ سب حرکت ایک وقت مقرر تک ہے۔ قرآنِ مجید سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِي لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ﴾ ①

''اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے، ہر ایک مقرر وقت کے لیے چل رہا ہے۔ سن لو! وہی سب پر غالب، نہایت بخشنے والا ہے۔''

اس آیت میں شمس و قمر کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ دونوں ایک مقرر وقت کے لیے چل رہے ہیں، یعنی ان کی یہ حرکت ایک میعادِ معین پر پہنچ کر ختم ہو جائے گی۔ اور یہ میعادِ مقرر قیامت کا دن ہے۔ یہاں ﴿اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ سے مراد مقررہ مقام بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ اوپر حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔

علامہ رازیؒ نے اس کے علاوہ بھی شمس و قمر کے مستقر کی توجیہات بیان کی ہیں مگر حدیث میں اس کی وضاحت کے بعد دیگر تمام توجیہات کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ سورج کی یہ حرکت جو مقرر و متعین مدار میں ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر کے بغیر مسلسل ہو رہی ہے، یہ اپنے مدار سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹتا

---

① الزمر 5:

حتیٰ کہ کہا گیا ہے کہ اگر یہ اپنے مدار سے معمولی سا اوپر ہو جائے تو برودت (ٹھنڈک) بڑھ جائے اور اگر معمولی سا نیچے آ جائے تو اس کی تپش سے ہر چیز جل جائے۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ نظام خود کار طریقے سے نہیں چل رہا بلکہ یہ ایک غالب قادرِ مطلق اور ہر چیز کا پوری طرح علم رکھنے والے کے اندازے اور فیصلے کے مطابق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ سورج کا بُعد زمین سے کتنا ہونا چاہیے۔

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ﴾ منازل، منزل کی جمع ہے جس کے معنی جائے نزول کے ہیں۔ سورج کی طرح چاند بھی اپنے مدار میں چل رہا ہے اور اللہ نے اس کی منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ چاند اپنا دورہ ایک ماہ میں مکمل کرتا ہے، اس لیے اس کی 29 یا 30 منزلیں ہیں۔ عموماً چاند ایک یا دو دن نظر سے غائب ہوتا ہے، اس لیے رؤیت کے اعتبار سے عموماً 28 منزلیں کہی جاتی ہیں۔ اہل ہیئت اور قدیم جاہلینِ عرب نے ان منزلوں کے نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھے ہیں جو ان منازل کے محاذات میں ہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے ان منازل کے درج ذیل نام ذکر کیے ہیں:

(1) سرطان، (2) بطین، (3) ثریا، (4) دبران، (5) ہقعہ، (6) ہنعہ، (7) ذراع، (8) نثرہ، (9) طرف، (10) جبہہ، (11) خراتان، (12) صرفہ، (13) عواء، (14) سماک، (15) غفر، (16) زبانیان، (17) اکلیل، (18) قلب، (19) شولہ، (20) نعائم، (21) بلدہ، (22) سعد الذابح، (23) سعد بلع، (24) سعد السعود، (25) سعد الاخبیہ، (26) الفرغ المقدم، (27) الفرغ المؤخر، (28) بطن الحوت۔

چاند یہ منزلیں 28 راتوں میں طے کرتا ہے۔ آخری منزل پر پہنچنے کے بعد ایک یا دو دن نظر نہیں آتا، پھر ہلال کی صورت میں طلوع ہوتا ہے اور اپنی منزلوں کا سفر شروع کر دیتا ہے۔ یہ اٹھائیس منزلیں بارہ برجوں پر مشتمل ہیں اور ہر برج کے لیے دو منزلیں اور ایک تہائی منزل ہے، مثلاً: برج حمل کے لیے سرطان، بطین اور ثریا کا ایک تہائی ہے۔ اور برج ثور کے لیے دو تہائی ثریا کی اور بردان اور دو تہائی ہقعہ کی ہیں۔ اسی طرح تمام منزلیں اسی حساب سے طے کرتا ہے۔ ①

---

① قرطبی: 15/29-31

چاند کی طرح سورج کی بھی منزلیں مقرر ہیں اور اس کی یہ منزلیں ایک سال میں مکمل ہوتی ہیں۔ دونوں کی منزلوں کا ذکر سورۂ یونس میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ﴾ ①

''وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔''

یہاں ﴿قَدَّرَهٗ﴾ میں ضمیر مفرد کا ذکر ہے مگر مراد دونوں ہیں۔ اور قرآنِ مجید میں ہی اس کی مثالیں موجود ہیں، چنانچہ ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَیْهَا﴾ ②

''اور جب وہ کوئی تجارت یا تماشا دیکھتے ہیں تو اٹھ کر اس کی طرف چلے جاتے ہیں۔''

یہاں بھی ﴿تِجَارَةً﴾ اور ﴿لَهْوًا﴾ کے بعد ﴿اِلَیْهَا﴾ میں ''ھا'' ضمیر مفرد ہی ہے مگر اس سے مراد دونوں کی طرف چلے جانے کے ہیں۔ یہاں بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ گو منزلیں تو شمس و قمر دونوں کی مقرر ہیں مگر یہاں صرف چاند کی منزلیں بیان کرنا مقصود ہے کہ اس سے ماہ و سال کا حساب متعین ہوتا ہے۔ چاند کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج کون سی تاریخ ہے جب کہ سورج کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ آج رواں مہینے کی فلاں تاریخ ہے۔ سورج کے حساب سے ماہ و ایام مقرر کیے جاتے ہیں جب کہ چاند سے مشاہدے کی بنیاد پر ماہ و ایام کی تعیین ہو جاتی ہے۔

﴿كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ﴾ چاند اپنی منزلیں طے کرتا ہوا بالآخر کھجور کی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ ''العرجون'' کھجور کے خوشے کی ڈنڈی کو کہتے ہیں جو خشک ہو

---

① یونس:5 ② الجمعۃ:11

کر خم دار ہو جاتی ہے۔ کھجور کی ایسی ڈنڈی کی شکل اسی طرح کی ہو جاتی ہے جس طرح چاند کی پہلی اور آخری تاریخوں میں ہوتی ہے۔

چاند کا یہ سفر جو روزانہ ایک ترتیب کے مطابق ہزاروں سال سے باقاعدہ جاری وساری ہے یہ بھی اس حقیقت کی دلیل ہے کہ یہ قادر مطلق اور علیم وخبیر کی قدرت کا نتیجہ ہے۔ یہ چاند خود کار طریقے سے نہیں چل رہا بلکہ ایک قادر مطلق ہستی اسے چلا رہی ہے اور یہ اپنا سفر اور اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک کھجور کی خشک ٹہنی کی طرح خمیدہ ہو جاتا ہے۔ جس کی اپنی یہ پوزیشن ہے کہ وہ اپنی آب وتاب کو برقرار نہیں رکھ سکتا، اس کی پرستش میں کوئی معقولیت رہ جاتی ہے؟

چاند کی یہ صورت کہ اس کی ابتدا معمولی وجود سے ہوتی ہے، پھر وہ دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے اور اس کی روشنی پھیلتی جاتی ہے حتی کہ بدر کامل بن جاتا ہے، پھر بمصداق ''ہر کمالے را زوالے'' گھٹنا شروع ہو جاتا ہے تا آنکہ کھجور کے خوشے کی خشک ڈنڈی کی طرح خم دار ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو یہی کیفیت انسان کی ہے۔ پیدائش کے بعد پہلے کمزور بچے کی صورت میں، پھر آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہوا شباب کو پہنچتا ہے، پھر ناتوانی کا دور شروع ہو جاتا ہے اور نحیف ونزار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً﴾ ①

''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا۔''

جو ذات چاند کے کمزور ہو جانے حتی کہ آنکھ سے اوجھل ہو جانے کے بعد دوبارہ اسے زندگی دینے پر قادر ہے وہی انسان کو کمزور ہو جانے اور قبر میں چلے جانے کے بعد دوبارہ

---

① الروم 54:

زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا مظاہرہ ہر انسان ہر ماہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ 'القدیم' کا اطلاق یہاں مخلوق پر ہوا ہے، اکثر متکلمین اسے اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی قرآن پاک اور آثار صحیحہ سے لفظِ قدیم کا اسمائے حسنیٰ میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے وصف میں "یا قدیم الاحسان" استعمال ہوا ہے ①

لغت عرب میں قدیم کا اطلاق جدید اور حادث کے تقابل میں ہوتا ہے۔ ﴿ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴾ میں بھی پرانی ٹیڑھی ٹہنی تبھی کہا جاتا ہے جب نئی شاخ نکل آتی ہے۔ بلاشبہ قدیم کا لفظ تقدم کے لیے مستعمل ہے اور جو ذات تمام حوادث سے متقدم ہو وہ تقدم کی زیادہ حق دار ہے۔ اسی بنا پر شیخ جنید بغدادی فرماتے ہیں: "افراد القدیم عن الحدث" قدیم کو حادث سے جدا کرنا توحید و تصوف ہے۔ ②

حادث قدیم کا ہم جنس نہیں ہو سکتا جب قدیم محدث کا محتاج نہیں تو محدث کے وجود کے بعد بھی قدیم اس کا محتاج نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود "قدیم" کو اسمائے حسنیٰ میں شمار نہیں کیا گیا کیونکہ یہ تمام حوادث سے تقدم کے لیے خاص نہیں بلکہ تقدم شرف و فضل کے لیے بھی مستعمل ہے۔ "قدیم" کی بجائے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں "اوّل" اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ علامہ طحاویؒ نے جو اللہ تعالیٰ کی صفات ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "قدیم بلا ابتدا" کہ وہ قدیم ہے جس کی ابتداء نہیں۔ یہی مفہوم "اوّل" کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز اس کی طرف لوٹتی ہے اور اسی کے تابع فرمان ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ہیں مگر ہر اچھا نام اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک نہیں۔ ③

---

① مفردات ② سیر اعلام النبلاء 69/14 ، کشف المحجوب
③ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص 113

﴿لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ سارا نظام اس طرح اپنے کنٹرول میں کر رکھا ہے سورج کی کیا مجال کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر اور اپنی مقررہ رفتار کو ختم کر کے چاند تک پہنچ جائے اور اس سے ٹکرا جائے یا یہ کہ چاند طلوع ہو کر اپنا نور بکھیر رہا ہو تو اچانک سورج طلوع ہو جائے۔ جب چاند روشن ہوگا تو سورج نہیں ہوگا اور جب سورج چمکتا ہے تب چاند نہیں ہوتا۔

﴿وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ ایسا بھی ممکن نہیں کہ دن کے لیے مقرر وقت ختم ہونے سے پہلے رات چھا جائے بلکہ سورج اور چاند اپنے اپنے وقت مقرر پر آتے جاتے ہیں اور اسی ترتیب سے لیل و نہار کا یہ نظام برس ہا برس سے قائم ہے، ایک سیکنڈ کے لیے بھی اس میں تقدیم ہے نہ تاخیر۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کو چلانے والی صرف ایک ہی قادر مطلق ہستی ہے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور بھی اس نظام کے چلانے میں اس کا شریک ہوتا تو یہ دنیا، جو مجموعہ اضداد ہے، ایک ڈھب پر قائم نہ رہتی۔

﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ یہ شمس و قمر اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔ یہاں ﴿كُلٌّ﴾ دراصل "كلُّ واحدٍ" تھا، اضافت کو حذف کر کے ﴿كُلٌّ﴾ پر تنوین دی گئی ہے اور معنی یہ ہیں: دونوں میں سے ہر کوئی اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ "کل" کا تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا، اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے، مثلاً: کہا جاتا ہے زید وعمرو کل جاء، یا، کل جاءوا. یعنی تثنیہ کے ساتھ نہیں ہوتا، چنانچہ "زید وعمرو کل جاءا" نہیں کہا جاتا۔ "فلك" کے معنی ہیں: سورج، چاند اور ستاروں کا مدار اور چلنے کی جگہ۔ ①

اور ﴿يَسْبَحُونَ﴾ "السبح" سے ہے جس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں، یعنی شمس و قمر میں سے ہر ایک اور باقی تمام سیارے اپنے

---

① مفردات

اپنے دائروں میں بڑی تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سیارے اپنے اپنے مدار میں نہایت سبک رفتاری سے تیر رہے ہیں۔ اوران کے تیرنے کی کیفیت ایسی ہے جیسے ہوا میں یا پانی وغیرہ سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض نے تو کہا ہے کہ آسمان کے نیچے ہوا کا مدار ہے جس میں یہ سیارے تیر رہے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ ﴿يَسْبَحُونَ﴾ کے اصل معنی کے عین مطابق ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سیارے آسمان کے اندر نہیں جیسا کہ بطلیموس کا خیال تھا بلکہ آسمان کے نیچے اپنے اپنے مدار میں ہیں۔ سیارے جن کی تعداد کا سائنس کی تمام تر ترقی کے باوجود علم نہیں ہو سکا، ان تمام کا اپنے اپنے مدار میں تیرنے سے خلا کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس حوالے سے شائقین ''تہذیب جدید کا چیلنج''، ''قرآن اور کائنات'' اور تفہیم القرآن ① ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کا مقصد علم ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں بلکہ یہ سمجھانا ہے کہ یہ وسیع وعریض نظام ایک قادر مطلق ہستی نے بنایا ہے جس میں کوئی اس کا سہیم وشریک نہیں اور یہ سب مظاہر قدرت ہیں اور ایسے مسخر ومحکوم ہیں کہ بال برابر بھی اپنے اپنے دائرے سے انحراف نہیں کرتے۔ بعض انسانوں نے اپنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے انھی کو اپنا معبود بنایا جب کہ اسلام نے انھیں خبردار کیا کہ یہ تو بجائے خود اللہ کی قدرت کاملہ کا مظہر اور اس کی توحید کی عظیم نشانیاں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انسانوں کے لیے خادم بنایا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے: ﴿لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا﴾ یعنی سورج کے لیے ممکن نہیں کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ رات دن سے سبقت لے جائے۔ ﴿يَنبَغِي﴾ کا لفظ قرآن مجید میں امر محال اور ناممکن اور نامناسب کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا:

---

① تفہیم القرآن: 261/4

﴿وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا﴾ ①

"حالانکہ رحمان کے لائق نہیں کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔"

ایک اور مقام پر اللہ کے سوا جن کی پرستش ہوتی ہے ان کے بارے میں ہے:

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ﴾ ②

"وہ کہیں گے: تُو پاک ہے، ہمارے لائق نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی بھی طرح کے دوست بناتے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن الله عز وجل لا ينام ولا ينبغي له أن ينام.)) ③

"بے شک اللہ عز وجل نہیں سوتے اور نہ سونا اس کے لیے مناسب ہے۔"

بلاشبہ یہ ناممکن ومحال ہے کہ سورج تیز تیز چل کے چاند کو جالے یا رات دن سے سبقت لے جائے کہ دن کے ہوتے ہوئے آناً فاناً رات آ دھمکے۔ جب سے دن رات کا یہ نظام قائم ہوا ہے اس وقت سے اب تک یہ نظام اسی طرح ایک ترتیب سے چل رہا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اس ترتیب میں تبدیلی محال اور مشکل نہیں۔ وہ جب چاہے اس میں تبدیلی پیدا کرنے پر قادر ہے جیسے مشرکین مکہ کے اس مطالبے پر کہ ہمیں اپنی صداقت کی نشانی دکھلائی جائے تو رسول اللہ ﷺ کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ④

یا جیسے حضرت یوشع بن نون نے جہاد کے دوران جب کہ نماز عصر یا اس سے کم وقت غروب آفتاب میں تھا، فرمایا:

«أنت مأمورة وأنا مأمور اللهم احبسها علي شيئا.»

---

① مریم:92 ② الفرقان:18

③ صحیح مسلم: 179

④ صحیح بخاری: 3637، 3869 وغیرہ

''اے سورج! تُو بھی حکم کا پابند ہے اور میں بھی حکم کا پابند ہوں، اے اللہ! اسے میری خاطر کچھ وقت کے لیے روک دے۔''

چنانچہ سورج ٹھہر گیا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح عطا فرمائی۔ ①

اس لیے ان تکوینی امور میں کسی انسان کا تو کوئی عمل دخل نہیں لیکن جس ہستی نے یہ نظام بنایا ہے اس کے لیے اس میں تبدیلی کوئی امر محال نہیں۔ وہ جب بھی کوئی کام سرانجام دینا چاہتا ہے کلمہ ﴿کُنْ﴾ کہتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے:

﴿اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ②

سیدنا علی اور ردِّ شمس

یہاں اس روایت کے بارے میں بھی مختصراً اشارہ ضروری ہے جو حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی کام کے لیے بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھ لی تھی۔ آپ اپنا سرمبارک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی گود میں رکھ کر آرام فرمانے لگے تا آنکہ سورج غروب ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: علی! تم نے نماز پڑھ لی؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ! تیرا بندہ علی رضی اللہ عنہ تیری اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں تھا، سورج کو لوٹا دے۔ چنانچہ سورج واپس پلٹ آیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے وضو کیا، عصر کی نماز پڑھی تو سورج غروب ہو گیا۔ ③

شیخ ابوالحسن الفضلی، ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ الحسکانی، محمد بن اسعد بن علی الجوانی، علامہ سیوطی، اور محمد بن یوسف الدمشقی نے اس کے طرق و اسانید پر مستقل رسائل لکھے ہیں۔ امام

---

① صحیح مسلم: 4555 ② یٰسٓ: 82

③ مشکل الآثار 94,92/3، طبرانی: 51/24 وغیرہ

احمد بن صالح مصری، علامہ طحاوی، قاضی عیاض، علامہ سیوطی، ابوقاسم الحسکانی اس روایت کو صحیح اور قابل اعتبار قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری ① میں اسے نقل کر کے امام حسین الجوزقانیؒ، اور حافظ ابن تیمیہؒ کی تردید کی ہے۔ جنھوں نے اسے باطل اور موضوع قرار دیا ہے، مگر اس کی تصحیح یا تحسین کی صراحت نہیں کی۔ حالانکہ امام جوزقانی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہی نہیں بلکہ امام ابن عساکر، حافظ محمد بن ناصر البغدادی، حافظ محمد بن حاتم بن زنجویہ، علامہ ابن الجوزی، علامہ ابن حزم، محمد بن عبید الطنافسی، یعلی بن عبید الطنافسی، علامہ ابوالحجاج المزی، حافظ ذہبی، علامہ ابن قیم، علامہ ابن کثیرؒ رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسے موضوع اور منکر قرار دیا ہے۔ بلکہ امام احمدؒ اور علی بن مدینیؒ نے لَا اَصْلَ لَہٗ اور امام ابوحنیفہؒ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ ② میں اس کی اسانید پر بحث کی ہے، اور ائمہ ناقدین کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں اور فرمایا ہے: ''یہ حدیث اپنے تمام طرق کے باوجود ضعیف اور منکر ہے۔ اس کی کوئی سند شیعہ اور مجہول الحال یا شیعہ اور متروک راوی سے خالی نہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے کہا ہے: اس حدیث کی اسانید ساقط ہیں، اگر سیدنا علیؓ کی نماز عصر رہ جانے کے لیے سورج کا پلٹ آنا صحیح ہوتا تو غزوہ خندق ③ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے سورج کا پلٹنا بالا ولیٰ ہوتا۔ جس میں آپؐ (بلکہ باقی صحابہ کرام بشمول حضرت علیؓ) کی بھی نماز عصر قضا ہوگئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے لیے بڑے غمگین ہوئے۔ مشرکین کے لیے بددعا کی۔

پھر اگر زیر بحث روایت کی رُو سے سورج پلٹ آیا تھا تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب سورج غروب ہوگیا تھا تو عصر کا وقت ختم ہوگیا اور مغرب کا وقت شروع ہوگیا، روزہ داروں نے روزہ افطار کرلیا۔ مسلمانوں نے نماز مغرب پڑھ لی، دریں صورت اگر سورج پلٹ آیا تھا تو صحابہ کرام کا روزہ اور نماز خلط ملط ہوگئی اور سیدنا علیؓ کے لیے بھی اس

---

① فتح الباری 121,122/6

② البدایہ 78,87/6

③ ایک سفر میں صبح کی نماز رہ گئی، سورج طلوع ہوگیا۔ مگر سورج کو لوٹایا نہ گیا۔

کالوٹنا کوئی سودمند نہ ہوا، کیونکہ سورج کے پلٹنے سے نماز اپنے وقتِ ادا میں تو نہ ہوئی۔ ①
پھر یہ عظیم واقعہ اگر رونما ہوا ہوتا تو تواتر سے نقل ہوتا جیسے اسی نوعیت کے دوسرے واقعات کا ذکر ہوا ہے۔ جیسے طوفان نوح علیہ السلام ہے اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ ہے۔ ②

غزوہ خیبر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں اسے جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے، اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے محبت کرتے ہیں۔ یہ حدیث متعدد صحابہ کرام سے صحاح، سنن، مسانید میں متعدد صحیح اسانید سے مروی ہے۔ مگر عجیب معاملہ ہے کہ خیبر میں اس عجیب واقعہ کی راویہ سیدہ اسماء ہیں اور وہاں چودہ سو صحابہ میں سے کسی اور صحابی کی قابل ذکر سند سے یہ روایت منقول نہیں، اور سیدہ اسماء کی روایت بھی متداول صحاح وسنن ومسانید میں مذکور نہ ہو، ایں چہ بو العجبی است۔

حضرت اسماء کی یہ روایت سنداً ومتناً مضطرب ہے۔ علامہ سیوطی نے جو اس کے دفاع کی کوشش کی ہے، علامہ عبدالرحمٰن المعلی نے الفوائد المجموعہ ③ میں اس کا تار و پود تار تار کر دیا ہے۔ شیخ شعیب الارناؤط نے بھی مشکل الآثار کے حواشی میں اسے ضعیف قرار دیا ہے اور شیخ ابوغدہ نے تو فرمایا ہے کہ جو شخص شیخ ابن تیمیہ کے کلام پر مطلع ہوگا وہ یقین کر لے گا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ ④

---

① یہ صورت اب یوں پیش آ سکتی ہے کہ سورج غروب ہوا، نماز عصر رہتی تھی، ہوائی جہاز میں سوار ہوا، فضا میں پہنچا تو سورج نظر آ گیا۔ اب اگر وہ عصر کی نماز پڑھ لے تو وہ ادا نہیں قضا ہی ہوگی۔

② تنزیہ الشریعہ ص 379/1

③ الفوائد المجموعہ ص 355,350

④ حاشیہ المنار المنیف: ص 59 وحاشیہ المصنوع ص 218، شائقین اس کی تفصیل کے لیے مزید ملاحظہ فرمائیں: منہاج السنۃ (186,194/2)، البدایہ والنہایہ: 77,87/6، نسیم الریاض: 10,14/3، الموضوعات لابن الجوزی: 355،357/1، الاباطیل للجوزقانی: 158/1، کشف الخفاء 220,428/1، المقاصد الحسنۃ: ص 226، اللآلی المصنوعہ: 158/1، الفصل لابن حزم: 78/2، 3,4/5، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ: 395,401/1، انیس الساری فی تخریج احادیث فتح الباری 3076,3085/4، رقم: 2067۔

ایک اور حدیث:

اسی موضوع سے متعلق ایک اور حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورج کو حکم دیا تو وہ ایک ساعت دیر سے طلوع ہوا۔ ①

یہ روایت اس پس منظر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج سے واپسی پر قریش کو قافلے کے آنے کی خبر دی کہ وہ سورج طلوع ہونے کے قریب مکہ مکرمہ پہنچ جائے گا۔ قافلے کے آنے میں تاخیر ہوئی تو آپؐ نے سورج سے فرمایا کہ وہ کچھ دیر سے طلوع ہو۔ مگر یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد ② میں اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری ③ میں اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے مگر یہ قطعاً درست نہیں۔

اوّلاً: اس لیے کہ اس میں ابوالزبیر مدلس ہے اور روایت معنعن ہے۔ خود حافظ ابن حجرؒ نے اسے طبقات المدلسین ④ میں "مشهور بالتدليس" قرار دیا ہے۔ اسی طرح تقریب ⑤ اور مقدمہ فتح الباری ⑥ میں بھی اسے مدلس کہا ہے۔ امام حاکم نے ایک حدیث کو "على شرط الشيخين" کہا تو حافظ ابن حجر نے ان پر نقد کرتے ہوئے کہا:

«وهم لأن أبا الزبير ليس من شرط البخاري وقد عنعن فهو علة هذا الخبر» ⑦

کہ یہ امام حاکم کا وہم ہے کیونکہ ابوالزبیر بخاری کی شرط پر نہیں اور اس نے اسے عن سے روایت کیا ہے، تو اس حدیث کی یہ علت ہے۔ اس لیے جب یہاں بھی یہ علت موجود ہے تو اس کی سند حسن کیونکر ہو سکتی ہے۔

---

① طبرانی اوسط: 5 / 32 رقم 4151
② مجمع الزوائد: 297/8
③ فتح الباری: 221/6
④ طبقات المدلسین: ص 108
⑤ تقریب: ص 470
⑥ مقدمہ فتح الباری: ص 463،442
⑦ التلخیص 113/2

ثانیاً: اس کا راوی ولید بن عبدالواحد التیمی ہے، جسے تنہا ابن حبان نے الثقات ① میں ذکر کیا ہے۔تهذیب، میزان ، لسان، الجرح والتعدیل، التاریخ الکبیر، اور التعجیل وغیرہ متداول کتب میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ علامہ ہیثمی کا اسلوب ہے کہ وہ ابن حبان کی توثیق پر اعتماد کر کے سند کو حسن یا راوی کو ثقہ کہہ دیتے ہیں، جب کہ حافظ ابن حجر تنہا ابن حبان کی توثیق پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ توثیق کے بارے میں ابن حبان کے موقف کو ''مذهب عجیب'' ② قرار دیتے ہیں۔ یعنی ابن حبان کا یہ عجیب مذہب ہے کہ مجہول راویوں کو جن سے ثقہ نے روایت کی ہو، ثقات میں ذکر کر دیتے ہیں۔ نیز دیکھیے لسان ③ ابوسلمۃ الجہنی کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ مگر حافظ فرماتے ہیں: ''والحق انه مجهول الحال'' ④ اس لیے ولید بن عبدالواحد کو بھی تنہا ابن حبان کا کتاب الثقات میں ذکر کرنا اس کی توثیق نہیں بلکہ وہ مستور ہے۔ اس لیے اس روایت کی سند کو حسن کہنا خود حافظ ابن حجر کے مسلمات کی روشنی میں درست نہیں۔

---

① الثقات: 224/9
② لسان: 1/ 14
③ لسان: 492/1
④ لسان: 7/ 57

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ○ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ○ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ○ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ○﴾ [يٰسٓ: 41-44]

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ بے شک ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی کئی اور چیزیں بنائیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، پھر نہ کوئی ان کی فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جائیں۔ مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانے کی وجہ سے۔''

پہلی آیات میں زمین وآسمان، شمس وقمر اور ان کے اپنے مدار میں گھومنے اور اس حوالے سے رات اور دن میں پائی جانے والی اللہ کی نشانیوں اور اس کی قدرت کی علامات کو بیان کرنے کے بعد اب سمندروں میں کشتیوں کے تیرنے کے حوالے سے اللہ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ان کے لیے ہماری قدرتِ کاملہ پر مذکورہ روشن نشانیوں کے علاوہ یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو ایک کشتی میں سوار کیا۔ ''ذریۃ'' کے اصل معنی چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں اس کا اطلاق چھوٹی بڑی ساری اولاد پر ہوتا ہے جب کہ علامہ واحدی اور ابو عثمانؒ نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق والدین اور اولاد دونوں پر ہوتا ہے۔ ①

علامہ ابن عطیہؒ نے اگرچہ اسے تخلیط کہا ہے اور لغت کے منافی قرار دیا ہے۔ ② مگر

---

① فتح القدير ② البحر المحيط

یہ درست نہیں، علامہ زبیدیؒ نے بھی اپنے شیخ سے یہی نقل کیا ہے کہ ''ذریۃ'' کا اطلاق اولاد اور آباء دونوں پر ہوتا ہے اور یہ حروفِ اضداد میں سے ہے۔ علامہ ابوعثمانؒ کی طرح انھوں نے بھی اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ ①

یہی قول علامہ قرطبیؒ اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ضحاکؒ، قتادہؒ اور ابن زیدؒ نے ﴿الْفُلْكِ﴾ یعنی کشتی سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مراد لی ہے۔ اشارہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اللہ کی قدرت کی عظیم نشانی ہے جو نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں، ان کے ضروری سامان اور ہر قسم کے نر اور مادہ جانوروں سے بھری ہوئی تھی، جیسے فرمایا:

﴿قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ②

''ہم نے کہا: اس میں ہر چیز میں سے دو قسمیں نر و مادہ دونوں کو اور اپنے گھر والوں کو سوار کر لے، سوائے اس کے جس پر پہلے بات ہو چکی، اور ان کو بھی (سوار کر لے) جو ایمان لے آئے اور اس کے ہمراہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی ایمان نہیں لایا۔''

یہ سفینۂ نوح علیہ السلام پہاڑوں جیسی بلند و بالا موجوں کے دوش پر چلا جا رہا تھا۔ اس پر اللہ نے ان کے آباء کو بلکہ نسلِ انسانی کو سوار کیا کیونکہ فی الحقیقت قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس پر سوار تھے، وہ اس طرح کہ طوفانِ نوح علیہ السلام سے صرف وہی محفوظ رہے تھے جو کشتی پر سوار تھے، پھر انھی کی اولاد سے آگے نسلِ انسانی چلی۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام کو نسلِ انسانی کا آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ﴾ ③

''اور ہم نے اس کی اولاد ہی کو باقی رہنے والا بنا دیا۔''

---

① تاج العروس: 224/3، مادہ: «ذ ر»

② ھود:40 ③ الصافات:77

اسی آیت کے بارے میں ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ ﴿ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ میں "ھم" ضمیر سے مراد اہلِ مکہ نہیں بلکہ انسان ہیں اور "ذریة" سے نسل انسانی مراد ہے، یعنی انسانوں کے لیے اللہ کی قدرتِ کاملہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے ان کی نسل کے لیے بحری سفر کا انتظام کر رکھا ہے۔ بھاری بھرکم کشتیاں جو سامان اور سواریوں سے لدی پھندی ہوتی ہیں، وہ سمندروں کی تند و تیز موجوں اور ہول ناک گردابوں کے باوجود ہماری رحمت سے کنارے لگتی ہیں۔

﴿فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ﴾ بھری ہوئی کشتی میں۔ ﴿الْفُلْكِ﴾ ف کے پیش اور ل کے سکون کے ساتھ کشتی کے معنی میں ہے، یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر ف اور ل پر زبر ہو تو اس کے معنی ہیں سیاروں کا مدار جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں بیان ہوا ہے۔ ﴿الْمَشْحُونِ﴾ یہ "الشحن" سے ہے جس کے معنی ہیں کشتی یا جہاز میں سامان لادنا اور بھرنا۔ اسی سے "الشحناء" ہے جس کے معنی ہیں کینہ وعداوت، جس سے نفس بھرا ہوا ہو۔ "عدو شاحن" اس دشمن کو کہتے ہیں جو دشمنی سے بھرا ہوا ہو۔ یہاں ﴿الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ﴾ سے مراد سفینۂ نوح علیہ السلام ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ یا اس سے مراد وہ کشتیاں ہیں جن میں انسان سفر کرتے ہیں۔

﴿وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ﴾ "اور ہم نے ان کے لیے اس جیسی اور چیزیں بھی بنائیں۔" ﴿مِثْلِهِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں:

الف: اسی کشتی کی مانند اور کشتیاں بنائیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ ابو مالک، ضحاک، قتادہ، ابوصالح اور سُدّی رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ اسی کو علامہ قرطبی نے صحیح ترین قرار دیا ہے۔ بلکہ حافظ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ اس کی تائید حسب ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ۝﴾ ①

---

① الحاقة: 12،11

”بلاشبہ ہم نے ہی، جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا۔ تا کہ ہم اسے تمھارے لیے ایک یاددہانی بنا دیں اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے۔“

یعنی آج بھی تم نوح علیہ السلام کی کشتی کی مانند کشتیوں پر سوار ہو کر بڑے بڑے سمندروں کا سفر طے کرتے ہو۔

ب: دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿مِثْلِه﴾ سے اس جیسی دیگر اشیاء مراد ہیں۔ یہ قول بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ عکرمہ، مجاہد، حسن بصری، قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ سے منقول ہے اور یوں اس سے دخانی کشتیاں، برقی طاقت سے چلنے والے بحری جہاز اور آبدوزیں بھی مراد ہیں۔ بلکہ ﴿مِنْ مِّثْلِه﴾ ہوائی جہاز بھی شامل ہے۔ کشتی پانی کا جہاز ہے جو پانی پر تیرتا ہے جب کہ ہوائی جہاز ہوا پر تیرتا ہے۔ بلکہ حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ اس سے اونٹ مراد ہیں۔ اور یہ ”سفينة البر“ ہے۔ صحراؤں میں باربرداری کے لیے اور سفر کے لیے سب جانوروں سے زیادہ موزوں جانور یہی اونٹ ہے۔ بلکہ اس میں ریل گاڑیاں، بسیں اور ٹرک وغیرہ سب سواریاں شامل ہیں۔ گویا ﴿مِنْ مِّثْلِه﴾ کو مبہم رکھ کر قیامت تک ایجاد ہونے والی سب سواریاں اس میں شامل ہو گئی ہیں۔ قرآنِ مجید میں کشتی کے ساتھ ساتھ بالصراحت چوپاؤں کا ذکر اسی مقصد کے لیے ہوا ہے:

﴿وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ o لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ o﴾ [1]

”اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تا کہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو، پھر اپنے رب

---

[1] الزخرف: 13،12

کی نعمت یاد کرو جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو: پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے تابع کر دیا حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہیں تھے۔"

یعنی جیسے سمندری سفر کے لیے ہم نے کشتی بنائی ہے اسی طرح بَرّی سفر کے لیے ہم نے جانور وغیرہ بنائے ہیں۔

بلاشبہ ﴿مِثْلِهٖ﴾ میں یہ تمام اشیاء شامل ہیں۔ مگر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اول تو اونٹ اور کشتی میں کوئی مماثلت نہیں۔ کشتی کی مماثل دوسری کشتیاں وغیرہ تو ہو سکتیں ہیں، اونٹ وغیرہ بَرّی جانور ہیں۔

ثانیاً: اس کے بعد ذکر ہوا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو انھیں غرق کر دیں، یہ دلیل ہے کہ اس سے کشتیاں ہی مراد ہیں۔ ①

مگر یہ اشکال محل نظر ہے۔ مماثلت من کل الوجوہ نہیں ہوتی۔ اونٹوں کو عرب "سُفُن البر" یعنی خشکی کے سفینے کہتے ہیں کہ کشتیوں سے اگر دریاؤں اور سمندروں کا سفر طے ہوتا ہے اور یہ ساز و سامان منتقل کرنے کا ذریعہ ہیں تو اونٹ بھی خشکی (صحرا وغیرہ) کا سفر طے کرنے کی بہترین سواری ہے اور بار برداری کا ذریعہ ہے۔

رہی اس کے بعد کی آیت جس میں غرق ہونے کا ذکر ہے جس کا اطلاق عموماً پانی میں ڈوب جانے پر ہوتا ہے مگر مجازاً ہر قتل پر بھی بولا جاتا ہے۔ ② بلکہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ③

کشتیوں کو اور دیگر اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے ﴿خَلَقْنَا لَهُمْ﴾ کہہ کر اپنی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ انھیں بنانے والے اور تیاری کے مختلف مراحل سے گزارنے والے تو کاری گر ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کاری گروں کو عقل و قوت دینے والا اور ان اشیاء کی تیاری کے اصول و قوانین کو الہام کرنے والا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ سب سے پہلے جو کشتی نوح علیہ السلام

---

① الضوء المنیر: 5/117 ② قاموس ③ مفردات

نے بنائی تھی اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا﴾ ①

''اور ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا۔''

گویا یہ پہلی کشتی اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام نے بنائی تھی۔ اسی طرح باقی ایجادات بھی اللہ تعالیٰ کے الہام سے وجود میں آئی ہیں، اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

﴿وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ﴾ ''اور اگر ہم چاہیں تو ان کو کشتی سمیت غرق کر دیں۔'' تمام حفاظتی تدابیر الٹ دیں، وائرلیس سسٹم دھرے کا دھرا رہ جائے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کو اپنی بقا کے سہاروں پر غرور نہیں کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ہوتے ہوئے اللہ کی گرفت سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے انسان کا سارا غرور آن کی آن میں خاک میں ملا دیتا ہے۔ آناً فاناً جیتی جاگتی بستیوں کو پیوند خاک کر دیتا ہے۔ کوہ پیکر جہازوں کو سمندروں کی لہروں کی نذر کر دیتا ہے۔

آئرلینڈ کی ایک کمپنی نے تین سال میں ایک جہاز ''ٹائی ٹینک'' تیار کیا جس کی لمبائی تقریباً 882 فٹ اور چوڑائی 92 فٹ تھی۔ گیارہ منزلوں پر مشتمل تھا اور اس کی بلندی 175 فٹ تھی۔ جس کا وزن 46328 ٹن تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے کوئی نہیں ڈبو سکتا۔ مگر ہوا یوں کہ آئرلینڈ سے امریکا جاتے ہوئے منزل مقصود (نیویارک) تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں 15 / اپریل 1912ء کو سمندر کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ اس کے ڈوبنے میں تین گھنٹے لگے، تین ہزار مسافر اس میں سوار تھے۔ اور کوئی حفاظتی تدبیر اسے بچا نہ سکی۔

1912ء میں بنائے گئے اس دیوہیکل جہاز کی لاگت پینسٹھ لاکھ (6500000) ڈالر تھی جس کا اس دور میں تخمینہ تقریباً چالیس کروڑ ڈالر بتلایا گیا ہے۔ آئے دن اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں کہ فلاں جگہ سمندری جہاز اپنے ساز و سامان اور ہزاروں مسافروں

---

① ھود: 37

سمیت ڈوب گیا۔ یوں اللہ تعالیٰ انسانی غرور کا بت آئے دن توڑتا رہتا ہے اور انسان اپنی بے بسی کا اعتراف کرتا ہے مگر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے فیصلے کا نتیجہ ہے، إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ.

کشتی ہو یا جہاز، اونٹ ہو یا گھوڑا، کار ہو یا بس یا کوئی اور سواری، اس پر کسی انسان کو بیٹھنے کے قابل بھی اللہ تعالیٰ ہی بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سواری پر بیٹھنے کے بعد جو دعا رسول اللہ ﷺ نے سکھلائی ہے اس میں اللہ کی حمد بھی ہے، اس کی عظمت اور اپنی ناتوانی کا اعتراف بھی اور سفری صعوبتوں اور برائیوں سے بچنے کی التماس بھی ہے نیز اہل خانہ کے لیے بھلائی کی دعا بھی۔ چنانچہ سواری پر سوار ہو کر پہلے بسم الله، پھر تین بار الحمد لله، پھر تین بار الله أكبر کہہ کر یہ دعا رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے:

((﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰـذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ○ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ﴾ اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰـذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی، اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰـذَا وَاطْوِعَنَّا بُعْدَهٗ، اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِی الْاَهْلِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْمَالِ وَالْأَهْلِ.))①

”پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لیے اس سواری کو مطیع کر دیا، ورنہ ہم میں یہ طاقت کہاں تھی کہ اس کو اپنے بس میں کرتے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اس سفر میں نیکی اور تقویٰ، نیز اس عمل کا سوال کرتے ہیں جو تجھے پسند ہو۔ اے اللہ! ہم پر اس سفر کو آسان کر دے اور اس کی

① صحیح مسلم: 1342

دوری گھٹا دے۔ اے اللہ! تُو سفر میں ساتھی ہے اور اہل وعیال میں جانشین ہے۔
اے اللہ! میں سفر کی تکلیفوں اور بُرے منظر اور اہل وعیال اور مال کو بُری حالت میں دیکھنے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

لہٰذا یہ سواریاں اپنے طبعی تقاضوں پر نہیں چلتیں جیسا کہ ملاحدہ کا خیال ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت واعانت سے چلتی ہیں، ورنہ اللہ جب چاہے جہازوں کو غرق کر دے، گاڑیوں کو تباہ وبرباد کر دے، جانوروں کو انسان کا باغی بنا دے، ولیس ذلك علی اللہ بعزیز.

اس لیے کہ انسان کی زندگی وموت کا مالک صرف اللہ ہے اور ہر ایک کے مرنے کا سبب اور وقت اس کے ہاں مقرر ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے، موت کا فیصلہ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور امرِ ربی ہے، جب چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے انسان کی موت کا فیصلہ کر دیتا ہے، تب کوئی بھی اسے موت سے بچانے والا نہیں۔

﴿فَلَا صَرِيخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنقَذُونَ﴾ ''(اللہ کے فیصلے کے بعد) نہ کوئی ان کی فریاد سننے والا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بچائے جاتے ہیں۔'' ''صریخ'' چیخنے چلانے، فریاد اور فریاد رسی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کشتیوں اور جہازوں کو اللہ نے تمھارے لیے مسخر کیا ہے۔ یہ اسی کے حکم سے سمندروں کے سینوں پر دوڑتے اور اس کی موجوں اور لہروں کو کاٹتے گزر جاتے ہیں۔ اللہ اگر چاہے تو انھیں ان کے سواروں اور ساز وسامان سمیت غرق کر دے، پھر کوئی ان کی فریاد سننے والا نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی فریاد سن کر پہنچے بھی کہ انھیں بچا لے تو پھر بھی: ﴿وَلَا هُمْ يُنقَذُونَ﴾ ''وہ بچائے نہ جا سکیں گے۔'' نہ کوئی دیوتا انھیں بچا سکے نہ ہی کوئی پیر فقیر، جنھیں حل مشکلات کے لیے پکارا جاتا ہے۔ یہ تقریباً وہی اسلوب ہے جو سورہ فاطر ① میں بیان ہوا ہے کہ: اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور اگر وہ سن لیں تو تمھاری درخواست قبول نہیں کریں گے۔

---

① فاطر:14

اس آیت میں دراصل ان کی بہر نوع بے بسی کا اظہار ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ﴾ ''ان کا کوئی فریادرس نہیں ہوگا۔'' یہی حقیقت ایک اور اسلوب میں یوں بیان ہوئی ہے:

﴿وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا﴾ ①

''اور جب تمھیں سمندر میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو گم ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ تمھیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو اور انسان ہمیشہ سے بہت ناشکرا ہے۔''

سمندروں میں ایسی صورت حال پر اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت کا اظہار یہاں یہ کہہ کر کیا گیا ہے کہ اگر ہم انھیں غرق کرنے کا فیصلہ کرلیں تو کوئی مددگار اور فریادرس انھیں بچانے پر قادر نہیں اور نہ ہی وہ کسی صورت بچ سکتے ہیں۔

﴿اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ ''مگر ہماری طرف سے رحمت اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانے کی وجہ سے۔'' یہ جو دریاؤں اور بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل جیسے وسیع وعریض سمندروں میں تم بہ حفاظت کنارے لگ جاتے ہو یہ تمھاری جہاز رانی کے فن کا کمال نہیں بلکہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ فلاں وقت تک اس نے دنیا کی نعمتوں سے متمتع ہونا ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو پھر کوئی بھی ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ جہاز رانی کے فن پر کامل دسترس کے باوجود اللہ تعالیٰ اسے تمام سواروں سمیت پانی کی تہ میں اتار دیتا ہے، اس لیے کہ پانی پر قبضہ تو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہے۔

بعض نے اس کے یہ معنی بھی بیان کیے ہیں کہ اگر اللہ کی رحمت شامل حال ہو اور تمھارا

---

① الإسراء 67:17

ایک وقت تک باقی رکھنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو تب تو تمھارے بچنے کی کوئی نہ کوئی سبیل کارگر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو صرف پانی ہی میں نہیں بلکہ مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کے باوجود بچا لیا تھا۔ موت و حیات اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ بلاشبہ انسان کسی نہ کسی سبب سے موت کے منہ میں چلا جاتا ہے مگر موت دینے والا اور نبض حیات منقطع کرنے والا اللہ ہی ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ ①

''اور کسی جان کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، لکھے ہوئے کے مطابق جس کا وقت مقرر ہے۔''

کراچی کا ایک واقعہ اخبارات میں شائع ہوا کہ تیرہ منزلہ عمارت سے ایک مزدور سر کے بل نیچے گرا۔ لوگ اسے بچانے کے لیے دوڑے۔ سب کا خیال تھا کہ وہ بس مر گیا لیکن چند لمحہ بعد وہ پاؤں پر صحیح سالم کھڑا ہو گیا۔ مبارک باد دینے والے ساتھیوں نے اس سے مٹھائی کا مطالبہ کیا وہ سڑک پار کر کے دکان پر گیا۔ مٹھائی کا ڈبہ لے کر واپس لوٹا تو سڑک پر گاڑی کی ٹکر سے اسی وقت ڈھیر ہو گیا:

﴿وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ ②

''اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

اس لیے کسی کو زندگی ملتی ہے تو یہ اس کی رحمت ہے، موت واقع ہوتی ہے تو اس کے فیصلے کے مطابق ہوتی ہے۔

---

① آلِ عمران:145 ② لقمان:34

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ○﴾ [یٰسٓ: 46,45]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے بچو اُس (عذاب) سے جو تمھارے سامنے ہے اور جو تمھارے پیچھے ہے، تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔''

سابقہ آیات میں آفاق میں پھیلے ہوئے اللہ کی قدرت کے مظاہر و مناظر کا بیان تھا۔ زمین و آسمان، لیل ونہار، شمس وقمر اور سمندروں میں پھیلی ہوئی اللہ کی قدرت کاملہ کے تناظر میں توحید اور اللہ تعالیٰ کی ان آیات بینات کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت کا ذکر تھا۔ ان آیات میں مخاطبین کا ان آیات سے اعراض اور ان کی کج روی کا ذکر ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے اس عذاب سے بچو جو تمھارے سامنے اور تمھارے پیچھے ہے تاکہ تم رحمت کے مستحق بن سکو مگر وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور توجہ دلانے پر بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ یہاں ''اذا قیل'' شرط ہے اور اس کی جزاء ''اعرضوا'' محذوف ہے کہ وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اس کے محذوف ہونے پر بعد کی آیت میں جو اعراض کا ذکر ہے وہ اس کا قرینہ ہے۔

سامنے کے عذاب سے آفات ونوازل یعنی قحط، زلزلہ، سیلاب اور غرق مراد ہیں جن سے امم سابقہ دوچار ہوئی تھیں اور اس سے مراد یہ بھی ہے کہ تم اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں سے ڈرو۔ اور بعد یا پیچھے کے عذاب سے، موت کے وقت اور موت کے بعد قیامت کا عذاب بھی مراد ہے اور آیندہ آنے والی زندگی میں گناہوں سے بچنا مراد بھی ہوسکتا ہے۔ یہ دونوں اقوال سلف سے منقول ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے ﴿ایدیکم﴾ سے مراد دنیا ہے

کہ دنیا کی زیب وزینت پر فریفتہ ہونے سے بچو اور ﴿خلفکم﴾ سے مراد قیامت ہے کہ قیامت کے برے انجام سے بچو۔

بعض حضرات نے یہ تکلف بھی کیا ہے کہ ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ﴾ ① کے بعد ﴿مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کے الفاظ محذوف ہیں۔ سورۂ سبا میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ②

”تو کیا انھوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا جو آسمان وزمین میں سے ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ اگر ہم چاہیں انھیں زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا دیں۔“

گویا اس آیت میں بھی فرمایا گیا ہے کہ تمھارے آگے اور پیچھے جو آسمان وزمین ہیں ان سے ڈرو کہ تمھیں زمین میں دھنسا نہ دیا جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں۔ مگر یہ محض تکلف ہے اولاً سورۂ سبا کی اس آیت میں تو دراصل اللہ کی قدرت کاملہ کا اور اللہ کے انعام واحسان کا بیان ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تمھیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا دیں۔ تمھاری نالائقیوں کے باوجود اگر ایسا نہیں ہورہا تو یہ ہمارے حلم ورحم کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے آیت کے اختتام پر فرمایا ہے:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴾ ②

”یقیناً اس میں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے ضرور ایک نشانی ہے۔“

اس لیے اس آیت میں عذاب سے ڈرایا نہیں گیا بلکہ اللہ کی رحمت کے سبب عذاب سے بچے رہنے کا ذکر ہے۔ ثانیاً قرآن پاک میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان

---

① طٰهٰ: 110 ② سبا:9

سے نہیں ڈرایا بلکہ ہمیشہ اپنے عذاب سے اور اپنی گرفت سے ڈرایا ہے۔ بلکہ قرآن مخلوق سے ڈرانے کے لیے نہیں اللہ سے ڈرانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

﴿وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ﴾ اس میں ان کی بے خوفی اور ان کے تمرد کی مزید شناعت کا ذکر ہے کہ جب انھیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے دنیوی اور اخروی عذاب سے ڈرو تو وہ اس سے صرف اعراض اور لاپرواہی ہی اختیار نہیں کرتے بلکہ جب بھی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی کبریائی کی، قیامت کی سچائی کی اور رسول کی حقانیت کی پیش کی جاتی ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الانعام میں بیان ہوا ہے:

﴿وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ○ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ○﴾ ①

”اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں۔ پس بے شک انھوں نے حق کو جھٹلا دیا جب وہ ان کے پاس آیا، تو عنقریب ان کے پاس اس کی خبریں آجائیں گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے ہیں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ○﴾ ②

”اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔“

یہ اعراض اتنا غالب ہے کہ جو آیت بھی ان کی تذکیر کے لیے ذکر کی جاتی ہے اس سے روگردانی کرتے ہیں بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

---

① الأنعام: 504 ② یوسف: 105

﴿وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ ①

''اور جب انھیں نصیحت کی جائے وہ قبول نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو خوب مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ صاف جادو کے سوا کچھ نہیں۔''

جیسے کفار کے مطالبے پر رسول اللہ ﷺ کے اشارہ انگشت سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا مگر بدنصیبوں نے اسے تسلیم کرنے کی بجائے الٹا یہ کہہ دیا کہ محمد ﷺ کا جادو تو آسمان پر بھی چل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات سن کر کہتے ہیں یہ شاعر ہے، مجنون ہے۔ یہ بدنصیب آیات کا مذاق ہی نہیں اڑاتے بلکہ اللہ کے رسول کا بھی مذاق اڑاتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے:

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ ②

''ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا رہا مگر وہ اس کے ساتھ ٹھٹھا کیا کرتے تھے۔''

یہ ہے ان کے تمرد کا حال، ایسے لوگوں کو اگر کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی اور وہ دولت ایمان سے محروم رہتے ہیں تو اس کا سبب ان کی یہی سرکشی اور تمرد ہے۔ آپ کے سمجھانے میں کوئی کمی نہیں۔

آج بھی زلزلہ آئے، بے موسمی بارشیں برسیں، سورج اور چاند کو گرہن لگے، گہرے سیاہ بادل چھا جائیں فضائی حادثہ ہو جائے یا بحری جہاز سمندر میں ڈوب جائے تو بڑی بے پروائی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ طبعی امر ہے اور حوادث آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی آیات سے اعراض ہے اور قساوتِ قلب کا نتیجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ ایسے موقع پر خوف زدہ ہو جاتے تھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور نماز میں مصروف ہو جاتے تھے۔

---

① الصّٰفّٰت: 13-15 ② یٰسٓ: 30

چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ:

كَانَ النَّبِيُّ صَلى اللّٰه عليه وسلَّم إذا رَاَىٰ مَخِيلَةً فِي السَّمَآءِ اَقْبَلَ وَاَدْبَرَ وَدَخَلَ وَ خَرَجَ وَ تَغَيَّرَ وَجْهُه' فَاِذَا اَمْطَرَتِ السَّمَآءُ سُرِّيَ عَنْهُ فَعَرَّفَتْهُ عَائِشَةُ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَدْرِیْ لَعَلَّه' كَمَا قَالَ قَوْمٌ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضاً مُسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ...الآية ①﴾ ②

رسول اللہ ﷺ جب آسمان پر کوئی بادل کا ٹکڑا دیکھتے تو کبھی سامنے کو جاتے، کبھی پیچھے کو، کبھی (گھر کے) اندر جاتے اور کبھی باہر اور آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا، پھر جب بارش شروع ہو جاتی تو آپ کی یہ حالت ختم ہو جاتی۔ سیدہ عائشہؓ نے آپ کی اس حالت کا آپ سے ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میرے خوف کی وجہ یہ ہے کہ) مجھے معلوم نہیں شاید یہ ایسا ہی بادل ہو جیسا کہ ایک قوم (یعنی عاد) نے کہا تھا۔ پس جب انھوں نے بادل کو دیکھا کہ وہ ان کی وادیوں کی طرف رخ کیے ہوئے ہے تو کہنے لگے اس بادل سے ہمارے لیے بارش ہوگی.. الخ۔

صحیح مسلم ③ میں ہے کہ سیدہ عائشہؓ نے کہا: میں دیکھتی ہوں کہ لوگ بادلوں کو دیکھ کر بارش کی امید پر خوش ہوتے ہیں اور آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ بادلوں کو دیکھ کر غم ناک ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے عائشہؓ! میں اس وجہ سے خوف زدہ ہوتا ہوں کہ کہیں اس میں عذاب ہو کیونکہ ایک قوم آندھیوں سے ہلاک ہو چکی ہے اور ایک قوم نے بادل (جو عذاب بن گیا) آتا ہوا دیکھ کر کہا تھا یہ ہم پر برسنے والا بادل ہے۔ سیّدنا حذافہ بن یمانؓ سے مروی ہے:

---

① الاحقاف: 24 ② بخاری: 3206؛ مسلم: 899 ③ صحیح مسلم: 899

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا حَزَبَه» اَمْرٌ صَلّٰى. ①

کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے۔اس کی سند میں اگرچہ کچھ ضعف ہے مگر شاہد کی بنا پر علامہ البانی نے اسے صحیح ابی داود ② میں حسن قرار دیا ہے۔ بلکہ مسند احمد ③ میں صہیب رومیؓ سے مروی ہے کہ انبیائے کرام کا طریقہ تھا کہ جب انھیں کوئی مشکل پیش آتی نماز پڑھتے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی مصیبت آنے پر صبر و صلاۃ کا حکم دیا ہے۔ ④

مگر ہماری کیفیت بڑی غفلت شعار واقع ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ کا خوف دل سے نکل گیا ہے۔ہماری حالت بالکل انہی بدنصیبوں کی سی ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾ ⑤

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ نصیحت پکڑتے ہیں۔''

اللہ کی آیات سے نصیحت حاصل نہ کرنے والوں کو بڑے تحدید آمیز انداز میں خبردار کیا گیا ہے کہ:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَاؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ﴾ ⑥

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیات کے ساتھ نصیحت کی گئی، پھر اس نے ان سے منہ پھیر لیا۔یقیناً ہم مجرموں سے انتقام لینے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی آیات بینات اور تنبیہات پر کان نہ دھرنا اللہ ذوالجلال کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ بلاشبہ رحمٰن ورحیم ہیں مگر اس کی پکڑ بھی بڑی شدید ہے۔

---

① ابوداؤ مع العون: 507/1، احمد: 288/5

② صحیح ابوداؤ: 65/5 ③ مسند احمد: 333/4

④ البقرۃ: 153 ⑤ التوبۃ: 126 ⑥ السجدۃ: 22

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [یٰسٓ:48]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے: اس میں سے خرچ کرو جو تمھیں اللہ نے دیا ہے تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان سے کہتے ہیں جو ایمان لائے: کیا ہم اسے کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو کھلا دیتا، نہیں ہو تم مگر واضح گمراہی میں۔''

پہلی آیات میں کفار کے تمرد وسرکشی کا اور ان کی عقلی بے حسی اور سنگ دلی کا ذکر تھا۔ اس آیت میں مزید ان کے اخلاقی دیوالیہ پن اور کردار کی پستی کا ذکر ہے کہ نہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں ان کا طرزِ عمل درست ہے اور نہ ہی اللہ کے بندوں کے بارے میں۔ چنانچہ جب انھیں نادار اور مفلس بندوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ نے تمھیں بہت کچھ نوازا ہے، اس میں سے تھوڑا سا تعاون اللہ کے ان نادار بندوں سے بھی کر دیجیے تو اس کا جواب وہ مذاق کی صورت میں دیتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ ان کے پاس ہے سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے: ﴿رَزَقَكُمُ اللّٰهُ﴾، یہ جس نے دیا ہے وہی فقراء پر خرچ کا حکم دیتا ہے مگر وہ اطاعت کی بجائے تکبر کرتے اور حجت بازی سے کام لیتے ہیں۔

کفار عموماً ہر دور میں مال ومتاع سے نوازے گئے ہیں حتی کہ کفار مکہ تو کہتے تھے:

﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا﴾ [1]

''ہم اموال واولاد میں زیادہ ہیں۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے کفار کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا﴾ [2]

---

[1] سبا:35 [2] التوبۃ:69

''ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے تھے، وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور اموال اور اولاد میں بہت زیادہ تھے۔''

کفار کے مال کی فراوانی اور ظاہری کروفر کے بارے میں ہی فرمایا گیا ہے:

﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ قف ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط وَ بِئْسَ الْمِهَادُ﴾ ①

''تجھے ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے جنھوں نے کفر کیا۔ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا بچھونا ہے۔''

دنیا کے مال و متاع پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافراً منها شربة ماء. ②

اگر دنیا کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ نہ پلاتے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ بازار سے گزرے، کچھ صحابہ کرام بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ کا گزر ایک چھوٹے کانوں والی مردہ بکری پر سے ہوا۔ آپ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ایک درہم کے بدلے اِسے لینا چاہتا ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ہم اسے کیا کریں گے؟ ہم کسی چیز کے بدلے اسے لینا پسند نہیں کرتے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم بلا معاوضہ اِسے لینا پسند کرو گے؟ انھوں نے عرض کیا: اگر یہ زندہ ہوتی تو چھوٹے کانوں کی وجہ سے معیوب تھی چہ جائیکہ وہ مردہ ہو، آپؐ نے فرمایا:

فوالله الدنيا اهون على الله من هذا عليكم. ③

اللہ کی قسم! اللہ کے ہاں دنیا اس سے بھی حقیر تر ہے جس طرح یہ مردہ بکری تمھارے

---

① آل عمران: 197,196

② ترمذی، عن سهل بن سعد، صحيح الترغيب: 265/3

③ مسلم: 2960

نزدیک حقیر ہے۔

مگر کفار اسی مال و دولت کی فراوانی کو اپنی خوش بختی سمجھتے اور اسی پر اتراتے تھے۔ اللہ کی یہ نعمت وافر حاصل ہونے کے باوجود جب انھیں کہا جاتا کہ مفلسوں اور کمزوروں پر کچھ خرچ کرو تو جواب دیتے کہ جن کو اللہ نے محروم رکھا ہے ہم انھیں کیسے کھلائیں۔ اگر اللہ انھیں کھلانا پلانا چاہتا تو اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، وہ انھیں اسی طرح کھلاتا اور پلاتا جیسے ہمیں، اس لیے تمھارا ہمیں ان کی ہمدردی کے لیے کہنا تمھاری کھلی گمراہی ہے۔ ہم اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی عمل کر کے اللہ کی ناراضی مول نہیں لے سکتے۔ یوں وہ انفاق فی سبیل اللہ سے راہِ فرار اختیار کرتے اور تقدیر سے استدلال کر کے ملامت سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

عین ممکن ہے وہ یہ بھی کہتے ہوں کہ تم تو کہتے ہو: سب کا رازق اللہ ہے اور وہی رزاق ہے۔ جب اس نے انھیں رزق نہیں دیا تو ہم کیوں دیں۔ یہ تمھاری گمراہی ہے کہ تم ہمیں اللہ کے مقابلے میں رزاق بنانا چاہتے ہو۔ حالانکہ یہ ان کی کھلی گمراہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مفلسوں سے ہمدردی کو اللہ کی رزاقیت کے منافی سمجھتے تھے یا اللہ کی مشیت کو اللہ کی رضا سمجھتے تھے۔ یہی مشرکین کی بنیادی غلطی تھی اور وہ اسی بنا پر یہ بھی کہتے تھے:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ ①

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

ان کی یہی بات سورۃ النمل ② میں بھی بیان ہوئی ہے۔ حالانکہ اللہ اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے، وہ علّام الغیوب ہے۔ وہ جو بھی فیصلہ فرماتا ہے اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ کافر کی مشیت کا اللہ کی مشیت پر غلبے کا تصور کوئی گمراہ

---

① الأنعام 148:6 ② النمل 35:27

ہی کرسکتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تو کافر سے ایمان چاہے مگر کافر کی مشیت کفر وضلالت ہو اوراس کی مشیت غالب آ جائے۔ البتہ کافر کے کفر پر اللہ راضی اور خوش نہیں۔ جب کہ مومن کے ایمان پر راضی اور خوش ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ وقف وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ج وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ ط﴾ [1]

''اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔''

اس کی رضا دین وشریعت کی پابندی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، ان کی پابندی میں ہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

اسی لیے کفار کو جب انفاق کا حکم دیا تو اس کے جواب میں ان کا یہ کہنا کہ ﴿لَوْ یَشَاءُ اللّٰهُ اَطْعَمَه‘﴾ ''اگر اللہ چاہتا تو انھیں رزق دیتا۔'' اگرچہ فی نفسہٖ یہ بات درست تھی مگر اس سے انھوں نے یہ سمجھا کہ جب اللہ قادر ہے تو ہمیں حکم انفاق کے کیا معنی؟ یہ استدلال ان کا سراسر باطل تھا۔ یہ بات ہی کب تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں رزق بلا ذریعہ اسباب اور بلا واسطہ وسائل عطا فرماتا ہے۔ اللہ نے بعض کو تونگری عطا کی اور بعض کے حق میں فقیری کا فیصلہ فرمایا ہے تو اس میں بھی اللہ کی حکمت کارفرما ہے اور وہ یہ کہ انسانی معیشت باہمی نصرت واعانت پر قائم ہے۔ کوئی ہل چلاتا ہے، فصل بوتا ہے، وقت آنے پر اسے کاٹتا اور محفوظ کرتا ہے پھر کوئی اس کے ہل بنانے اور دیگر اشیائے ضروریہ میں اس کا معاون ہے، کوئی اسے پیسنے میں لگا ہوا ہے اور کوئی آٹا گوندھنے اور روٹی پکانے پر مصروف ہے۔ یہی کیفیت پورے نظام عالم کی ہے کوئی آدمی تنہا سارے کام سرانجام نہیں دے سکتا یوں مال دار کو غریب مزدور کی محنت کی ضرورت ہے اور غریب کو مال دار کے پیسے اور تعاون کی ضرورت ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے تحت ایک دوسرے کے کام آ رہا ہے۔ انسان کیڑا مکوڑا یا درندہ و پرندہ نہیں

---

[1] الزمر 7:

جنھیں عموماً بلاواسطہا سباب رزق ملتا ہے۔ انسان زندگی کے تمام امور میں باہمی اعانت ونصرت کا محتاج ہے۔ محتاج سبھی ہیں البتہ ان کی محتاجی میں فرق ہے اور یہی ان کی ضلالت کی بین دلیل ہے کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس تقسیم کی حکمت سے بے خبر ہیں۔ کوئی انسان زمین سے اناج کیا کوئی چیز بھی پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ سب کا رازق اللہ ہی ہے اور اسی کے حکم سے انسانی ضرورت کے لیے زمین سے مختلف اشیاء پیدا ہو رہی ہیں۔ اللہ چاہتا تو آسمان سے پانی کی بجائے درہم ودینار کی بارش برسا دیتا۔ مگر اس کی مشیت اور حکمت یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسے، انسان زمین میں ہل چلائے، بیج ڈالے اور دیگر وسائل بروئے کار لائے اور اس سے انھیں رزق حاصل ہو یا ایک جگہ سے دوسری ضرورت کی جگہ پر منتقل ہو اور وہاں کے لوگ بھی اس سے روزی حاصل کریں مگر واضح گمراہی میں مبتلا اللہ تعالیٰ کے اس نظام حیات کے ادراک سے بے خبر ہیں۔ جس طرح تمام اشیائے ضروریہ ہر جگہ پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اسی طرح تمام انسانوں کے پاس تمام اشیائے ضروریہ نہیں ہوتیں وہ باہم ایک دوسرے کے ضرورت مند اور محتاج ہیں۔ جیسے آجر و اجیر، مالک ومزدور اور پھر اغنیاء وفقراء۔ اغنیاء کو حکم ہے کہ ان سے ہمدردی کریں اور اللہ کے دیے ہوئے مال سے کچھ ان کی خدمت کریں۔ ان کی خدمت عبادت ہے اور مال کا شکرانہ بھی، مگر جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت سے بے خبر ہیں وہی اس پر معترض ہیں۔ ان کی گمراہی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

اسی طرح یہ دنیا دار الامتحان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو مال ومتاع دے کر آزماتا ہے کہ یہ تکبر تو نہیں کرتے، میرا شکر کرتے ہیں کہ نہیں، میرے حکم پر خرچ کرتے ہیں یا من مانیاں کرتے ہوئے عیش وعشرت میں اڑا دیتے ہیں۔ بعض کو فقیری اور مسکنت دے کر آزماتا ہے کہ یہ صبر کرتے ہیں یا بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شکوہ وشکایت پر اتر آتے ہیں۔ دونوں صورتیں آزمائش اور امتحان کی ہیں:

﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي

اَکْرَمَنِ ○ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ ○ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ○ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ○ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا○﴾ ①

”پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے، اور نہ آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو اور تم میراث کھا جاتے ہو اور سب سمیٹ کر کھا جانا اور مال سے محبت کرتے ہو بہت زیادہ محبت کرنا۔“

نیز فرمایا:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ﴾ ②

”اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین کے جانشین بنایا اور تمھارے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کر دیا، تاکہ وہ ان چیزوں میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تمھیں دی ہیں۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کے تناظر میں فرمایا تھا: یہ میرے رب کے فضل سے ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو یقیناً میرا رب بہت بے پروا بہت کرم والا ہے۔ ③

---

① الفجر: 15-20 ② الأنعام: 165
③ النمل: 40

یوں فقیری وامیری میں حکمت یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم تو مسلمانوں کو ہے کفار اس کے مخاطب نہیں تو انھیں انفاق کا حکم کیوں ہے۔ تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ من وجہ وہ بھی مخاطب ہیں جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ جب اہل جنت دوزخی مجرموں سے سوال کریں گے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ ○ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ○ حَتّٰى اَتٰـنَا الْيَقِيْنُ ○ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ○﴾ ①

''تمھیں کس چیز نے سقر میں داخل کر دیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے۔ اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین (موت) آ گیا۔ پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔''

بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ کفار ایمان کے ساتھ ساتھ نماز اور زکاۃ کے حوالے سے بھی مخاطب تھے تبھی تو یہاں نماز نہ پڑھنے اور مساکین کو کھانا نہ کھلانے کے ساتھ ساتھ جہنمی قیامت کے انکار کا اعتراف کریں گے اور وہی سفارش سے محروم ہوں گے ورنہ ہر مومن جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا اسے سفارش نفع دے گی اور وہ بالآخر جہنم سے نجات پا جائے گا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ○ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ○﴾ ②

''اور مشرکوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو زکاۃ نہیں دیتے اور آخرت کا انکار

---

① المدثر: 42-48 ② حٰمٓ السجدہ: 7,6

کرنے والے بھی وہی ہیں۔‘‘

یہاں منکرین قیامت، جو کہ کافر ہیں، کا جرم یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ زکاۃ نہیں دیتے۔ اس سے بھی ان فقہاء کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ کفار بھی انفاق کے حوالے سے مخاطب ہیں۔ اسی بنا پر یہاں ان سے انفاق کا مطالبہ ہے۔ علامہ نووی نے ذکر کیا ہے کہ اکثر فقہاء اور محققین کا یہی قول ہے کہ کفار فروع شریعت کے مخاطب ہیں۔ ①

یاد رہے کہ عرب صدقہ و خیرات کرتے تھے بلکہ جوا اور شراب کو بھی انھوں نے خیرات کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ شراب کے نشہ میں اونٹ ذبح کرتے اور غریبوں میں ان کا گوشت تقسیم ہوتا۔ جوا جیت جاتے تو اس کا بیشتر حصہ بھی تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ مگر اسلام کی دعوت کے بعد جو نادار حلقہ بگوش اسلام ہوتے یہ لوگ ان کا عرصہ حیات تنگ کر دیتے اور معاشرتی امداد سے محروم کر دیتے۔ اسی لیے انھیں مسلمان ناداروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے انکار کی سزا کا اعتراف بالآخر وہ قیامت میں کریں گے۔

دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انفاق کا یہ حکم شرعی حکم کی تعمیل میں نہیں بلکہ انسانی ہمدردی کے طور پر تھا۔ مگر یہ اتنے شقی القلب ثابت ہوئے ہیں کہ ہمدردی کی بجائے استہزاء پر اتر آتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے بالخصوص فقراء و مساکین کی خبر گیری کرنے میں متعدد احادیث میں ترغیب آئی ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الساعی علی الْاَرْمَلَةِ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللّٰه أو القائم اللیل الصائم النهار②

بیوگان اور مساکین پر خرچ کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا یا

---

① تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شرح مسلم: 37/1 طبع ھند، فتح الباری: 359/3، فتح الملھم: 187/1

② بخاری: 6060,5353

جیسے رات کا قیام کرنے والا، دن کو روزہ رکھنے والا۔

حضرت سلمان بن عامر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین پر صدقہ، صدقہ ہے جب کہ رشتہ دار پر صدقہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ ①

❁❁❁

① ابن خزیمة، ترمذی، اس موضوع کی دیگر احادیث کے لیے ملاحظہ ہو الترغیب والترہیب: 2/37-1

﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ○ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ○ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ○﴾ [یٰسٓ: 48-50]

''اور وہ کہتے ہیں: یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔ وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ایک ہی چیخ کا جو انھیں پکڑ لے گی جب کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔ پھر وہ نہ کسی وصیت کی طاقت رکھیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس آئیں گے۔''

اچھی اور فائدہ مند باتوں کا مذاق اڑانے والے قیامت کے بارے میں بھی ازراہِ استہزا پوچھتے تھے: ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ ''یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟'' اسی طرح انھیں کہا جاتا کہ قیامت سے ڈرو تو وہ کہتے کہ جس سے ڈراتے ہو وہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم سچے ہو تو ہمارے مطالبے کے باوجود یہ وعدہ پورا کیوں نہیں ہوتا۔ کفار کا یہ مطالبہ قرآنِ مجید میں بالکل انھی الفاظ سے مزید مقامات پر بھی آیا ہے۔ [1] ان مقامات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ قیامت کے بارے میں تھا جس پر انھیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور جس میں ان کی زندگی کے انجام سے ڈرایا جاتا تھا۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ دنیا سالہا سال سے اسی طرح چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا عقل و فکر کے بالکل منافی ہے۔ علاوہ ازیں انبیائے کرام اپنی قوموں کو دنیوی عذاب سے اور پہلی امتوں کے انکار کے نتیجے سے بھی خبردار کرتے تھے اور کفار انھیں بھی کہتے تھے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے آؤ۔ بالآخر وہ عذاب ان پر مسلط ہو جاتا تھا اور وہی عذاب ان کے لیے عذابِ آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا، مگر صحیح یہی ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ یہاں اور دیگر مقامات میں جس عذاب کا مطالبہ کفار کرتے تھے وہ عذابِ آخرت ہے۔ اور قیامت کا

---

[1] یونس: 48، الانبیاء: 38، النمل: 71، سبا: 29، الملك: 25

ایک نام اسی بنا پر ''یوم الوعید'' بھی ہے۔ ①

سورۂ فاطر ② میں اسی حوالے سے فرمایا گیا ہے: اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو کہیں دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کہیں وہ دھوکے باز تمھیں اللہ کے بارے میں دھوکا نہ دے جائے۔ اسی کا ذکر سورۃ ق ③ میں بھی ہے۔

﴿مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ یہاں ﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ ''ایک چیخ'' سے سلف نے قیامت کے روز ''نفخۂ صور'' ہی مراد لیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کا یہی قول ہے اور احادیث و آثار اس بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ اسی ''صیحة واحدة'' کا ذکر ﴿زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ کے الفاظ سے سورۃ الصّٰفّٰت ④ اور سورہ النازعات ⑤ میں ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نفخۂ اولیٰ ہے۔ ⑥ جس کی تفصیل فتح الباری میں ہے۔ ⑦

لوگ اپنے جھگڑے جھنجال میں ہوں گے کہ وہ چیخ اچانک ان کا کام تمام کر دے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ولتقومن الساعة وقد نشر الرجلان ثوبهما بينهما فلا يتبايعانه ولا يطويانه، ولتقومن الساعة وقد انصرف الرجل بلبن لقحته فلا يطعمه، ولتقو من الساعة وهو يليط حوضه فلا يسقي فيه، ولتقومن الساعة وقد رفع أحدكم أكلته إلى فيه فلا يطعمها.)) ⑧

''اور قیامت ضرور آئے گی اور اس وقت دو آدمی آپس میں اپنے کپڑے (خرید وفروخت کے لیے) پھیلائے ہوئے ہوں گے، نہ ابھی خرید وفروخت مکمل ہوئی ہوگی نہ ہی انھوں نے کپڑوں کو لپیٹا ہوگا کہ قیامت آ جائے گی۔ ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دوھ کر جا رہا ہوگا کہ اسے پینے سے پہلے قیامت آ جائے گی۔ ایک

---

① سورۂ قٓ:20 ② فاطر:5 ③ سورۂ قٓ:42 ④ الصّٰفّٰت:19
⑤ النازعات:13 ⑥ بخاری تعلیقاً ⑦ فتح الباری :369/11
⑧ صحیح بخاری: 7121، 2954

شخص اپنا حوض درست کر رہا ہوگا، ابھی اس نے حوض سے پانی نہیں پیا ہوگا کہ قیامت آ جائے گی۔ ایک آدمی اپنا لقمہ منہ کی طرف اٹھائے گا وہ کھا نہیں پائے گا کہ قیامت آ جائے گی۔''

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ اسرائیل علیہ السلام صور پھونکیں گے اور لوگ اپنے راستوں میں اور بازاروں اور مجلسوں میں ہوں گے۔ دو آدمی کپڑوں کی خرید وفروخت کرتے ہوئے بھاؤ کر رہے ہوں گے، آدمی ہاتھ سے کپڑا نہیں چھوڑے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ آدمی گھر سے نکلے گا مگر پلٹنے سے پہلے قیامت آ جائے گی۔ پھر انھوں نے یٰسٓ کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ ①

یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، امام قتادہ، ابن زید وغیرہ رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ ②

قرآنِ مجید میں بھی ہے:

﴿لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ ③

''وہ (قیامت) تم پر اچانک ہی آئے گی۔''

ایک مقام پر فرمایا:

﴿بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۝﴾ ④

''بلکہ وہ ان پر اچانک آئے گی تو انھیں مبہوت کر دے گی، پھر وہ نہ اسے ہٹا سکیں گے اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔''

سورۃ النمل ⑤ میں ہے کہ قیامت کا معاملہ آنکھ جھپکنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ

---

① ابن جریر: 13/23، ابن أبي حاتم ② الدر المنثور: 265/5

③ الأعراف: 187 ④ الأنبياء: 40 ⑤ النمل: 77

قریب ہے۔ یہ اور اس موضوع کی دیگر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت اچانک آئے گی جیسا کہ حدیث میں مثال دے کر واضح فرمایا گیا ہے۔ اسی ﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ کی مزید وضاحت بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہے۔

مگر بعض حضرات نے یہاں متقدمین کے برعکس اس آیت میں ﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ سے دنیوی عذاب مراد لیا ہے اور فرمایا ہے کہ لفظ "صیحۃ" اسی سورہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ ① فرمایا کہ وہ بڑے طنطنہ کے ساتھ جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اللہ کو اس کے لیے کوئی سرو سامان نہیں کرنا، بس ایک ڈانٹ ہی ان کے لیے کافی ہے۔ بلاشبہ "صیحۃ" چیخ اور ڈانٹ کا یہ عذاب کفار کے لیے دنیوی عذاب بھی بن کر آیا۔ چنانچہ قوم لوط اسی "الصیحۃ" سے برباد ہوئی ②، قوم صالح اور قوم شعیب بھی اسی "الصیحۃ" سے ہلاک ہوئیں۔ ③ یہ ڈانٹ بھی فرشتے کی چیخ و چنگھاڑ تھی اور قیامت کے دن "صور" میں بھی فرشتے کے پھونکنے سے ہی آواز پیدا ہوگی۔ مگر سلف اور دیگر مفسرین نے اس سے جو قیامت میں صورِ اسرافیل مراد لیا ہے وہی صحیح ہے اور بعد کی آیات بھی اس کی مؤید ہیں۔

﴿وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ﴾ "وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔" میں ان کے اخلاقی دیوالیے پن کا بیان ہے کہ ان کا شغل جھگڑا اور باہمی نزاع ہوگا۔ اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہوں گے۔ حدیث میں بھی ہے:

((إن الساعة لا تقوم إلا على شرار الخلق.)) ④

"قیامت شریر لوگوں پر ہی قائم ہوگی۔"

﴿فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً﴾ یہ اچانک قیامِ قیامت کی مزید وضاحت ہے کہ وہ کسی کو وصیت کرنے کی طاقت رکھیں گے اور نہ ہی اپنے گھروں کو واپس آسکیں گے۔ جہاں کہیں بھی ہوں گے مر جائیں گے۔

اس آیت سے وصیت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ جو آدمی کسی دشوار اور کٹھن سفر پر جا

---

① یٰسٓ:29 ② الحجر:73

③ ھود:67، 94 ④ صحیح مسلم:1924

رہا ہو وہ اہل خانہ کو وصیت کرتا ہے۔ یہ دنیا بھی مسافر خانہ ہے۔ انسان مسافر ہے منزل ہے، معلوم نہیں کون کب موت کے گھوڑے پر سوار ہو کر قبر کی طرف چل دے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ اس لیے کسی بھی مسلمان کو اپنی وصیت کے بارے میں غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((ما حق امرئ مسلم له شيء يوصي فيه يبيت ليلتين إلّا ووصيته مكتوبة عنده.))①

"کسی مسلمان کو جس کے پاس وصیت کے لائق مال ہو، مناسب نہیں کہ وہ دو راتیں اس طرح گزار دے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی نہ ہو۔"

ایک روایت میں دو راتوں کی بجائے تین راتوں کا ذکر ہے۔ امام نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ فرماتے تھے: جب سے میں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے ایک رات بھی نہیں گزری مگر میری وصیت میرے پاس لکھی ہوتی تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کفار کے اس مطالبے پر کہ یہ وعدۂ حق کب آئے گا، یہ نہیں بتلایا گیا کہ یہ (قیامت) کس ماہ اور کس سال آئے گی بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کا آنا تو ایک شدنی حقیقت ہے جو آناً فاناً آ جائے گی۔ جس میں اشارہ ہے کہ تم بس اس کی تیاری کرو۔ حدیث میں بھی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کے پوچھنے لگا: "متى الساعة" "قیامت کب آئے گی؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((وما ذا أعددت لها؟)) "تو نے اس کی کیا تیاری کی ہے؟"②

یہاں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اس کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری کی جائے۔ یوں نہیں کہ اس کے انتظار میں وقت ضائع کیا جائے کہ جب آئے گی دیکھا جائے گا۔ ان غفلت شعاروں کو بتلایا گیا ہے کہ جب وہ وقت آئے گا تو پھر سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کب ملے گا۔

---

① بخاري: 4838، مسلم: 4207　② بخاري: 3688، مسلم: 2639

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝﴾ [یٰسٓ:51-54]

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔ کہیں گے: ہائے ہماری بربادی! کس نے ہمیں ہماری سونے کی جگہ سے اٹھا دیا؟ یہ وہ ہے جو رحمان نے وعدہ کیا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔ نہیں ہوگی مگر ایک ہی چیخ تو اچانک وہ سب ہمارے پاس حاضر کیے ہوئے ہوں گے۔ پس آج کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور نہ تمھیں اُس کے سوا کوئی بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔''

پہلی آیات ① میں جس چیخ کا ذکر ہے اس سے مراد صور میں حضرت اسرافیل علیہ السلام کی ایک پھونک ہے یہ نفخہ اولیٰ ہے جس کے سنتے ہی انسان بے ہوش ہو کر مر جائیں گے اور جو جہاں ہوگا وہ اپنے انجام سے دوچار ہو جائے گا۔

علامہ ابن العربی اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ کی رائے ہے کہ صور میں تین بار پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخہ نفخة الفزع ہے جس سے تمام زمین اور آسمانوں میں بسنے والے خوفزدہ ہو جائیں گے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ ②

---

① یٰسٓ: 29، 49 ② النمل: 87

"اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے گھبرا جائے گا مگر جسے اللہ نے چاہا۔" ①

علامہ ابن حزم چار نفخوں کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ نفخے دو ہیں:

ایک نفخة الفزع ، یہی نفخة الصاعقة ہے جس کا ذکر سورۃ الزمر میں ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ ②

"اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہوں گے مر کر گر جائیں گے مگر جسے اللہ نے چاہا، پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔"

سورۃ النمل میں صور میں پھونکے جانے کے بعد ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کا ذکر ہے اور اسی کے نتیجے میں لوگ موت کے منہ میں چلے جائیں گے، جیسا کہ سورۃ الزمر میں بیان ہوا۔ اور دونوں میں "إلا من شاء الله" قدر مشترک ہے۔ اس کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے:

((ثم ينفخ في الصور فلا يسمعه أحد إلا أصغى ليتا ورفع ليتا.)) قال: ((وأول من يسمعه رجل يلوط حوض إبله فيصعق ويصعق الناس، ثم يرسل الله مطرا كأنه الطل فينبت منه أجساد الناس ثم ينفخ فيه أخرى فإذا هم قيام ينظرون.)) ③

"پھر صور میں پھونکا جائے گا۔ جو بھی اس کی آواز سنے گا وہ اپنی گردن ایک طرف جھکا دے گا اور دوسری طرف بلند کرے گا۔ اور سب سے پہلے یہ آواز

---

① ابن كثير: 3/502، النهاية: 1/180 ② الزمر: 68

③ صحيح مسلم: 2940، أحمد: 2/ 166

وہ آدمی سنے گا جو اپنے اونٹوں کا حوض لیپتا ہوگا۔ وہ اور دوسرے تمام لوگ مر جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ شبنم کی مانند بارش برسائے گا جس سے لوگوں کے جسموں میں حیاتِ نو آئے گی، پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہو جائیں گے۔''

ظاہر ہے اگر اس سے پہلے بھی نفخہ ہوتا جسے نفخة الفزع کہا گیا ہے تو یہاں اس کا ذکر بھی ہوتا۔ پہلی بار نفخة الصاعقة کا ہی ذکر نہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے کہ فرشتہ صور میں پھونکے گا تو زمین و آسمان کے مابین تمام مخلوق مر جائے گی سوائے ان کے جنھیں اللہ باقی رکھے گا۔ پھر دو نفخوں کے مابین اتنا وقفہ ہوگا جتنا اللہ چاہے گا۔ حضرت اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے افضل دن جمعہ ہے۔ اسی میں صاعقہ ہے، اسی میں نفخہ ہے۔ یعنی نفخہ صاعقہ، نفخہ موت اور قبروں سے اٹھنے کا نفخہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو نفخوں کے مابین چالیس کا وقفہ ہوگا۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ چالیس دن یا چالیس سال مراد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: یہ میں نہیں جانتا۔ میں نے بس چالیس کا لفظ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے سنا ہے۔ حافظ ابن حجر یہ احادیث ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ یہ احادیث دلیل ہیں کہ نفخے دو ہی ہیں۔ ①

علامہ قرطبیؒ نے بھی التذکرہ ② اور تفسیر الجامع لأحکام القرآن ③ میں دو نفخوں کا ہی ذکر کیا ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔

''صور'' سے مراد قرن، نرسنگھے یا بگل کی طرح کی کوئی چیز ہے جس میں حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونک ماریں گے۔ اسی ''صور'' کو قرآنِ مجید میں ''ناقور'' بھی کہا گیا ہے:

﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ o﴾ ④

---

① فتح الباري: 11/370، 6/ 446
② التذکرہ: 226، 238
③ الجامع لأحکام القرآن: 13/ 239
④ المدثر: 8

''سو جب صور میں پھونکا جائے گا۔''

''النقر'' کے معنی ہیں کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتی کہ اس میں سوراخ ہو جائے۔ ''النقرۃ'' گڑھے کو کہتے ہیں جس میں سیلاب کا پانی باقی رہ جاتا ہے۔ گردن کی پچھلی جانب گڑھے کو ''نقرۃ القفا'' کہتے ہیں۔ ''النقیر'' اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں گڑھا کر کے نبیذ وغیرہ ڈالتے ہیں۔ یوں بگل اور صور کو بھی ''ناقور'' اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں سوراخ ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا: ''صور'' کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ((قرن ينفخ فيه.)) ''وہ قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔'' ①

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نعمتوں کی لذت کیسے پاؤں؟ صاحب صور نے قرن کو منہ سے لگا رکھا ہے، اس نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور کان پھونکنے کے حکم کے انتظار میں لگا رکھے ہیں کہ صور پھونکنے کا کب حکم ملتا ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم اس دن کیا کہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یوں کہو:

((حسبنا الله ونعم الوكيل على الله توكلنا.)) ②

ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے اور اللہ پر ہی ہمارا بھروسہ ہے۔

علامہ قرطبی نے فرمایا ہے کہ بعض گمراہوں نے صور کے قرن ہونے کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ انکار اسی طرح کا ہے جس طرح انکار کرنے والوں نے پل صراط اور وزن اعمال کا انکار کیا ہے اور اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں۔ جس طرح میزان کے بارے میں ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کے ایک پلڑے میں آ جائیں گے اسی طرح ''قرن''

---

① ترمذي: 2430 وحسنه ابن حبان وغيرهما

③ ترمذي: 2431، وحسنه ابن حبان وغيرهما

کے بارے میں ہے کہ اس کا دائرہ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ ① جو شخص جہاں ہوگا اسے صور کی آواز ایسے سنائی دے گی جیسے کوئی قریب سے آواز دے رہا ہے۔ مشرق ومغرب اور شمال وجنوب، ہر جانب پورے کرۂ ارض میں پڑے انسانوں کو یہ آواز یکساں سنائی دے گی۔

﴿مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ﴾ "الاجداث"، "جدث" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں قبر۔ ﴿یَنْسِلُوْنَ﴾ یہ "النسل" سے ہے جس کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے کے ہیں۔ اونٹ کے بال جھڑتے ہیں تو کہا جاتا ہے:

««نسل الوبر عن البعير.»» ②

"اون اونٹ سے الگ ہوگئی۔"

"النسل" اولاد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی ماں کے پیٹ سے جدا ہوئی ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے کہ کچھ لوگ لوگوں کے سامنے زبان سے بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں مگر جب واپس پلٹتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ﴿ویهلك الحرث والنسل﴾ "اور کھیتی اور نسل (انسانوں اور حیوانوں کی اولاد) کو برباد کرتے ہیں۔" اس آیت میں ﴿ینسلون﴾ کے بھی یہی معنی ہیں کہ جب صور میں پھونکا جائے گا تو لوگ اپنے رب کی طرف قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔

بعض نے "ینسلون" کے معنی "یَسْرَعُوْنَ" کیے ہیں کہ جلدی جلدی، تیز تیز قدموں سے اپنے رب کے ہاں پہنچیں گے۔ ③

اس کی تائید قرآنِ مجید سے بھی ہوتی ہے:

﴿یَوْمَ یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ○﴾ ④

"جس دن وہ قبروں سے تیز دوڑتے ہوئے نکلیں گے جیسے وہ کسی گاڑے ہوئے نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔"

---

① التذکرة ② المفردات ③ قرطبی، ابن کثیر وغیرہ ④ المعارج:43

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ○ مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ○﴾ ①

''ان کی نظریں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوں۔ پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے، کافر کہیں گے: یہ بڑا مشکل دن ہے۔''

جس طرح قیامت آناً فاناً قائم ہوگی اسی طرح قبروں سے بھی فی الفور نکلیں گے:

﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا﴾ ②

جس دن زمین ان سے پھٹے گی، اس حال میں کہ وہ تیز دوڑنے والے ہوں گے۔

یہاں چند اُمور غور طلب ہیں جن کی طرف امام رازیؒ نے اشارہ کیا ہے جسے ضروری تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا مناسب ہوگا:

❀......اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں سے نکلیں گے تو تیزی کے ساتھ میدانِ محشر کی طرف چل دیں گے، جب کہ سورۃ الزمر میں ہے: ﴿فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ ③ ''تو اچانک وہ کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔'' اور کھڑا ہونا بظاہر دوڑنے کے منافی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں:

(1)......کھڑا ہونا تیز چلنے اور بھاگنے کے منافی نہیں کیونکہ تیز چلنے والا بھی تو کھڑا ہو کر ہی بھاگتا ہے اور پریشانی کے عالم میں انسان اِدھر اُدھر دیکھتا بھی ہے، کھڑا بھی ہوتا ہے اور بھاگتا بھی ہے۔ اس لیے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(2)......تیزی کے ساتھ چلنے میں کئی امور جمع ہو سکتے ہیں، جیسے کہا گیا:

مکر مفر مقبل مدبر معاً
کجلمود صخر حطه السیل من عل

---

① القمر:8,7 ② ق:44 ③ الزمر:68

یعنی پتھر کا ٹکڑا جیسے سیلاب میں بلندی سے نیچے آتا ہے تو ٹھہرتا ہے، لڑکھڑاتا ہے، الٹا سیدھا ہوتا ہے۔ ان سب حالتوں سے گزرتا ہوا بڑی تیزی سے نیچے آتا ہے۔ لہٰذا اس تیزی میں متعدد اُمور کا جمع ہونا ناممکن نہیں۔

(3)...... اور ایک تیسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبروں سے اٹھیں گے تو پریشانی اور حیرت میں کھڑے ہوں گے، پھر تیزی سے میدانِ محشر کی طرف دوڑیں گے۔

❀...... نفخہ صور سے مرنے اور زندہ ہونے کے دو متضاد اُمور کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ''صور'' تو ایک آلہ ہے، موت وحیات میں اصل مؤثر ذات تو اللہ ذوالجلال والاکرام کی ہے، مثلاً: آگ میں اللہ نے جلانے کی تاثیر رکھی ہے مگر جب چاہتا ہے ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتشِ نمرود کو گلزار بنا دیتا ہے۔ صورِ اسرافیل علیہ السلام میں ایک تناسب بھی ہے کہ ایک بار پھونکنے سے اجسام میں اضطراب وتزلزل ہو جو موت کا باعث بنے گا اور دوسری بار پھونکنے سے مردہ اجساد کے بکھرے اعضاء اضطراب وتزلزل سے مجتمع ہوں گے اور انسان زندہ ہو جائے گا۔

❀...... ایک سوال یہ ہے کہ جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو اس وقت قبریں کہاں ہوں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قبروں سے مراد وہ محل ہے جہاں دفن کیا گیا ہے۔ ان کے اجزاء گو بکھر گئے ہوں گے، گوشت پوست ختم اور ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوگئی ہوں گی مگر ریڑھ کی ہڈی باقی رہے گی، یہی اصل ہے۔ اس کے ساتھ باقی اجزاء بھی آملیں گے اور یہ اصل اور اس کے اجزاء جہاں بھی ہوں گے وہی جگہ ان کی قبر ہے۔

❀...... یہ مقام تو خوف اور ہیبت کا ہوگا۔ اور آیت میں ﴿اِلٰی رَبِّهِمْ﴾ کہا گیا ہے۔ رب کا لفظ رحمت وشفقت کی علامت ہے، یہاں ''اللہ'' کا لفظ چاہیے تھا جو عظمت وجلال کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں رب کا لفظ ہی مناسب ہے کیونکہ جب نافرمان اور باغی اپنے محسن کی طرف متوجہ ہوگا تو اس کے لیے ندامت اور اَلم میں اضافہ ہوگا کہ رحمٰن نے اپنی رحمت کی تو انتہا کردی مگر وہ کس ناشکری اور ناقدری کا مرتکب رہا۔

❀...... نافرمان جب اپنے محسن کی طرف بڑھتا ہے تو شرمندگی میں ایک قدم چلتا ہے، پھر رک جاتا ہے کہ کس منہ سے جاؤں۔ جب کہ وہاں تو وہ جلدی جلدی تیزی سے آگے

بڑھے گا تو وہاں یہ تیز رفتاری کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تیزی اس کے اختیار میں نہیں ہوگی۔ ایک ہی وقت میں وہ رکے گا اور تیز تیز بھی چلے گا جیسا کہ اوپر شعر میں ذکر ہوا ہے۔

﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ یہ کفار کا قول ہوگا کہ ہائے ہماری بربادی! ہماری قبروں سے کس نے ہمیں اٹھادیا۔ یوں وہ اپنی بدبختی کا اعتراف کریں گے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہم کیسے دوبارہ زندہ ہوں گے لیکن یہ اَن ہونی تو ہوگئی۔

﴿مَرْقَدِنَا﴾ یہ "الرقاد" سے ظرف مکان ہے اور یہ رقد سے ہے، جس کے معنی ہیں سونا۔ اور رقود، راقد کی جمع ہے جیسے سجود ساجد کی جمع ہے۔ اور الرقاد کے معنی ہیں ہلکی سی نیند۔ اصحابِ کہف کے بارے میں ہے:

﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ﴾ ①

''اور تو انھیں جاگتے ہوئے خیال کرے گا حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔''

اصحابِ کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر ''رقود'' کا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نیند خواہ کتنی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلے میں وہ ہلکی سی نیند کی حیثیت رکھتی ہے۔② اس لیے ''مرقد'' کے اصل معنی خواب گاہ کے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر میں منکر نکیر جب مومن سے (دیگر سوالات کے ساتھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھیں گے تو وہ کہے گا:

«هو عبد الله ورسوله، أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله.»

''وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک اللہ

---

① الکہف:18 ② مفردات

کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔"

تو فرشتے کہیں گے: ہم یہی سمجھتے تھے کہ تم یہی جواب دو گے، پھر اس کی قبر کو منور اور ستر ہاتھ کشادہ کر دیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے: "نم کنومة العروس" "دلہن کے سونے کی طرح تم آرام سے سو جاؤ۔" ①

یہاں اس حدیث میں بھی قبر کو مومن کے لیے خواب گاہ بتلایا گیا ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: النوم اخو الموت کہ نیند اور موت میں بھائی چارہ ہے۔ ② یعنی نیند موت سے ملتی جلتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: "اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کو نیند میں، پھر اسے روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کیا اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک بھیج دیتا ہے۔" ③ اس آیت کریمہ سے بھی معلوم ہوتا ہے موت اور نیند میں یک گونا موافقت ہے، فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی کیفیت بیداری سے بدل جاتی ہے اور مرنے والے کی کیفیت قیام قیامت تک باقی رہے گی۔ جس طرح نیند میں انسان خواب کے دوران فرحت و راحت اور رنج والم محسوس کرتا ہے اسی طرح موت کی کیفیت میں بھی رنج والم یا انعام واکرام کا احساس میت کو من جانب اللہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ عذاب قبر یا راحت قبر سے دوچار ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ میت ہے۔ دنیوی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی علاقہ یا نسبت نہیں۔

آرام و راحت کی حالت میں تو قبر مومن کے لیے خواب گاہ ہے، مگر کافر کے لیے عذاب گاہ ہے۔ قبر کافر پر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں باہم بھینچ جاتی ہیں، قیامت تک وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی تفصیل دیگر احادیث میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کافر کی قبر اُس کے لیے خواب گاہ کیسے ہو سکتی ہے؟ یہاں کفار کے قول "ہماری خواب گاہ سے ہمیں کس نے اٹھا دیا" سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو عذاب میں مبتلا ہوں گے، خواب گاہ سے اٹھنے میں تو بظاہر عذابِ قبر کی نفی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علمائے کرام نے دو جواب دیے ہیں:

---

① ترمذي: 1071، ابن حبان: 3117 وغيرهما ② الصحيحة: 1087 ③ الزمر: 42

1: ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ نفخہ اولیٰ اور نفخہ ثانیہ کے مابین جو چالیس (سال یا ماہ یا دن) کا وقفہ ہوگا اس میں کچھ عرصہ کے لیے عذابِ قبر سے تخفیف کر دی جائے گی اور نیند کی سی کیفیت ہوگی۔ یہ قول ابی ابن کعب، مجاہد، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ ① اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی منقول ہے مگر وہ سخت ضعیف ہے۔ ②

2: دوسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی کو دیکھ کر وہ عذابِ قبر کو بھول جائیں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن القبر أول منازل الآخرة، فإن نجا منه أحد فما بعده أيسر منه، وإن لم ينج منه فما بعده أشد منه.)) ③

"قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اگر کوئی اس میں نجات پا گیا تو اس کے بعد اس کے لیے زیادہ آسانی ہوگی اور اگر اس میں نجات نہ پا سکا تو اس کے بعد اس کے لیے زیادہ سختی ہوگی۔"

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے موت سے بڑھ کر کوئی تکلیف اسے نہیں پہنچتی، پھر موت کے بعد جو کچھ ہے اس سے موت کم تکلیف دہ ہے۔ لوگ قیامت کے دن کی شدت پائیں گے حتی کہ پسینہ منہ تک ہوگا۔ اگر کشتیاں اس میں چلائی جائیں تو وہ اس پسینے میں چل سکیں گی۔" ④

احادیث میں ہے کہ سورج ایک میل کی مسافت پر بلند ہوگا۔ دماغ ہنڈیا کی طرح ابلیں گے۔ اعمال کے مطابق کوئی اپنے پسینے میں ٹخنوں تک، کوئی پنڈلیوں تک اور کوئی اپنے وسط تک ڈوبا ہوا ہوگا اور کسی کے منہ تک پسینے کی لگام ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

---

① ابن کثیر: 632/3

② اہوال القبور لابن رجب :ص 134

③ ترمذي: 2308، ابن ماجه:4268

④ طبرانی، أحمد، اسنادہ جید، مجمع: 10/ 334

سے روایت ہے کہ کافر کا پسینہ منہ تک ہوگا اور وہ کہے گا:

((رب ارحمنی ولو إلى النار.))①

''اے میرے رب! اس سے مجھے آرام دے اگرچہ آگ میں ہی سہی۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب برہنہ اُٹھیں گے۔'' میں نے عرض کیا: سب مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یا عائشة! الأمر أشد من أن ینظر بعضهم إلى بعض.))

''اے عائشہ! معاملہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے کہیں زیادہ سخت ہوگا۔''

اس منظر کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ التکویر، الانفطار، الزلزال اور القارعہ میں بھی فرمایا ہے۔ اسی ہولناکی کا ذکر یوں بھی ہوا ہے:

﴿یَوۡمَ تَرَوۡنَهَا تَذۡهَلُ كُلُّ مُرۡضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا وَ تَرَی النَّاسَ سُكٰرٰی وَ مَا هُمۡ بِسُكٰرٰی وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیۡدٌ۝﴾ ②

''جس دن تم اسے دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اس سے غافل ہو جائے گی جسے اس نے دودھ پلایا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا حالانکہ وہ ہرگز نشے میں نہیں ہوں گے اور لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔'' (أعاذنا الله منه)

ایسے ہی خوف ناک اور وحشت ناک دن کو جب کفار دیکھیں گے تو قبر خواب گاہ محسوس ہوگی اور قبر کے عذاب کو بھول جائیں گے اور کہیں گے کہ ہمیں ہماری خواب گاہ سے کس نے اٹھایا ہے؟

---

① طبراني ورجاله رجال الصحيح، مجمع: 10 / 336 ② الحج:2

﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ ''یہ وہ ہے جو رحمان نے وعدہ کیا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔'' یہ قول کفار کے پہلو میں کھڑے مومنوں کا ہوگا جیسا کہ امام مجاہدؒ اور قتادہؒ وغیرہ سے منقول ہے۔ امام حسنؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول فرشتوں کا ہوگا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں، دونوں ہی یہ بات کہیں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں سارا مقولہ کفار کا ہی ہوگا۔ مگر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے موقف کو ہی ترجیح دی ہے کہ یہ مومنوں کا قول ہوگا کیونکہ کفار تو پہلے ﴿مَنْ بَعَثَنَا﴾ کہہ کر اٹھانے والے کا انکار کر رہے ہوں گے۔ ان کے اسی جہل کو دور کرنے کے لیے مومن یہ قول کہیں گے کہ یہ رحمان کا وعدہ تھا اور رسولوں نے اس بارے آگاہ کیا تھا اور وہ بالکل سچے تھے۔ اسی حقیقت کا اظہار سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں ہے:

﴿وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ ①

''اور کہیں گے: ہائے ہماری بربادی! یہ تو جزا کا دن ہے۔ یہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

یہاں بھی پہلا قول کفار کا ہے اور دوسرا مومنوں کا یا فرشتوں کا۔ ② اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ③

''اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) ایک گھڑی کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح وہ بہکائے جاتے تھے۔ اور وہ لوگ جنھیں علم

---

① الصّٰفّٰت:21،20 ② ابن کثیر ③ الروم:56،55

اور ایمان دیا گیا کہیں گے کہ بلاشبہ یقیناً تم اللہ کی کتاب میں اٹھائے جانے کے دن تک ٹھہرے رہے، سو یہ اٹھائے جانے کا دن ہے اور لیکن تم نہیں جانتے تھے۔“

ان آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار قبروں سے نکل کر میدان محشر میں سراسیمگی اور پریشانی میں بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے اور مختلف باتیں بنائیں گے تو انھیں مومن یا فرشتے جواب دیں گے۔ ان آیات کی روشنی میں اسی قول کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اصح قرار دیا ہے۔

ایک قول، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، یہ بھی ہے کہ یہ جملہ بھی کفار ہی کہیں گے اور قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ اسی کا وعدہ تو رسول کرتے تھے اور آج واقعتاً ان کی بات سچی ثابت ہوئی ہے۔ لیکن ان کا یہ اعتراف ان کے کسی کام نہیں آئے گا۔ جس طرح دنیوی عذاب دیکھ کر ایمان لانے والوں کا ایمان انھیں کوئی نفع نہیں دیتا، جیسا کہ سورۂ غافر میں ہے:

﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا﴾ ①

”پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا: ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنھیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے۔ پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔“

دنیا کے عذاب کی طرح اُخروی عذاب دیکھ کر اور قیامت کی ہولناکی کو پا کر ایمان کا اقرار کریں گے مگر یہ اقرار قابلِ اعتبار نہیں ہوگا۔ یہاں کفار ﴿وَعَدَ الرَّحْمٰنُ﴾ کہیں

---

① غافر: 85,84

گے کہ اللہ نے اپنی رحمت ورأفت کی بنا پر دنیا میں ہمیں اس دن سے خبردار کر دیا تھا تاکہ ہم اس دن کے عذاب سے بچ جائیں۔ اور رسولوں نے بھی سچ کہا تھا مگر ہم ہی قسمت کے مارے تھے کہ ہم نے اس بات پر کان نہ دھرے اور آج وہ حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ مگر امام ابن جریرؒ وغیرہ نے پہلے قول کو ہی راجح قرار دیا ہے۔

﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ﴾ "یہ ہے وہ جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا۔"

﴿اَلرَّحْمٰنُ﴾ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں ایک اسم ہے۔ اور علمیت کے اعتبار سے اسم "الله" کے برابر ہے جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ①

"کہہ دے: اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، تم جس کو بھی پکارو گے سو یہ بہترین نام اسی کے ہیں۔"

اس لیے "اللہ" کی طرح "الرحمٰن" بھی اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا یہ نام نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ "الرحیم" نام انسان کا ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک "رحیم" قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ ② "الرحیم" باعتبار فاعل کے ہے: نہایت رحم کرنے والا، یعنی رحیم (فعیل کے وزن پر) فاعل کے معنی میں ہوتا ہے جیسے سمیع بمعنی سامع ہے اور کبھی یہ مفعول کے معنی میں ہوتا ہے جیسے قتیل بمعنی مقتول ہے۔ اس میں مبالغے کا پہلو نہیں ہے۔ جب کہ "الرحمٰن" بہ اعتبار وصف کے ہے کہ وہ وسیع رحمت اور بدرجہ اتم رحمت والا ہے اور یہ مبالغہ کے لیے ہے جیسے غضبان، شبعان ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وصف اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ قیامت میں اللہ کی اسی رحمت کا اظہار زیادہ ہوگا۔ اسی لیے یہاں ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ﴾ کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ایک سو درجے

---

① بني إسرائيل:110 ② التوبة:128

بنائے ہیں، ایک درجہ کا اظہار دنیا میں ہے۔ مخلوق میں باہم پیار، محبت اور رحمت اسی ایک درجہ رحمت کا نتیجہ ہے اور باقی 99 درجات کا اظہار قیامت کے دن ہوگا۔ ①

مومنوں پر رحمتوں کی برکھا بے پایاں ہوگی۔ اس اعتبار سے وہ یہی کہیں گے ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ﴾ اور رسولوں نے بھی اس کے بارے میں سچی خبر دے دی۔ "صدق" کے دراصل معنی ہیں "أخبر بالصدق" اس میں قائل کی صداقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ گویا اس جملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر مومنین کے ایمان و ایقان کا اظہار بھی ہے۔

﴿اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ بس ایک چیخ اور ایک آوازہ ہوگا۔ جس طرح ہم اللہ تعالیٰ "کن" کہہ کر جو چاہتے ہیں بلا تاخیر وجود میں لے آتے ہیں۔ اسی طرح ایک چیخ سے قیامت برپا کر دیں گے۔ اسے کسی بڑے سے بڑے کام کے لیے دوسری بار حکم دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دوسری بار تو حکم وہ کرتا ہے جو عاجز ہو اور اس کی کوئی سنی نہ جائے مگر وہ تو قادر مطلق ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝﴾ ②

"اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے جیسے آنکھ کی ایک جھپک۔"

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿صَيْحَةً﴾ میں "ۃ" تانیث کی ہے جو یہاں مبالغے کے لیے آئی ہے، یعنی بڑی چیخ جسے زمین و آسمان میں بسنے والے سبھی سنیں گے۔ بلکہ قیامت کے جس قدر نام ہیں سبھی کے آخر میں "ۃ" مبالغے کے لیے ہے، جیسے: القیامة (بہت ثابت شدہ حقیقت)، القارعة، الطامة، الحسرة، الواقعة، الحاقة، الصاخة، الغاشیة.

﴿صَيْحَةً وَّاحِدَةً﴾ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس ایک بلند چیخ و چنگھاڑ اور

---

① ابن ماجه، أحمد وغيره۔ المجمع: 10/ 385

② القمر:50

ڈانٹ ہوگی۔ یوں نہیں کہ فرشتہ کوئی مخصوص الفاظ کہے گا، جیسا کہ بعض تفاسیر میں ذکر ہوا ہے۔اور ہم پہلے سورۂ قٓ کی تفسیر میں ذکر کر آئے ہیں۔ ①

﴿فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ﴾ سخت آواز کے بعد آناً فاناً سب کے سب، چھوٹے بڑے، عابد وزاہد، معبودانِ باطلہ اور امیر وغریب ہمارے پاس جمع کیے جائیں گے۔ ﴿مُحْضَرُوْنَ﴾ میں حاضرین کی بے بسی کی تصویر کشی ہے، جیسے مجرموں کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی میری عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔ اس کی کچھ تفصیل سورۂ قٓ میں بیان ہوئی ہے۔ ②

﴿فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ﴾ آج کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ مومن اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں کامیابی حاصل کریں گے، کوئی نیکی ان کی ضائع نہیں ہوگی، جیسے فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا﴾ ③

”اور جو شخص اچھی قسم کے اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو وہ نہ کسی بے انصافی سے ڈرے گا اور نہ حق تلفی سے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ”پس جو شخص نیک اعمال کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی کوئی ناقدری نہیں اور یقیناً ہم اس کے لیے لکھنے والے ہیں۔“ ④

نہ ان کی حسنات اور ان کے اجر میں کمی کی جائے گی، نہ ہی ان کی سیئات میں اضافہ ہوگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ اچھے اعمال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوں:

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ ⑤

”اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو گے تو وہ تمھیں تمھارے اعمال میں کچھ کمی

---

① تفسیر سورہ قٓ: 192 ② تفسیر سورۂ قٓ: 23,21
③ طٰہٰ: 112 ④ الانبیاء: 94 ⑤ الحجرات: 14

نہیں کرے گا۔"

ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبۡطِلُوٓا اَعۡمَالَكُمۡ○﴾ ①

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانو اور اپنے اعمال باطل مت کرو۔"

کیونکہ جو اعمالِ حسنہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں ہوں گے وہ مردود اور باطل ہیں، چنانچہ صدیقہ کائنات حضرت سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد.)) ②

"جس نے ہمارے دین میں ایسی نئی بات نکالی جو اس میں سے نہیں وہ مردود ہے۔"

اسی طرح کفر وشرک ایسا بُرا عمل ہے کہ اس سے تمام حسنات برباد ہو جاتی ہیں اور قیامت کے روز کفار ومشرکین کے تمام اچھے کام بے کار ثابت ہوں گے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ○﴾ ③

"یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہو گیا جو کچھ انھوں نے اس (دنیا) میں کیا اور بے کار ہے جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔"

یہی بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ المائدہ ④ میں بھی فرمائی ہے۔ قیامت کے دن ہر کوئی اپنا عمل دیکھ لے گا:

---

① محمد:33 ② صحيح بخاري: 2697
③ هود:16 ④ المائده :5

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ ①

''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا اور جو شخص ایک ذرہ برابر بُرائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''

یہی بات تفصیل سے سورۃ الانبیاء میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ②

کافر ومشرک جن اعمال کو نیکیاں سمجھتا ہے وہ قیامت کے روز انھیں دیکھے گا مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو ایمان کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتا ہے اس کی حسنات بھی برباد ہو جائیں گی عام انسان تو کجا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام سے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ ۝﴾ ③

''اور بلاشبہ یقیناً تیری طرف وحی کی گئی اور ان لوگوں کی طرف بھی جو تجھ سے پہلے تھے کہ بلاشبہ اگر تُو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تُو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا۔''

لہٰذا مومن سے ظلم کی نفی یہ ہے کہ اس کے تمام اعمال کا اسے پورا پورا اجر ملے گا، کوئی عمل ضائع نہیں ہوگا، جیسے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً وَّ لَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ④

''جو بھی نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انھیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے ان

---

① الزلزال:8,7 ② الانبیاء:47 ③ الزمر:65 ④ النحل:97

بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔''

اور کافر سے ظلم کی نفی کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ وہ کریں گے اسی کی سزا انھیں ملے گی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سو اُسے جزا نہیں دی جائے گی مگر اسی کی مثل اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' ① رہے ان کے نیک اعمال تو وہ ان کے کفر و شرک کی وجہ سے بے وزن ہو جائیں گے۔

''ظلم'' کے معنی ہیں: ''وضع الشيء علی غیر محله.'' ''کسی چیز کا اس کے مقام و محل کے علاوہ کسی اور جگہ رکھنا۔'' گویا جس کسی نے دنیا میں اپنے آپ کو جس مقام پر رکھا ہے وہی مقام آخرت میں ملے گا۔ اگر دنیا میں مومنوں کا ساتھی رہا ہے تو آخرت میں بھی انھی کے ساتھ ہوگا اور جس نے کفار کو ساتھی بنایا آخرت میں بھی انھی کے ساتھ رہے گا، جیسے فرمایا:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًاؕ﴾ ②

''اور جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔''

نافرمانوں اور مشرکوں کے بارے میں فرمایا: ''اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔ ③ یعنی زانی زانیوں کے ساتھ، سودخور سودخوروں کے ساتھ، شرابی شراب نوشوں کے ساتھ اور مشرکین اپنے جھوٹے معبودوں کے ساتھ ہوں گے۔

﴿وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ آج نہ کسی پر ظلم ہوگا اور نہ اس کے سوا بدلہ دیا

---

① الانعام:160 ② النساء:69 ③ الصّٰفّٰت:22

جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔ یہ عدل وانصاف کا دن ہے، جو کچھ کسی نے کیا ہوگا اسی کا بدلہ اسے ملے گا، جیسے فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ①

”جو شخص نیکی لے کر آیا تو اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو بُرائی لے کر آیا تو جن لوگوں نے بُرے کام کیے وہ بدلہ نہیں دیے جائیں گے مگر اسی کا جو وہ کیا کرتے تھے۔“

نیز فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ o وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ o﴾ ②

”جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر بدلہ ہے اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔ اور جو بُرائی لے کر آئے گا تو ان کے چہرے آگ میں اوندھے ڈالے جائیں گے، تم بدلہ نہیں دیے جاؤ گے مگر اسی کا جو تم کیا کرتے تھے۔“

حضرت ابن مسعود، ابن عباس، ابو ہریرہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہم اور بہت سے تابعین رحمہم اللہ یہاں ”السيئة“ سے کفر و شرک مراد لیتے ہیں۔ ③

گویا کفر و شرک کا بدلہ جہنم ہے، اس کے ساتھ کوئی نیکی اسے فائدہ نہیں دے گی۔

علامہ رازیؒ نے یہاں عجیب بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ﴿لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ میں عموم ہے اور یہ حکم مومن اور کافر دونوں کے بارے میں ہے۔ مگر ﴿وَلَا تُجْزَوْنَ﴾ کا حکم صرف کافروں کے لیے ہے کیونکہ مومن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان اعمال کی بھی جزا دے گا جو اس نے نہیں کیے ہوں گے۔ ④

---

① القصص:84 ② النمل:89،90
③ ابن کثیر:502/3 ④ التفسير الكبير: 90/25

جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی انسان کو اس کے جسم میں کوئی بیماری لاحق کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں سے فرماتے ہیں:

«اکتبوا لعبدي في کل یوم ولیلة ما کان یعمل من خیر ما کان في وثاقي.» ①

''جب تک میرا بندہ میری پکڑ میں ہے اس کے نیک عمل کو جو وہ (صحت میں) کیا کرتا تھا ہر شب و روز لکھتے رہو۔''

اسی طرح حضرت ابوالاشعث صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد دمشق کی طرف گیا تو میری ملاقات شداد بن اوس انصاری اور الصنابحی رضی اللہ عنہما سے ہوئی۔ میں نے کہا: ''اللہ کی آپ پر رحمت ہو، کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''یہاں ایک مضر قبیلے کے ہمارے بھائی ہیں، ہم ان کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں۔'' میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا تا آنکہ ہم اس شخص کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے اس مریض سے پوچھا: ''تمھارا کیا حال ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''صبح سے اللہ کی نعمت و رحمت ہے۔'' حضرت شداد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمھارے لیے گناہوں کے کفارے کی اور گناہوں کی معافی کی بشارت ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«إذا ابتلیت عبداً من عبادي مؤمنا فحمدني علی ما ابتلیته فَأَجْرُوْا له کما کنتم تُجْرُوْنَ له وهو صحیح.» ②

''جب میں اپنے بندوں میں سے مومن بندے کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہوں تو وہ میری آزمائش پر میری تعریف کرتا ہے، (میں فرشتوں سے کہتا ہوں:) اس کا اسی طرح اجر و ثواب لکھتے رہو جس طرح صحت کی حالت میں لکھتے تھے۔''

اس موضوع کی دیگر احادیث الترغیب والترہیب ③ میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

① مسند أحمد: 159/2، الحاکم: 348/1 وغیرهما

② أحمد: 123/4، الصحیحة: 1611

③ الترغیب والترهیب: 289/4، 292

یہ اور اسی نوعیت کی دوسری احادیث سے امام رازی رحمہ اللہ نے سمجھا ہے کہ ﴿وَلَا تُجْزَوْنَ﴾ کا خطاب کفار سے ہے کیونکہ مومن کو تو کبھی عمل کے بغیر بھی اجر ملتا ہے بلکہ اچھے عمل کا ارادہ بھی کر لے تو ایک نیکی کا مستحق بن جاتا ہے۔ مگر یہ بات محل نظر ہے، بیمار ہو یا کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کے صبر و شکر پر اسے یہ اجر ملتا ہے۔ اور مجبوری کی صورت میں عمل کا اجر اس کی حسن نیت کی بنا پر ہے۔

﴿اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ ۝ هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ فِیۡ ظِلٰلٍ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوۡنَ ۝ لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ۝ سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِيۡمٍ ۝﴾ [يٰسٓ: 55-58]

''بے شک جنت کے رہنے والے آج ایک شغل میں خوش ہیں۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے اس میں بہت پھل ہے اور ان کے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو وہ طلب کریں گے۔ ''سلام ہو'' اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔''

میدانِ محشر میں کفار کی سراسیمگی بیان کرنے کے بعد اب اہلِ ایمان کے بارے میں بتلایا جا رہا ہے کہ ان میں سے بعض کو بلا حساب اور بعض کو ہلکی باز پرس کے بعد جلد ہی جنت بھیج دیا جائے گا، یہ منظر بھی کفار کے لیے پریشانی ہی کا موجب ہوگا کہ جنھیں وہ دنیا میں کم عقل سمجھتے تھے وہ تو جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور وہ جو اپنے آپ کو بڑا عقل مند اور عزت دار سمجھتے تھے یہاں رسوا اور ذلیل ہو رہے ہیں اور جرائم کی جواب دہی میں رُکے کھڑے ہیں۔

﴿اَصۡحٰبَ﴾ صُحُبٌ کی جمع ہے اور صُحُبٌ صَاحِبٌ کی اسم جمع ہے جس کے معنی ہیں: ہمیشہ ساتھ رہنے والا، خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے، یا مکان یا زمان کے۔ اور عرف میں بھی صاحب اسی کو کہتے ہیں جو عموماً ساتھ رہے۔ مگر اس سے صحابہ کرام مختص ہیں۔ آپ ﷺ کی مصاحبت ایک لحظہ کے لیے بھی ہو تو وہ صحابی اور صاحبِ رسول ﷺ ہے۔

﴿اَلۡجَنَّةَ﴾ کو جنت کیوں کہا جاتا ہے، اس کی ضروری وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

﴿فِيْ شُغُلٍ فَاكِهُوْنَ﴾ "الشغل" ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اور ﴿فَاكِهُوْنَ﴾ اس کی اصل تو "الفاكهة" ہے جو ہر قسم کے میووں اور پھلوں پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کھجور اور انار کے علاوہ باقی میوہ جات کو "الفاكهة" کہا جاتا ہے کیونکہ قرآنِ مجید ہی میں ان دونوں کو "الفاكهة" پر عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ① چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ۝﴾ ②

''ان دونوں میں پھل اور کھجوروں کے درخت اور انار ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھجور اور انار "فاكهة" کے غیر ہیں۔ مگر علامہ یعقوب فیروز آبادی نے ''القاموس'' میں اور علامہ ازہریؒ نے بھی اس پر شدید نکیر کی ہے اور فرمایا ہے: کہ کبھی اشیاء کا پہلے فی الجملہ ذکر کیا جاتا ہے، پھر ان میں سے بعض کے شرف وفضل کی بنا پر ان کا نام الگ لیا جاتا ہے، جسے تخصیص بعد التعمیم کہا جاتا ہے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝﴾ ③

''جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔''

یہاں بھی فرشتوں کے ذکر کے بعد حضرت جبریل اور میکائیل علیہما السلام کا الگ ذکر بھی عطف کے ساتھ ہوا ہے۔ اور جو کوئی انھیں فرشتوں سے خارج قرار دیتا ہے وہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہے۔

اسی طرح ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ﴾ ④ ہے کہ لیلۃ القدر میں فرشتے

---

① مفردات ② الرحمن:68
③ البقرۃ:98 ④ القدر:4

اور روح اترتے ہیں۔ یوں یہ عطف الخاص علی العام کے اصول پر ہے۔

لہٰذا جو کھجور اور انار کو "فاکہۃ" سے خارج سمجھتا ہے وہ جاہل ہے اور اور اس کا موقف لغت عرب کے خلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انھوں نے سورۃ الرحمٰن کی مذکورہ آیت سے استدلال کر کے فرمایا ہے کہ جو قسم کھائے کہ وہ پھل نہیں کھائے گا، پھر اس نے کھجور اور انار کھا لیا تو وہ حانث (قسم توڑنے والا) نہیں ہوگا۔ امام صاحبؒ کے اس فتوے پر علامہ ازہریؒ نے سخت نکیر کی ہے اور انھیں علم لغت اور تفسیر قرآن سے بے خبری کا طعنہ دیا ہے۔ مگر اس اعتراض کا جواب علامہ علی قاریؒ نے یہ دیا ہے کہ امام صاحبؒ کا فتویٰ عقلاً ونقلاً درست ہے۔ نقلاً تو اس لیے کہ واؤ حرف عطف مغایرت کے لیے ہوتی ہے اور عقلاً اس لیے کہ فاکہۃ وہ ہے جس سے لذت ولطف حاصل ہو۔ غذا اور دوا اس سے مقصود نہ ہو۔ اور کھجور من جملہ غذا میں سے ہے اور انار دوا کے لیے مستعمل ہے (ضرب المثل بھی ہے کہ ایک انار سو بیمار)۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے یہ دلچسپ تفصیل تاج العروس ① میں بیان کی ہے۔ یہاں اس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں، بس یہ ذہن میں رہے کہ یہاں اہل جنت کے لیے میوہ جات کا ذکر ہے۔ جنت میں بیماری کا کوئی تصور نہیں، وہاں اس کا بطور پھل ہی ذکر آیا ہے۔ اور کھجور بھی غذا کے طور پر تب استعمال ہوتی ہے جب اور کوئی غذا نہ ہو۔

"فکاهة، فکه وفاکهة" کے معنی خوش طبعی کی باتیں کرنا بھی ہیں۔ "رجل فکہ" اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو اپنے دوستوں سے ہنسی خوشی کی باتیں کرے اور انھیں ہنسائے۔ اسی لیے ﴿فِیۡ شُغُلٍ فٰکِهُوۡنَ﴾ کے معنی یوں کیے گئے ہیں: "شغل میں خوش ہیں یا دلچسپیوں میں مزے لوٹنے اور لطف اٹھانے میں مشغول ہیں۔" اسی معنی میں کفار کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

---

① تاج العروس: 9/403

﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ ①

''اور جب وہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے تو خوش گپیاں کرتے ہوئے واپس آتے تھے۔''

یعنی دنیا میں یہ لوگ اپنے گھروں میں اور گھروں سے باہر خوش گپیوں میں رہتے تھے۔ یہی بات یوں بھی فرمائی گئی ہے:

﴿وَيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ ②

''اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا، بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا۔''

مگر اہل جنت کہیں گے:

﴿قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴾ ③

''کہیں گے: بلاشبہ ہم اس سے پہلے (دنیا میں) اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے۔ پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لو کے عذاب سے بچا لیا۔''

اسی طرح اہل جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ انھیں نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، آسان سا ان سے حساب ہوگا اور:

﴿وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا﴾ ④

''اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس آئے گا۔''

انھی کے بارے میں یہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا﴾ ⑤

---

① المطففین:31 ② الانشقاق:13 ③ الطور:27,26

④ الانشقاق:9 ⑤ الدھر:11,10

”یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا۔ پس اللہ نے انھیں اس دن کی مصیبت سے بچالیا اور انھیں انوکھی تازگی اور خوشی عطا فرمائی۔“

دنیا میں مسرور رہنے والوں اور خوش گپیاں کرنے والوں سے کہا جائے گا کہ آج اہلِ جنت خوش گپیوں میں رہیں گے اور خوشیاں پائیں گے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۝ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝﴾ ①

”بے شک متقی لوگ باغوں اور بڑی نعمت میں ہیں۔ لطف اٹھانے والے اس سے جو اُن کے رب نے انھیں دیا اور ان کے رب نے انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچالیا۔“

گویا آخرت سے بے خوف زندگی جہنم کا باعث بنے گی اور آخرت سے خوف کھانے والے فرحاں وشاداں ہوں گے اور خوشیوں میں مشغول رہیں گے۔

یہاں ﴿شُغُلٍ﴾ کا لفظ اپنے اندر یہ معنویت بھی رکھتا ہے جب جنت میں نہ فکرِ فردا، نہ غمِ دوش، نہ کسبِ معاش کی پروا اور نہ کسی فرض وسنت کی ادائیگی کا بوجھ، تو بے کاری کی زندگی کیا زندگی ہوگی؟ اس وہم کے ازالے کے لیے فرمایا گیا کہ ان کی تفریحات متنوع ہوں گی اور وہ ان میں مشغول رہیں گے، اکتاہٹ کا وہاں کوئی سوال ہی نہیں۔ اہل جنت کی مجلسیں ومسندیں ہوں گی، باہمی مہمان نوازیاں ہوں گی، اللہ کی طرف سے ضیافتیں ہوں گی اور ان کے خدام ہوں گے۔ جنت میں ان کی بیویاں ہوں گی، حوریں ہوں گی، سیر وسیاحت ہوگی اور اللہ ذوالجلال والاکرام کے دیدار کا شرف ہوگا۔ اور ایسے ایسے انعامات سے نت نئے اسلوب سے نوازا جائے گا جس کا تصور کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں۔

---

① الطور:18,17

حضرت ہشام بن حسانؒ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دیدار کی لذت ایسی ہوگی کہ اہلِ جنت، جنت کی نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ بلکہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

«لو علم العابدون أنهم لا یرون ربهم فی الاخرة لذابت أنفسهم في الدنیا.» ①

''اگر عبادت گزاروں کو علم ہو جائے کہ وہ قیامت کے دن اپنے رب کی زیارت سے محروم رہیں گے تو دنیا میں ہی وہ ختم ہو جائیں۔''

جناب ذوالنونؒ فرماتے ہیں: ''ما طابت الدنیا الّا بذکره ولا طابت الآخرة الّا بعفوه ولا طابت الجنة الا برؤیته'' ② دنیا میں کوئی لطف نہیں اگر اللہ کا ذکر نہیں، آخرت میں کوئی لطف نہیں اگر معافی نہیں، جنت میں کوئی لطف نہیں اگر دیدارِ محبوب حقیقی نہیں۔

ابونعیمؒ کے حوالے سے شیخ بسطامیؒ کا قول قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی نے ذکر کیا ہے:

«إن لله خواص من عباده لو حجبهم فی الجنة عن رؤیته لاستغاثوا بالخروج من الجنة كما یستغیث أهل النار بالخروج من النار.» ③

''بے شک اللہ کے ایسے خاص بندے بھی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رویت سے محروم کر دے تو وہ جنت سے نکلنے کی اسی طرح فریاد کریں گے جس طرح جہنمی جہنم سے نکلنے کے لیے چیخ و پکار کریں گے۔''

جنت محلِ دیدارِ محبوب ہے، دنیا نہیں۔ اس دیدار کی لذت تو دیدار پر ہی خوش نصیبوں کو نصیب ہوگی۔ اس کی طلب وتڑپ کا ہی نتیجہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اللهم إني أسألك لذة النظر إلى وجهك والشوق إلى لقائك.)) ④

---

① روضة المحبين، ص:465　② الحلية 372/9
③ مظهري الحلية: 34/10　④ أحمد، ابن حبان

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کے دیدار کی لذت کا اور آپ کی ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں۔''

اس لیے جنت کی تمام تر لذتوں اور عنایتوں میں سب سے بڑی عنایت اور سب سے بڑا شغل اللہ کا دیدار ہے۔ جنت کی ان بے شمار اور لا متناہی لذتوں کا ہی نتیجہ ہوگا کہ

﴿لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ ① یعنی کہیں اور جگہ کی تلاش کا تصور بھی نہیں رکھیں گے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے یہاں یہ لطیف بات فرمائی ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ ان کے اقارب اور احباب جو جہنم میں ہوں گے، اہل جنت اللہ کی نعمتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کریں گے اور ان کی کوئی فکر انھیں نہیں ہوگی۔ جنت میں فکر مندی کیسی؟ وہ جب خود صدا بہار جنت میں مشغول رہیں گے تو کسی کی فکر کیا کریں گے۔ مگر ان کی یہ بات من وجہ محل نظر ہے۔ اہل جنت بلاشبہ جنت کی بہاروں میں مشغول ہوں گے مگر یوں نہیں کہ وہ اہل جہنم سے بالکل لاتعلق ہوں گے۔ سورہ الصّٰفّٰت ② میں جنتی کا اپنے دنیا کے ایک ساتھی کو جہنم میں دیکھنے کا ذکر ہے۔ جہنمی اہل جنت سے پانی اور کھانا طلب کریں گے تو وہ فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں پر جنتی کھانا اور پانی حرام قرار دیا ہے۔ ③ بلکہ سورہ المدثر ④ میں ہے کہ اہل جنت جہنمیوں سے استفسار کریں گے کہ تم جہنم میں کیسے چلے گئے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ اہل جہنم سے لاتعلق ہوں گے درست نہیں۔

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ﴾ وہ اکیلے ہی جنت میں نہیں ہوں گے، ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی ہوں گی۔ تنہائی کی وحشت کا بھی وہاں تصور نہ ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں اکیلے تھے تو انھیں اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور وحشت کو محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو پیدا کیا۔ ⑤

---

① الکہف: 108 ② الصّٰفّٰت 57,50 ③ الاعراف:50

④ المدثر: 47,40 ⑤ البدایۃ: 1/74

"أزواج" زوج کی جمع ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ایک سے زائد بیویاں ہوں گی۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إن أول زمرة تدخل الجنة على صورة القمر ليلة البدر، والتي تليها على أضوأ كوكب دري في السماء، لكل امرئ منهم زوجتان اثنتان يرى مخ سوقهما من وراء اللحم، وما في الجنة عزب.)) ①

''جنت میں داخل ہونے والے پہلے گروہ کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوں گے۔اور ان کے بعد دوسرے گروہ کے چہرے آسمان پر سب سے زیادہ چمک دار ستارے کی طرح چمک رہے ہوں گے۔اور دونوں (گروہوں) میں سے ہر مرد کی دو دو بیویاں ہوں گی جن کی پنڈلیوں کا گودا گوشت کے اندر سے نظر آ رہا ہوگا اور جنت میں کوئی بھی بغیر شادی کے نہیں ہوگا۔''

یہی روایت ذرا تفصیل سے صحیح بخاری ② میں بھی ہے۔اور ترمذی میں یہی روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

کسی صحیح حدیث میں دو سے زیادہ بیویوں کا ذکر نہیں، البتہ "الحور العین" کے بارے میں مختلف روایات ہیں جن میں ان کی تعداد 72 سے لے کر 500 تک مذکور ہے۔

حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ دو دنیا کی عورتوں میں سے ہوں گی۔ ③

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ بناتِ آدم میں سے تو دو بیویاں ہوں گی اور "الحور العین" جتنی اللہ چاہے گا عطا فرمائے گا۔ ④

یہ دونوں بیویاں حوروں سے افضل ہوں گی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

---

① صحيح مسلم: 2834　② صحيح بخاري: 3245
③ فتح الباري: 325/2　④ النهاية: 379/2

لو أن امرأة من نساء أهل الجنة اطلعت إلى الأرض لأضاء
ت ما بينهما ولملأت ما بينهما ريحا، ولنصيفها على
رأسها خير من الدنيا وما فيها. ①

''اگر جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت دنیا میں جھانک لے تو آسمان وزمین کے درمیان ہر چیز روشن ہو جائے اور فضا کو خوش بُو سے معطر کر دے اور جنتی عورت کے سر کا دوپٹا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔''

بزار کی روایت میں ہے کہ اگر جنت کی خاتون زمین پر جھانک لے تو سورج اور چاند کی روشنی ختم ہو جائے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مسند احمد اور ابن حبان میں مروی ہے کہ خاتونِ جنت کے ایک موتی کی روشنی سے مشرق ومغرب میں جو کچھ ہے سب روشن ہو جائے۔ ②

بیویوں اور حور عین سے متعلق باقی مباحث کا یہ محل نہیں۔ حوروں کے اوصاف سورۃ الرحمٰن، الصّٰفّٰت اور دیگر سورتوں اور احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ شائقین الترغیب والترہیب ملاحظہ فرمائیں۔ ③

﴿فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَآئِكِ مُتَّكِئُوْنَ﴾ ''وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔'' ﴿ظِلَالٍ﴾ ظل کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سایہ۔ مجازاً یہ رات کی تاریکی اور باغات کے سائے پر بھی بولا جاتا ہے۔ عزت وحفاظت اور ہر قسم کی خوش حالی کو بھی ﴿ظِلَالٍ﴾ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''وأظلني فلان'' کے یہی معنی ہیں کہ اس نے میری حفاظت کی، مجھے اپنے زیر سایہ عزت سے رکھا۔ بعض نے ﴿هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلَالٍ﴾ کا ترجمہ یہی کیا ہے کہ وہ اور ان کی بیویاں ہر

---

① صحيح بخاري: 6568
② فتح الباري: 442/11
③ الرحمن: 56-59، الصفت: 48، 49، الترغيب والترهيب: 4/531-537

قسم کی خوش حالیوں میں ہوں گے۔ ①

بلکہ ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو "ظـل " کہا جاتا ہے۔ عموماً مفسرین نے یہاں باغاتِ جنت کے سائے مراد لیے ہیں۔ سورج کی تپش کا وہاں کوئی تصور نہیں ہوگا۔ فضا نور سے منور ہوگی اور باغاتِ جنت کا سایہ ہوگا۔

﴿اَلْاَرَآئِكِ﴾ اس کا مادہ "ارك" ہے۔ "اراك" پیلو کی لکڑی کو کہتے ہیں اسی سے "أريـكة" اور جمع "أرائك" ہے جس کے معنی ہیں مسہری، حجلہ جو تخت کے اوپر رکھا جاتا ہے۔ یہ عموماً پیلو کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا، اس لیے اسے "أريـكة" کہا جاتا تھا۔ ② اس لیے ﴿اَلْاَرَآئِكِ﴾ کے معنی سجائے اور خوش نما بنائے ہوئے تخت ہیں۔ ان تختوں پر جنتی میاں بیوی تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔ یہ دراصل اشارہ ہے کہ وہ فارغ البال ہوں گے اور صحت وسلامتی سے جنت میں عیش وآرام کی زندگی گزاریں گے۔

جنت کے درختوں کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں ایک گھوڑ سوار سو برس تک چلتا رہے (تب بھی وہ ختم نہ ہوگا) اگر سمجھنا چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو:

﴿وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾ ③

''اور ایسے سائے میں جو خوب پھیلا ہوا ہے۔''

اور جنت میں ایک کمان رکھنے کے برابر جگہ (دنیا کی) ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع یا غروب ہوتا ہے۔ ④

جنت کے درختوں کے تنے سونے کے ہوں گے۔ ⑤

بعض کھجوروں کا تنا سبز زمرد کا ہوگا، اس کی ٹہنی کی جڑ سرخ سونے کی ہوگی۔ کھجور کا

---

① ② مفردات ③ الواقعة:30

④ صحيح بخاري: 3252 ⑤ ترمذي: 2525

پھل مٹکے یا ڈول کے برابر ہوگا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا اور مکھن سے زیادہ نرم ہوگا۔ ①

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک درخت لگا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، فرمایا: ''کس کے لیے درخت لگا رہے ہو؟'' میں نے عرض کیا: اپنے لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے اس سے بہتر درخت نہ بتاؤں؟'' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہو: سبحان الله، والحمد لله، ولا إله إلا الله والله أكبر. یہ کہنے پر ہر کلمے کے بدلے تمھارے لیے جنت میں ایک درخت لگایا جائے گا۔'' ②

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طوبیٰ جنت کا درخت ہے جس کا سایہ سو سال کی مسافت ہے۔ ③

یہ اور اسی موضوع کی دیگر احادیث سے جنت کے درختوں کی بہار اور ان کے سایوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ انھی سایوں میں سجے ہوئے خوش نما تختوں پر اہل جنت تکیہ لگائے ہوئے آرام کریں گے۔

﴿لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ﴾ ''ان کے لیے اس میں بہت پھل ہیں۔'' امام رازی رحمہ اللہ نے عجیب بات کہی ہے، وہ فرماتے ہیں: کہ اس میں اشارہ ہے کہ انھیں وہاں بھوک نہیں ستائے گی، بھوک کا جنت میں ستانے کا کوئی تصور نہیں بلکہ یہ پھل لذت اور لطف اندوز ہونے کے لیے کھائے جائیں گے۔ دنیا میں پھل ضرورت کے لیے یا بس پھل کے طور پر کھائے جاتے ہیں مگر جنت میں لطف ولذت کے لیے کھائے جائیں گے، اور یہ بھی نہیں فرمایا ''يأكلون فيها فاكهة'' یعنی وہ وہاں پھل کھائیں گے بلکہ فرمایا: ﴿لَهُمْ﴾ ان

---

① شرح السنة: 221/15، مستدرك حاكم: 475/2

② ابن ماجه ③ أحمد، الصحيحة: 1958

کے لیے پھل ہوں گے، یعنی پھلوں کے وہ مالک بنادیے جائیں گے اور زمامِ اختیار اب ان کے ہاتھ میں ہوگی۔ انھیں اس بارے کسی اور سے سوال کی حاجت نہیں ہوگی، جب جو چاہیں گے کھائیں گے، جیسے فرمایا:

﴿وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۝﴾ ①

''اور ہم انھیں پھل اور گوشت زیادہ دیں گے اس میں سے جو وہ چاہیں گے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۝﴾ ②

''اور ایسے پھل لے کر جنھیں وہ پسند کرتے ہیں۔ اور پرندوں کا گوشت لے کر جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں۔''

حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا تھا:

﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ۝ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ۝﴾ ③

''بے شک تیرے لیے یہ ہے کہ تُو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا۔ اور یہ کہ بے شک تُو اس میں نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کھائے گا۔''

اس لیے جنت محلِ تنعم ہے، محلِ احتیاج اور محلِ اَلم نہیں ہے۔ جو چاہیں گے کھائیں پئیں گے اور غلمان سے منگوالیں گے:

﴿يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ۝﴾ ④

''وہ اس میں ہر پھل بے خوف ہو کر منگوا رہے ہوں گے۔''

نہ انھیں ان کے ختم ہونے کا خوف ہوگا اور نہ ہی یہ کہ وہ غلمان لا کر نہیں دیں گے یا تغافل برتیں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ بلاخوف جو چاہیں گے اور جب چاہیں گے منگوالیں گے

---

① الطور:22 ② الواقعۃ:21,20 ③ طٰہٰ:119,118 ④ الدخان:55

اور نوش جاں فرمائیں گے۔ دنیا کے پھلوں کی طرح صرف موسمی پھل نہیں بلکہ ہر پھل ہر وقت ملے گا۔ پھل اگر درخت کی بلندی پر ہوگا تو یوں نہیں کہ ہاتھ نہ پہنچے تو انگور کھٹے ہیں کہہ کر خود کو تسلی دے لی جائے بلکہ پھل قریب کر دیے جائیں گے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا﴾ ①

"اور اس کے خوشے تابع کر دیے جائیں گے، خوب تابع کیا جانا۔"

دنیا میں تو بس نام ہیں: انگور، انار، کھجور، آم وغیرہ۔ اصل پھل تو اس جنت کے ہیں جس کی مٹی کستوری اور زعفران کی ہوگی، درختوں کے تنے سونے کے ہوں گے۔ اب انھیں جو پھل لگیں گے کیا ان کے حجم اور ذائقے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صلاۃ کسوف (سورج گرہن کی نماز) کی حدیث میں ہے کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے دیکھا گویا آپ ﷺ کوئی چیز پکڑ رہے ہیں، آپ ﷺ گویا پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے جنت کو دیکھا، میں نے انگور کا خوشہ توڑنا چاہا، اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔" ②

حضرت عتبہ بن عبد السلمی سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے پوچھا: کیا جنت میں انگور ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں۔" اس نے کہا: خوشۂ انگور کیسا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کوّے کی مسلسل ایک ماہ پرواز کی مسافت برابر۔" ③

اور ایک انگور بڑی فربہ بھیڑ کے چمڑے سے بنائے گئے ڈول کے برابر ہوگا۔ ④

اور یوں بھی نہیں کہ پھل توڑنے پر وہ جگہ خالی ہو جائے گی بلکہ اس جگہ فوراً پھل لگ جائے گا۔ ⑤ سبحان اللہ!

﴿وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ﴾ "اور ان کے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو وہ طلب کریں گے۔" اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا مالک و مختار بنا دیے جانے کے علاوہ وہ جو بھی طلب

---

① الدهر: 14 ② صحيح بخاري: 1052 وغيره

③ مسند احمد: 184/4 ④ مسند احمد: 184/4 وغيره ⑤ بزّار وغيره

کریں گے اللہ تعالیٰ انھیں عطا فرمائے گا۔ اس میں دو باتیں بڑی توجہ طلب ہیں:

1: دنیا میں ان کی تمام مطلوبات ان کے تمام تر قرب کے باوجود اللہ کی مشیت پر موقوف تھیں مگر یہاں ان کی تمام مطلوبات بلاتوقف انھیں ملیں گی۔ دنیا میں اصول یہ تھا:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ①

''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے۔''

وہ جسے جو چاہتا تھا عطا کرتا تھا: بیٹے یا بیٹیاں یا دونوں اور جسے چاہتا بانجھ کر دیتا۔ مگر جنت میں جنتی جو طلب کرے گا وہ اسے ملے گا، اللہ کی مشیت وہاں حائل نہیں ہوگی:

﴿لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ ②

''ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔''

اُن کی مشیت تو بہر حال محدود ہے، انھیں تو وہ بھی ملے گا جس کا انھیں تصور بھی نہیں ہوگا کیونکہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کچھ تیار کر رکھا ہے:

﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ ③

''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

مزید تفصیل کے لیے راقم کی کتاب تفسیر سورۂ ق ملاحظہ فرمائیں ④۔

2: گو وہ جنت کے مالک بنا دیے جائیں گے مگر اس کے باوجود وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مزید عنایتوں کے طلب گار رہیں گے تاکہ آقا و غلام کا باہمی تعلق قائم رہے اور مالک سے طلب کی جو لذت دنیا میں پاتے تھے وہ اب بھی برقرار رہے۔

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ طلب کریں گے۔ اس آیت میں ایک اور بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جس

---

① التکویر:29 ② ق:35 ③ السجدۃ:17 ④ تفسیر سورۂ ق:170

سے اہلِ جنت کو نوازا جائے گا اور وہ ہے ''سلام''، یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے انھیں ''سلام'' کا پیغام ملے گا:

﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلٰمٌ﴾ ①

''ان کی دعا، جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام ہوگی۔''

سلام کا یہ پیغام فرشتوں کی طرف سے تو اس وقت سے ہوگا جب وہ اللہ کے مہمان بننے کے لیے اس دنیا سے جا رہے ہوں گے۔

﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ ②

''جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ پاک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں: سلام ہو تم پر، جنت میں داخل ہو جاؤ اس کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔''

یہی خوش نصیب جب جنت میں داخل ہوں گے تب بھی فرشتے انھیں سلام کہیں گے:

﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ﴾ ③

''اور وہ لوگ، جو اپنے ربّ سے ڈر گئے، گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے اس حال میں کہ اس کے دروازے کھول دیے گئے ہوں گے اور اس کے نگران ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، پس اس میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے۔''

یہی بات ایک اور اسلوب میں بھی فرمائی گئی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ

---

① الأحزاب:44 ② النحل:32 ③ الزمر:73

وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ o سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ o ﴾ ①

''ہمیشگی کے باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولادوں میں سے جو نیک ہوئے اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان پر داخل ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس کے بدلے جو تم نے صبر کیا، سو اچھا ہے اس گھر کا انجام۔''

جنت ''دارالسلام'' (سلامتی کا گھر) ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اہلِ جنت کے لیے سلام ہوگا، فرشتے بھی انھیں سلام کہیں گے۔ باہم جنت میں ملیں گے تو ''سلاماً سلاماً'' کہیں گے۔ بلکہ یہاں دنیا میں بھی ((أفشوا السلام)) کا حکم ہے، یعنی سلام کو پھیلاؤ، باہم ''السلام علیکم'' کہو۔ انبیائے کرام پر دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے سلام بھیجا، چنانچہ فرمایا:

﴿سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ②

''نوح پر تمام جہانوں میں سلام ہو۔''

﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴾ ③

''ابراہیم پر سلام ہو۔''

﴿سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴾ ④

''موسیٰ اور ہارون پر سلام ہو۔''

﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴾ ⑤

''سلام ہو الیاسین پر۔''

---

① الرعد:24,23 ② الصافات:79 ③ الصافات:109
④ الصافات:120 ⑤ الصافات:130

یحییٰ علیہ السلام کے بارے فرمایا:

﴿وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا﴾ ①

”اور سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوگا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا۔“

تین مواقع پر انسان پر وحشت طاری ہوتی ہے: پیدائش کے وقت جب وہ رحم مادر سے باہر آتا ہے، جب دنیا سے جاتا ہے اور جب قیامت کے روز اُٹھے گا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ خصوصیت ہے کہ ان پر تینوں مواقع میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ فرشتے بھی ملاقات پر انھیں سلام کہتے تھے۔

ام المومنین خدیجہ الکبریٰ کس قدر خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا میں سلام بھیجا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا:

«يا رسول الله! هذه خديجة قد أتت معها إناء فيه إدام أو طعام أو شراب، فإذا هي أتتك فاقرأ عليها السلام من ربها ومني، وبشرها ببيت في الجنة من قصب.» ②

”اے اللہ کے رسول! یہ خدیجہ آپ کی خدمت میں ایک برتن اٹھائے آ رہی ہیں جس میں سالن ہے یا کھانا ہے یا پانی ہے۔ جب یہ آئیں تو ان پر ان کے ربّ کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیں اور انھیں جنت میں ایسے گھر کی بشارت دیں جو ایک ہی موتی کا بنا ہوا ہوگا۔“

نسائی وغیرہ میں ہے کہ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر فرمایا:

«إن الله هو السلام، وعلى جبريل السلام، وعليك يا رسول

---

① مريم:15 ② صحيح بخاري: 3820

الله السلام ورحمة الله وبركاته.»» ①

یعنی اللہ تعالیٰ تو خود سلامتی کا مالک ہے، جبریل پر سلام ہو اور اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت و برکت ہو۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! جبریل تمھیں سلام کہتے ہیں۔'' میں نے عرض کیا: اور ان پر بھی سلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکت ہو۔ آپ ﷺ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی۔ ②

حضرت عمران بن حصین الخزاعی بھی وہ جلیل القدر صحابی تھے جنھیں فرشتے سلام کہتے تھے۔ وہ تیس سال تک پیٹ کی موذی بیماری میں مبتلا رہے۔ ان کے ایک ساتھی نے کہا: آپ کی عیادت کو بڑا ہی جی چاہتا ہے مگر آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ انھوں نے فرمایا: تم ملاقات کے لیے آؤ، اللہ کی قسم! یہ تو میرے نزدیک بہت محبوب ہے کہ یہی اللہ کو بہت پسند ہے۔ اسی حالت میں فرشتے انھیں سلام کہتے تھے۔ وفات سے دو سال پہلے انھوں نے علاج کے لیے داغ لگوایا تو فرشتوں کے سلام کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ داغ لگوانا چھوڑ دیا تو فرشتوں نے پھر سے سلام کہنا شروع کر دیا۔ ③

اہلِ جنت کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی انھیں سلام کہیں گے۔ اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ حضرات جنھیں اس دنیا میں اللہ نے سلام کہا اور اس کے فرشتوں نے بھی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اہلِ جنت جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے کہ ایک نور ظاہر ہو گا۔ اہل جنت اوپر دیکھیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اوپر سے ان کی طرف متوجہ ہوں گے اور

---

① فتح الباري: 140/7 ② صحيح بخاري: 3768

③ المعرفة لأبي نعيم : 5300، الاصابہ وغیرہ، صحیح مسلم (رقم مسلسل: 2972) میں مختصراً اسی کا ذکر ہے۔

فرمائیں گے:"السلام علیکم یا أهل الجنة" ''اے جنتیو! تم پر سلام ہو۔'' یہی ہے: ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍO﴾ ①

اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو دیکھیں گے اور جنتی اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ کو دیکھتے رہیں گے جنتی جنت کی کسی نعمت کی طرف التفات نہیں کریں گے۔''

یہ روایت ابن ماجہ ②، بزار، ابو نعیم کی "صفة الجنة" اور کتاب البعث للبیهقي میں ہے مگر یہ سخت ضعیف ہے۔ اس کا راوی عبداللہ بن عبیداللہ ابو عاصم العبادانی "واہ" یعنی سخت ضعیف ہے۔ ③ اور اس کا استاد فضل بن عیسیٰ ''منکر الحدیث'' ہے اور بالاتفاق ضعیف ہے۔ ④

علامہ قرطبی نے یہی روایت اپنی تفسیر ⑤ میں ذکر کی ہے اور اس کا راوی جریر بن عبداللہ البجلیؓ بتلایا ہے مگر یہ درست نہیں۔ خود انھوں نے التذکرة ⑥ میں اسے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ہی نقل کیا ہے۔ اہل جنت کے لیے جنت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی زیارت حق ہے۔ مگر آیت میں سلام کا مصداق اس مرفوع روایت کے تناظر میں اور اس کی مزید تفصیل جو بیان ہوئی ہے وہ بہر حال ضعیف ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابن جریر رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا اثر نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب جنتیوں اور جہنمیوں کا فیصلہ فرما دیں گے تو اَبر کے سائے میں فرشتوں کے ہمراہ اہلِ جنت پر متوجہ ہوں گے اور انھیں سلام کہیں گے۔ محمد بن کعب قرظی فرماتے ہیں: یہی ہے ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ﴾ اور اہل جنت سلام کا جواب دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: مجھ سے مانگو کیا مانگتے ہو۔ وہ عرض کریں گے: ہم آپ کی رضا کے طلب گار ہیں۔ اللہ فرمائیں گے: میں نے تمھیں عزت کے مقام پر رکھا ہے، یہ میری رضا ہے۔ جنتی کہیں گے: اے اللہ! ہم کیا طلب کریں! آپ نے ہمیں اتنا کچھ عطا فرمایا ہے، اگر ہم تمام جنوں اور انسانوں میں تقسیم کریں تب بھی یہ کم

---

① یٰسٓ: 58 ② ابن ماجہ: 184 ③ میزان: 458/2
④ تقریب، ص: 277 ⑤ قرطبی: 45/15 ⑥ التذکرة ص: 192

نہیں ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے ان میں تحائف تقسیم کریں گے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت غریب ہے جسے کئی طرق سے امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

﴿سَلٰمٌ﴾ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ ''السلام'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک اسم مبارک ہے، جیسا کہ سورۃ الحشر میں ہے:

﴿الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ﴾ ①

''(وہ اللہ) بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا۔''

رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.))

''اے اللہ! آپ سلام ہیں اور سلامتی آپ کی طرف سے ہے، برکت والے ہیں آپ اے جلال واکرام والے!''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو یوں کہتے تھے: "السّلام علی اللّٰہ" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إن اللّٰه هو السّلام ولكن قولوا: التحيات لِلّٰه ... إلخ)) ②

بے شک اللہ ہی السلام ہے، بلکہ تم کہو: اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ ... الخ

اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس اسم مبارک کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے لیے ہی کامل سلامتی ہے۔ اس کی سلامتی معرض خطر وزوال میں نہیں اور وہ ہر عیب ونقص سے سلامتی میں ہے، وہی دوسروں کو سلامتی عطا کرتا ہے۔ جنت کا نام ''دار السلام'' بھی اسی لیے ہے کہ اس میں موت، بیماری اور ہر قسم کی آفات وآلام سے سلامتی ہوگی، چنانچہ فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ③

---

① الحشر:23 ② صحیح بخاری:831، 835 وغیرہ ③ الأنعام: ۱۲۷

''انھی کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے۔''

﴿وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ﴾ ①

''اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔''

دنیا دَارُ الْهَمِّ ہے اور الدَّارُ الآخرة یعنی آخرت سلامتی اور امن کا گھر ہے، اسی لیے تو فرمایا ہے:

﴿وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ ②

''اور بے شک آخری گھر یقیناً وہی اصل زندگی ہے، اگر وہ جانتے ہوتے۔''

اللہ تعالیٰ سب اہل ایمان کو دنیا وآخرت میں سلامتی بخشے اور سلامتی کا گھر عطا فرمائے، آمین۔

اس آیت سے سلف اہل سنت کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام کرتے ہیں۔ آواز اور الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا کلام، مخلوق کے کلام کی طرح نہیں۔ امام بخاری نے الجامع الصحیح کے آخری ابواب میں اس پر متعدد دلائل ذکر کیے ہیں۔

علامہ سخاوی نے ذکر کیا ہے کہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کی مرض الموت میں ان پر سورہ یسٓ کی تلاوت دو مرتبہ کی گئی، پڑھنے والا جب دوسری مرتبہ ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ پر پہنچا تو ان کی روح پرواز کر گئی، سبحان اللہ! ③

---

① یونس:25 ② العنکبوت:64

③ الجواھر والدرر 1193/3

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ○﴾ [یٰسٓ: 59-61]

''اور الگ ہو جاؤ آج اے مجرمو! کیا میں نے تمھیں تاکید نہ کی تھی اے اولادِ آدم! کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔''

اہلِ جنت کا حال بیان کرنے کے بعد اب مجرموں کا حال بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ دنیا میں تو اہلِ ایمان کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے بلکہ وہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتے تھے اور مومنوں کو حقیر سمجھتے تھے، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ناگوار سمجھتے تھے۔ مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یا فرشتے کہیں گے: اے مجرمو! آج انصاف کا دن ہے میرے بندوں سے الگ ہو جاؤ۔ آج اُن کا جہان الگ ہے اور تمھارا الگ۔ اہلِ جنت سے ان کی علیحدگی کا کیا مفہوم ہے اور اس کی کتنی نوعیتیں ہیں؟ اس کی ضروری تفصیل حسبِ ذیل ہے:

1: میدانِ محشر میں سب ملے جلے کھڑے ہوں گے، مومن ہوں یا کافر، مخلص ہوں یا منافق، صالح اور پاکباز ہوں یا فاسق و فاجر۔ اسی لیے تو قیامت کا نام ''یوم الجمع'' اور ''یوم الحشر'' ہے۔ پھر مجرموں سے کہا جائے گا کہ تم مومنوں سے علیحدہ ہو جاؤ۔ اسی لیے اسے ''یوم الفصل'' بھی کہا گیا ہے۔ گویا ایک تو ان کی ندامت کا باعث جدائی کا یہ اعلان ہے۔ دوسرا مومنوں سے جدا ہو کر ایک طرف کھڑے ہونا بجائے خود ندامت کا باعث ہے۔ مومنوں کے چہرے روشن ہوں گے ان کے نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ہوں گے اور روشنی میں کھڑے ہوں گے۔ جب کہ مجرموں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ان کے نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ہوں گے اور اندھیرے میں پریشان کھڑے ہوں گے۔ آنکھیں جھکی ہوئی اور ذلت چھائی ہوئی ہوگی:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيمَاهُمْ﴾ ①

''مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے۔''

اور انھیں کہا جائے گا کہ مومنوں سے علیحدہ ہو جاؤ۔ تاکہ ناپاک، پاک سے جدا ہو جائیں:

﴿لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ ②

''تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔''

حافظ ابوطاہر السِّلَفی نے بسند صحیح سعید بن منصور سے نقل کیا ہے کہ میرے ایک ساتھی کو خواب آیا کہ قیامت قائم ہو گئی ہے اور منادی کہہ رہا ہے: ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ تو غلاموں اور جانوروں کو فروخت کرنے والوں کو دھکے دے کر جدا کر دیا جائے گا، ③ کیونکہ ان کی فروخت میں دھوکا اور غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے۔

2: یہ امتیاز مجرموں کا مومنوں سے ہی نہیں بلکہ مجرموں کا باہمی مجرموں سے بھی ہوگا۔ یہ مفہوم امام ضحاک رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے، یعنی یہودی، عیسائی، مجوسی، ہندو، سکھ، دہریے وغیرہ سب کو ایک دوسرے سے جدا جدا ہو جانے کا حکم ہوگا۔ مومن تو سب اکٹھے ہوں گے اور ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں گے، مگر کافر قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ ④

''سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی قوم سے کہا تھا: تم نے اللہ کے سوا بت بنائے

---

① الرحمن:41

② الأنفال:37

③ الطیوریات: 2/ 284

④ الزخرف: 67

ہیں، دنیا کی زندگی میں، آپس کی دوستی کی وجہ سے، پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار کرے گا اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت کرے گا۔ ① کفار کے باہمی جھگڑے اور آپس کی تو تکار کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر ہوا ہے۔

جیسے اہل جنت کے ایمان و اعمال کے نتیجے میں جنت میں مختلف درکات ہوں گے اسی طرح کفار و فساق کے کفر و فسق کی سزا میں مختلف درجات ہوں گے اور ان سب کو جدا جدا ہونے کا حکم ہوگا۔ یہ میدان محشر میں اور جہنم میں بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ گویا عذاب کے ساتھ انھیں آپس کی فرقت اور جدائی کا عذاب بھی ہوگا۔ ایک دوسرے سے یہ جدائی شدت عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

3: امتیاز اور جدائی سے مراد اللہ کے سوا معبودوں اور ان کے عبادت گزاروں میں جدائی بھی ہے جنھیں وہ اللہ کا مقرب اور اپنا شفیع سمجھتے تھے اور اسی بنا پر ان کی نذر و نیاز دیتے تھے:

﴿وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَ كَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِیْنَ ○ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوْنَ○ ﴾ ②

''اور جس دن قیامت قائم ہوگی مجرم ناامید ہو جائیں گے۔ اور ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے کوئی سفارش کرنے والے نہیں ہوں گے اور وہ اپنے شریکوں سے منکر ہو جائیں گے۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔''

یہ منظر کیسا المناک ہوگا کہ فاسق باپ اپنے نیک بیٹے سے، پیر اپنے بدکار مرید سے اور فاسق دوست اپنے نیک دوست سے جدا کر دیا جائے گا۔

4: امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ مجرمو! ہر بھلائی اور خیر سے جدا ہو جاؤ۔ اور وہ جو امیدیں اور آرزوئیں رکھتے تھے وہ سب بے کار ثابت ہوں گی۔

---

① العنکبوت:25 ② الروم: 12-14

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ﴾ ''کیا میں نے تمھیں تاکید نہ کی تھی۔'' ''عهد'' کے معنی کسی چیز کی نگہداشت اور خبر گیری کرنا ہیں۔ پختہ وعدے کو بھی ''عہد'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ قرآنِ مجید ہی میں ہے:

﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ ①

''اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کا سوال ہوگا۔''

اسی معنی میں یہ لفظ کئی بار قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ ''عهد إلى'' تاکیدی حکم دینے، ذمہ دار ٹھہرانے اور پابند کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ ②

''اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکیدی حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔''

تقریباً یہی بات امام رازی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ اس کا سب سے قوی مفہوم یہ ہے کہ ''ألم أوص إليكم'' کیا میں نے تمھیں وصیت نہیں کی۔ گویا میدانِ محشر میں بطور ملامت کہا جائے گا کہ آج جو تم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو تو کیا میں نے تمھیں تاکیدی حکم یا وصیت نہیں کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا۔

اس عہد سے مراد وہ وصیت اور تاکیدی حکم ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے یا ان کے نائبین کے ذریعے سے دیا گیا تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ ③

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور

---

① الإسراء:34 ② البقرة:125 ③ النحل:36

طاغوت سے بچو۔‘‘

اس کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کی اور ان سے توحید پر قائم رہنے کا اقرار لیا:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ ①

’’یا تم موجود تھے جب یعقوب کو موت پیش آئی، جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے لیے فرماں بردار ہیں۔‘‘

اسی طرح بنی اسرائیل سے اسی کا عہد لیا گیا:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ ②

’’اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے۔‘‘

اس لیے انبیاء کے ذریعے جو عہد و میثاق امتوں سے لیا گیا اور توحید کے اقرار کا تاکیدی حکم فرمایا گیا وہی عہد یہاں مراد ہے۔

اسی طرح اس عہد سے عالم ارواح کا عہد بھی مراد ہے، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَآ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ ③

’’اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد

---

① البقرة:133 ② البقرة:83 ③ الأعراف:172

کو نکالا اور انھیں خود ان کی جانوں پر گواہ بنایا، کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں، ہم نے شہادت دی۔ (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو بے شک ہم اس سے غافل تھے۔''

اس عہد کی یاد دہانی اللہ نے اپنے انبیائے کرام علیہم السلام اور اپنی کتابوں کے ذریعے کروائی، اللہ نے عقل و شعور بھی عطا فرمایا، انفسی و آفاقی دلائل پر غور کرنے سے بھی انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا کہ اس کارخانہ حیات کو چلانے والا ایک ہی اللہ ہے۔ مگر مجرموں نے نہ عقل سے کام لیا نہ ہی رسولوں کی یاد دہانی پر کان دھرے، بلکہ الٹا شیطان کے بندے بن گئے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ انھیں جہنم میں داخل کر دیا جائے۔

﴿اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ اللہ سے عہد و پیمان یہ تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا تھا:

﴿يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا﴾ ①

''اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان ہمیشہ سے رحمان کا نافرمان ہے۔''

یہاں شیطان کی عبادت کے دو مفہوم ہیں:

1: اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے بھی معبودوں کی عبادت ہوئی یا ہو رہی ہے، شیطان کے بہکانے سے ہی ہو رہی ہے، لہٰذا حقیقت میں یہ شیطان ہی کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا﴾ ②

''وہ اس کے سوا نہیں پکارتے مگر مؤنثوں کو اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو۔''

کفار فرشتوں کو (معاذ اللہ) اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور جیسا کہ سورہ الزخرف اور النجم میں بیان ہوا ہے۔ ③ مشرکین انھیں انسانوں پر قیاس کر کے سمجھتے تھے جیسے ماں باپ

---

① مریم:44 ② النساء:117 ③ سورہ الزخرف:19 سورہ النجم:27,19

بیٹیوں کی بات تسلیم کر لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی ان بیٹیوں کی بات مان لیتے ہیں۔ اسی لیے وہ ان کی عبادت کرتے اور ان کی نذر و منت دیا کرتے تھے۔ یہ سب تصورات بھی شیطانی تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے یہ وضاحت کروا دیں گے کہ یہ ہماری نہیں بلکہ جن (شیطان) کی عبادت کرتے تھے:

﴿وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ ①

''اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کیا یہ لوگ تمھاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے تو پاک ہے، تو ہمارا دوست ہے نہ کہ وہ، بلکہ وہ جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے، ان کے اکثر انھی پر ایمان رکھنے والے تھے۔''

گویا وہ عبادت تو اللہ کا نام لے کر کرتے تھے مگر دراصل وہ شیاطین کی بندگی کرتے تھے۔ فرشتوں کے علاوہ بھی جن کی پرستش کی جاتی ہے وہ دراصل شیاطینِ جن کی عبادت ہے۔ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش بھی درحقیقت شیطان کی پرستش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔ گویا کفار اسے سجدہ کرتے ہیں۔ یہی کیفیت غروبِ آفتاب کے وقت ہوتی ہے۔ قبور صالحین پر عموماً شعبدہ بازیاں بھی درحقیقت انھی کی کارستانیاں ہیں۔ اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کا حکم دیتے ہیں اور نہ ہی اپنی بندگی کا کہتے ہیں۔ بلکہ قیامت کے دن ان کے نام پر شرک کی دکانداری چلانے والوں کا انکار کر دیں گے:

﴿اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝﴾ ②

''اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمھاری

---

① سبا: 41،40 ② فاطر: 14

درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔''

اسی آیت کی تفسیر میں جو ہم تفسیر سورہ فاطر میں لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

2: ﴿لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ''لا تطيعوا الشيطان'' کہ شیطان کی اطاعت نہ کرو۔ اس لیے کہ اطاعت پر عبادت کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت کے جواب میں کہا تھا:

﴿اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ﴾ ①

''تو انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان کے لوگ ہمارے غلام ہیں۔''

بنی اسرائیل فرعون کے غلام اور اطاعت گزار تو تھے اسی کو اس نے ''عابدون'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''عبدتُ فلانا'' کے معنی یہی کیے گئے ہیں کہ میں نے اسے اپنا مطیع ومحکوم بنا لیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ②

''اور یہ کوئی احسان ہے جو تو مجھ پر جتلا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے حکم کی اللہ کے حکم کی طرح مستقلاً اطاعت کی جائے یہ بھی اس کی عبادت ہے اور اسے اپنا رب بنانے کے مترادف ہے۔ ایسے حکم کی اطاعت بھی شیطان کی عبادت ہے اور شرک ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا حکم دیا، پھر فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ ③ ''اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو۔'' اس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ ایک راستہ رحمٰن کا اور دوسرا شیطان کا ہے۔ مسلمان رحمٰن کے راستے کا راہ رو ہے اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے وہ شیطان کا راستہ ہے۔

---

① المؤمنون:47 ② الشعراء:22 ③ البقرة:208

کفارِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: جو بکری مر جاتی ہے اسے مارنے والا کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ۔ انھوں نے کہا جو تم اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیتے ہو وہ حلال اور جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ حرام، یوں تو تم اللہ سے بہتر ہوئے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ۝﴾ ①

''اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور بلاشبہ یہ یقیناً سراسر نافرمانی ہے اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا تو بلاشبہ تم یقیناً مشرک ہو۔''

جس مردہ کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے شیطان کے بہکاوے پر اسے حلال سمجھنا اور کھانا شرک ہے۔ اس لیے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا، یا مافوق الاسباب اللہ کے علاوہ کسی کو پکارنا ہی شرک اور شیطان کی عبادت نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کسی کی اطاعت کرنا بھی شرک اور اسے معبود بنانا ہے۔ عدی بن حاتم عیسائی تھا، مسلمان ہوا، مدینہ طیبہ پہنچا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝﴾ ②

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت

---

① الأنعام:121 ② التوبة:31

کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔"

عدی بن حاتم نے یہ آیت سنی تو عرض کی کہ وہ تو اپنے عالموں اور درویشوں کی عبادت نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بلى إنهم حرموا عليهم الحلال وأحلوا لهم الحرام فاتبعوهم فذلك عبادتهم إياهم.)) ①

"کیوں نہیں، انھوں نے ان پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرایا تو انھوں نے ان کی اتباع کی یہی ان کی عبادت ہے۔"

یہ آیت اور حدیث بھی واضح دلیل ہے کہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کوئی حکم دینا اور اسے واجب الاطاعت سمجھنا عبادت ہے اور حکم دینے والا اپنے اطاعت گزاروں کا گویا معبود اور رب ہے اور یہ شرک ہے۔ اس آیت سے پہلے اہل کتاب سے قتال کے حکم کا سبب بھی پیش نگاہ رہے تو اس کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝﴾ ②

"لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔"

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں اہل کتاب سے قتال کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ، جو سب انبیاء کے سردار، سب سے افضل اور سب سے اکمل ہیں، کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ ان کے اللہ اور قیامت پر ایمان کا کوئی اعتبار

---

① الترمذي:3095، الصحيحة:3293 ② التوبة:29

نہیں، ان کا جرم یہ بھی ہے کہ وہ حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بعض اشیاء کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے وہ حلت و حرمت کا یہ اختیار اللہ اور اس کے رسول کو نہیں دیتے بلکہ یہ اتھارٹی انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو دے رکھی ہے۔ یوں اللہ کے ساتھ تحریم و تحلیل میں کسی اور کو شریک ٹھہرانا شرک ہے اور اللہ کے حکم کے ساتھ کسی اور کے حکم کی بالاستقلال پابندی اور اطاعت بھی شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عرب یا منافقین اپنے معاملات، عدم ایمان کی بنا پر یا اللہ کے حکم سے بچنے کے لیے، عرب کے کاہنوں، جادوگروں اور یہود کی رواجی عدالتوں میں لے جاتے تھے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلا نفاق اور کفر و شرک قرار دیا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ○﴾ ①

”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔ چاہتے یہ ہیں کہ آپس کے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر دے بہت دور گمراہ کرنا۔ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو تُو منافقوں کو دیکھے گا کہ تجھ سے منہ موڑ لیتے ہیں صاف منہ موڑنا۔“

اس آیت میں حکم الٰہی کے بدلے طاغوت کی پیروی کرنے کو کفر و نفاق قرار دیا گیا ہے۔ ”طاغوت“ ہر اُس شے کو کہتے ہیں جسے اللہ کے سوا معبود بنا لیا جائے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے مقابلے میں جس کے احکام اور فیصلوں کو قانون کا درجہ دے

---

① النساء: 61,60

کر اس کی اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلے کیے جائیں وہ طاغوت ہے اور ایسے سب فیصلے شیطانی ہیں۔ اس لیے اس آیت میں ﴿لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ سے مراد شیطان کی اطاعت ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی تناظر میں جو بحث کی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے مراد شیطان کی اطاعت سے ممانعت ہے کیونکہ شیطان کو محض سجدہ کرنا ہی حرام نہیں اس کی اطاعت بھی حرام ہے۔ کیونکہ اطاعت عبادت ہے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنی اطاعت کے ساتھ ﴿أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امراء کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے تو اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت اس کی عبادت کیونکر ہوئی؟ امام رازیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ان کی اطاعت جب اللہ کے حکم سے ہے تو وہ اللہ ہی کی عبادت ہے اور اسی کی اطاعت ہے، جیسے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا۔ یہ آدم علیہ السلام کی عبادت نہیں تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت تھی۔ امراء کی اطاعت اس صورت میں ان کی عبادت شمار ہوگی جب ان کی اطاعت ایسے معاملات میں ہو جن میں ان کی اطاعت کی اجازت نہیں یا ان کی اطاعت اللہ کے حکم کے خلاف ہو:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ.))

پھر فرماتے ہیں کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہاں اللہ کی بجائے شیطان کی اطاعت ہو رہی ہے کیونکہ شیطان کی تو کوئی بات ہم نہیں سنتے۔ تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں اگر تمھارے سامنے کوئی شخص آئے اور تمھیں کوئی ایسا حکم دے جو اللہ کے حکم کے موافق نہیں تو سمجھ لو شیطان اس شخص کے ساتھ ہے وہ یہ حکم کرنے کا وسوسہ اس کے دل میں ڈال رہا ہے۔ اس حالت میں اگر تم نے اس کی اطاعت کی تو تم نے اس کی اور اس کے شیطان کی عبادت واطاعت کی۔ اسی طرح اگر تمھارا نفس تمھیں کسی کام کے کرنے پر اکسائے تو دیکھو اس کا یہ حکم اللہ کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں، اگر موافق نہیں تو شیطان اس کے ساتھ ہے جو اسے

---

① النساء:59

یہ کام کرنے پر اکسا رہا ہے۔ اگر اس نے نفس کی پیروی کی تو اس نے شیطان کی پیروی وعبادت کی۔ یہی وہ انسان ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ﴾ ①

''کیا تُو نے وہ شخص دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا۔''

امام صاحب مزید فرماتے ہیں: شیطان کی عبادت کے مختلف مراتب ہیں:

1: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرتا ہے اور اس کے اعضاء کے ساتھ اس کی زبان اور اس کا دل بھی موافقت کرتے ہیں۔

2: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اعضاء سے ایک کام کرتا ہے مگر دل اور زبان اس میں شریک نہیں ہوتے۔

3: بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن دل اس پر مطمئن نہیں ہوتا اور زبان تو بہ واستغفار کر رہی ہوتی ہے اور وہ زبان سے اعتراف کرتا ہے کہ یہ برا کام ہو رہا ہے۔ یہ محض ظاہری اعضاء سے شیطان کی عبادت ہے۔

4: اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اعضاء سے اور دل سے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دل اس گناہ پر مطمئن ہوتا ہے، زبان بھی اس پر خوشی واطمینان کا اظہار کرتی ہے۔ جیسے ظالم حکمرانوں کی خدمت مدارت کرنے والے اور ظالم حکمرانوں سے ظلم پر مبنی فیصلے کروانے والے خوش ہوتے ہیں اور پھولے نہیں سماتے۔ یہ ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے شیطان کے عبادت گزار ہیں۔ جو ظاہری اعضاء سے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں مگر باطن پاک ہوتا ہے، ضمیر انھیں ملامت کرتا ہے۔ ان کے ظاہری گناہ بیماری یا سزا سے دھل جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کو جو مصیبت پہنچتی ہے خواہ اس کے پیر میں کانٹا چبھے، اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو اس کے لیے کفارہ

---

① الفرقان:43

بنا دیتا ہے۔ ①

اس موضوع کی دیگر احادیث کے لیے شائقین الترغیب والترہیب ② ملاحظہ فرمائیں۔

بخار کو رسول اللہ ﷺ نے جہنم کی گرمی قرار دیا ہے اور جرائم پر حدود کو جرائم کا کفارہ قرار دیا ہے۔ مگر وہ گناہ جن کا ارتکاب انسان دل و جان سے کرتا ہے وہ بغیر توبہ اور ندامت کے معاف نہیں ہوتے۔ ③

﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اس کی دشمنی تو تمھارے ابا آدم علیہ السلام کے وقت سے ہے جب اس نے اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے تمھارے ابا کی تکریم نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے مردود قرار دے کر اپنے ہاں سے نکال دیا اور یہ تمھاری مخالفت پر اُتر آیا اور بڑی دلیری سے کہا:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۝﴾ ④

''کہا: تو قسم ہے تیری عزت کی، میں ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کردوں گا۔''

اور یہ بھی کہا:

﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۝﴾ ⑤

''میں ضرور ہی ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔''

---

① صحيح بخاري: 5640 وغيره
② الترغيب والترهيب: 4/ 280- 288
③ تفسير الرازي: 25/ 97، 96
④ ص: 82 ⑤ الأعراف: 17,16

جس نے یوں دربارِ الٰہی میں کھڑے ہو کر کھلم کھلا تمھارے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہو، بھلا اس کی دشمنی میں بھی کوئی شک ہو سکتا ہے!

پھر اس کی دشمنی سے خبردار علیم و خبیر ذات نے ایک دو بار نہیں بلکہ کم و بیش نو، دس مرتبہ فرمایا کہ وہ تمھارا دشمن ہے اور ہمیں بھی حکم فرمایا: ﴿فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① یعنی وہ تمھارا کھلا دشمن ہے، اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو۔

قبل ازیں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بھی خبردار کیا تھا کہ یہ تمھارا دشمن ہے مگر آدم علیہ السلام اس نصیحت کو بھول گئے اور اس کے بھڑے (ترغیب و تحریص) میں آ گئے۔ جس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا تھا اس کا پھل کھالیا تو جنتی لباس اُتر گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ ②

''کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا اور تم دونوں سے نہیں کہا کہ بے شک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔''

عجیب اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے قسمیں کھا کے یقین دلایا کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں:

﴿وَ قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ﴾ ③

''اور اس نے دونوں سے قسمیں کھا کر کہا کہ بے شک میں تم دونوں کے لیے یقیناً خیر خواہوں سے ہوں۔''

اور جنت میں ہمیشہ رہنے کا سبز باغ دکھایا اور جنت سے نکلوانے کا سبب بن گیا۔ بالکل اسی طرح اولادِ آدم کو دنیا کی زیبائش و آرائش اور اس کی لذات کا ایسا سبز باغ دکھاتا ہے کہ انھیں بھی جنت سے محروم رکھنے کی شب و روز کوشش میں ہے اور بہت حد تک کامیاب نظر آتا ہے ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ

---

① فاطر:6 ② الأعراف:22 ③ الأعراف:21

الْمُؤْمِنِيْنَ﴾۔

پھر یہ ایسا خطرناک دشمن ہے کہ نظر نہیں آتا۔ ہر وقت تاک لگائے بیٹھا ہے اور کوئی موقع خالی نہیں جانے دیتا۔ یہ اگر برائیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو نیکی کے نام سے بدعات اور بزرگوں کی تکریم و تعظیم کے نام سے شرک کا ارتکاب بھی کرواتا ہے۔ مختلف اشخاص پر اپنے داؤ پیچ کس طرح آزماتا اور اپنے دامِ تزویر میں کس طرح پھنساتا ہے اس کی تفصیل علامہ ابن الجوزی کی "تلبيس إبليس" اور حافظ ابن قیمؒ کی "إغاثة اللهفان" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علامہ رازیؒ نے یہاں بڑی لطیف بات فرمائی ہے:

جب شیطان انسان کا دشمن ہے تو آخر انسان اس کے پھندے میں کیسے پھنس جاتا ہے؟ اور شراب نوشی وزنا جیسے اعمال میں کیسے مبتلا ہوجاتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ شیطان انسان کے اعوان وانصار کے ذریعے سے یہ کام کرواتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت شہوانیہ دی ہے تاکہ نکاح کرے اور سلسلۂ نسب قائم رہے مگر شیطان اسی قوت شہوانیہ سے ناجائز خواہش کو پورا کرواتا ہے اور اسے ہلاکت کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوت غضبیہ دی ہے کہ اللہ کے باغیوں سے جہاد کرے، منکرات کے خلاف اقدام کرے مگر شیطان اس قوت غضبیہ کو بھڑکاتا ہے اور فتنہ وفساد کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

اور گناہوں کی طرف میلان کی یہ صورت ایسی ہی ہے جیسی مریض کی مضرِ صحت اشیاء کی طرف میلان کی ہے۔ مزاج کی تبدیلی سے بخار اور نزلے کی صورت میں جب وہ ٹھنڈا پانی پینا چاہتا ہے تو وہ اس کی بیماری میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اگر معدہ کمزور ہے اور وہ پیٹ بھر کر کھانے لگے تو یہ مزید فسادِ معدہ کا باعث بنتا ہے۔ مگر جس کا مزاج درست ہے وہ وہی چیز پسند کرے گا جو اس کے لیے فائدہ مند ہوگی۔

دنیا تو متعفن ہوا کی طرح ہے اور انسان اس میں سانس لینے سے بے نیاز نہیں ہے۔ یہ متعفن ہوا اُس کے مزاج کو برباد کردینے والی ہے اور اسے پاکیزہ اور صاف کرنے کے علاوہ

کوئی چارہ نہیں۔ اسی طرح انسان دنیا کے امور سے مستغنی نہیں اور یہی امور شیطان کے معاون ہیں۔ ان سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ذکر اللہ اور زہد و تقویٰ کا اہتمام کرے اور خواہش کا غلام نہ بنے۔ اس کا جب یوں مزاج درست ہوگا تو وہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، احکام کی پابندی میں کوئی کلفت محسوس نہیں کرے گا اور احکام الٰہی سے اسے محبت ہوگی۔ ایسے موقع پر شیطان اس سے نا اُمید ہو جائے گا۔ (ملخصاً)

﴿وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ ① پہلی آیت میں شیطان کی عبادت سے منع کیا گیا تھا اور اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کا حکم دے رہے ہیں۔ ماہر حکیم مریض کو پرہیز ہی نہیں بتلاتا بلکہ مفید صحت چیزوں کے استعمال کا حکم بھی دیتا ہے تا کہ صحت بحال ہو۔ اسی طرح حکیم مطلق نے بھی فساد سے روکا ہے اور صراطِ مستقیم کی پابندی کا حکم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے شیطان کی عبادت سے روکا ہے، پھر اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، اس لیے کہ انسان پہلے رذائل سے دست کش ہولے، پھر اس پر توحید کا رنگ چڑھے گا۔ پہلے صفائی ہوتی ہے، پھر زیبائش و آراستگی ہوتی ہے۔ توحید نفی و اثبات کا نام ہے، یعنی غیر اللہ کی عبادت کی نفی اور اللہ کی عبادت کا اثبات۔ یہی کامل توحید ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس کے مقابلے میں صراطِ جحیم ہے۔ ایک طرف عبادتِ رحمان ہے تو دوسری جانب عبادتِ شیطان ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی جب بنی اسرائیل کو دعوت دی تو فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝﴾ ②

”بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔“

یہی بات سورۃ الزخرف ③ میں بھی فرمائی گئی ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ ④

---

① یٰسٓ:61 ② آلِ عمران:51 ③ الزخرف:64 ④ آلِ عمران:101

''اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۔''

جو اللہ پر اعتماد کرے، اسی پر بھروسہ اور توکل کرے وہی صراطِ مستقیم کا راہ رو ہے۔ ایک بندۂ مومن ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کہہ کر عبدیت و توحید کا اقرار کر کے جب عرض گزار ہوتا ہے کہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ تو اس میں اسی توحید پر استقامت کا سوال ہے کہ یہی توحید و اخلاص صراطِ مستقیم ہے اور یہی ''منعم علیهم'' (انعام یافتہ لوگوں) کا راستہ ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کے جتنے بھی طریقے ہیں وہ قطعاً صراطِ مستقیم نہیں، وہ راہِ ضلالت اور صراطِ جحیم ہیں، خواہ وہ مظاہرِ قدرت کی عبادت ہو، جیسے: سورج، چاند، آگ اور کواکب یا فرشتوں یا انبیاء اور صلحاء کی عبادت ہو، یا ان کی قبروں اور مجسموں کی پرستش ہو۔ یہ تو خود اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار تھے:

﴿لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَ مَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا﴾ [1]

''مسیح علیہ السلام ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی حقیقت کا یوں اعلان کروایا گیا:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ

---

[1] النساء: 172

وَنُسُكِيْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ ①

''کہہ دے: بے شک مجھے تو میرے ربّ نے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی ہے جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا۔ کہہ دے: بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔''

یہی اعلان ایک اور اسلوب میں کروایا گیا:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾ ②

''کہہ دے: یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔''

یہ راستہ توحید کا اور اللہ کے ساتھ مخلص ہو جانے کا ہے:

﴿وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝﴾ ③

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔''

صراطِ مستقیم کے حوالے سے مزید سورۂ یٰسٓ ④ میں جو کچھ ہم ذکر کر آئے ہیں اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

---

① الأنعام:161-163 ② یوسف:108 ③ البینۃ:5 ④ یٰسٓ:4

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شیطان کے بارے میں تو فرمایا ہے کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ اللہ کی عبادت کرو کہ وہ تمھارا محبوب ہے بلکہ فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو، یہ سیدھی راہ ہے۔ کیونکہ بسا اوقات انسان محبوب کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر اس کی اطاعت کی پروا نہیں کرتا، اس لیے فرمایا کہ سیدھی راہ پر چلنا ہے تو اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا عبادت گمراہی اور شیطان کی عبادت ہے۔

''عبادت'' کے معنی انتہائی تذلل، عاجزی اور محبت کا اظہار ہیں، چنانچہ جب فرمایا کہ ﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ﴾ تو گویا اس میں اشارہ ہے کہ شیطان کے سامنے انکساری و عاجزی کا اظہار نہ کرو۔ اپنے دشمن کے سامنے جھکنا، تذلل اور عاجزی کا اظہار کرنا مردانگی نہیں بزدلی ہے۔ بلکہ اپنی عاجزی کا اظہار رب العالمین کے سامنے کرو، اسی میں تمھاری عزت ہے اور اسی میں تمھارا وقار ہے۔

﴿وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ﴾ [يٰسٓ: 62]

''اور بلاشبہ یقیناً اس نے تم میں سے بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا تو کیا تم نہیں سمجھتے تھے۔''

یہ دراصل پہلی آیات کا تتمہ ہے کہ اللہ نے تو تمھیں خبردار کیا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے، اس کی عبادت نہ کرنا، مگر تم ایسے بدقسمت نکلے کہ اس نے تم میں سے اکثر کو اپنے پھندے میں پھنسا لیا۔ تم میں اتنی بھی سمجھ بوجھ نہیں کہ تم اپنے دوست و دشمن میں امتیاز کر سکو۔

﴿جِبِلًّا﴾ مخلوق کے معنی میں ہے: ''أي خلقاً كثيراً.'' یعنی بہت سی مخلوق۔

علامہ راغب فرماتے ہیں:

««جبلا: الجماعة العظيمة، أطلق عليه تشبها بالجبل في العظم.»» ①

''بڑی جماعت کو جِبِلًّا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ کی طرح بڑی عظیم اور مضبوط ہوتی ہے۔''

اسی معنی میں یہ لفظ قرآنِ مجید میں یوں بھی آیا ہے:

﴿وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ۝﴾ ②

''اور اس سے ڈرو جس نے تمھیں اور پہلی بہت سی مخلوق کو پیدا کیا۔''

شیطان نے تو روزِ اوّل ہی کہہ دیا تھا:

﴿ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ

---

① مفردات القرآن ② الشعراء:184

عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ○﴾ ①

''پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔''

بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے جو یہ عزم کر رکھا تھا سچا کر دیا:

﴿وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○﴾ ②

''اور بلا شبہ یقیناً ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچا کر دکھایا تو مومنوں کے ایک گروہ کے سوا وہ سب اس کے پیچھے چل پڑے۔''

شیطان نے یہ بھی کہا تھا:

﴿لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ○﴾ ③

''میں ضرور ہی ان کے لیے زمین میں مزین کروں گا اور ہر صورت میں ان سب کو گمراہ کر دوں گا مگر ان میں سے تیرے وہ بندے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔''

یہ خالص وہی ہیں جو اللہ سے مخلص ہوتے ہیں اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہیں بناتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی شیطان کے پھندوں سے بچائے اور اپنا مخلص بندہ بنائے، آمین۔

﴿اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ﴾ یہاں شیطان کے پھندوں میں پھنسنے والوں سے عقل کی نفی کی گئی ہے۔ علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

''عقل اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتی ہے اور جو علم اس

---

① الأعراف:17 ② سبا:20 ③ الحجر:39،40

قوت عقل سے حاصل ہوتا ہے اسے بھی عقل کہا جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

العقل عقلان: مطبوع و مسموع
فلا ینفع مسموع إذا لم یك مطبوع
كما لا ینفع ضوء الشمس و ضوء العین ممنوع

''عقل کی دو قسمیں ہیں: عقل طبعی (جو طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے) اور عقل سمعی (جو لوگوں کی باتیں سن کر حاصل ہوتی ہے۔) اگر کوئی عقل طبعی سے محروم ہو تو اسے سن کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جیسے سورج کی روشنی اندھے آدمی کے لیے بے فائدہ ہوتی ہے۔''

عقل کے پہلے معنی کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے:

((ما خلق الله خلقًا أكرم علیه من العقل.))

''اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو۔''

اور دوسرے معنی کے لیے ایک حدیث میں اشارہ ہے:

((ما كسب أحد شیئا أفضل من عقل یهدیه إلی هدی أو یرده عن ردی.))

''کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی راہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے۔''

قرآنِ مجید میں جو فرمایا گیا ہے:

﴿وَ مَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾ ①

''اور انہیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔''

---

① العنکبوت:43

اس میں اسی معنی کے اعتبار سے عقل کی نفی کی گئی ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید میں فقدانِ عقل کی وجہ سے کفار کی جہاں مذمت کی گئی ہے وہاں بھی دوسرے معنی ہی مراد ہیں، جیسے فرمایا:

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ ①

''اور ان لوگوں کی مثال جنھوں نے کفر کیا، اس شخص کی مثال جیسی ہے جو ان جانوروں کو آواز دیتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو وہ نہیں سمجھتے۔''

اور جس عقل کے نہ ہونے سے انسان غیر مکلف ہو جاتا ہے وہ عقل کی پہلی قسم (عقل طبعی) ہے۔ دراصل العقل کے معنی روکنا اور منع کرنا ہیں، جیسے: ''عقال'' یعنی پائے بند، جس سے اونٹ کا پاؤں باندھا جاتا ہے۔'' ②

جس طرح یہ رسی اونٹ کو اِدھر اُدھر جانے سے روکتی ہے اسی طرح عقل بھی انسان کو معصیت اور نافرمانی سے روکتی ہے۔

عقل کے مفہوم کی تائید میں جو روایات علامہ راغب اصفہانی نے ذکر کی ہیں وہ دونوں سخت ضعیف ہیں بلکہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے:

«أحاديث العقل كلها كذب.» ③

''عقل سے متعلقہ تمام احادیث جھوٹی ہیں۔''

علامہ سیوطیؒ نے بھی انھیں اللآلیء المصنوعة ④ میں ذکر کیا ہے۔

البتہ جو معنی انھوں نے بیان کیے ہیں عموماً ائمہ لغت اور فقہائے کرام نے ان کی تائید کی ہے۔ البتہ ''عقل'' کا تعلق سمعی دلائل سے ہی نہیں بلکہ آفاقی و انفسی دلائل سے

---

① البقرة:171 ② مفردات

③ المنار المنيف، ص:66

④ اللآلیء المصنوعة 1/ 129، 130 ، اتحاف السادة المتقين:1/ 461.

بھی ہے۔

اس ضمن میں علمائے کرام نے یہ بحث بھی کی ہے کہ عقل کا محل دماغ ہے یا دل۔

صحیح یہی ہے کہ اس کا محل دل ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی محلِ عقل دل کو ہی قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۃ الحج میں ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ ①

''پھر کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ساتھ وہ سمجھیں یا کان ہوں جن کے ساتھ وہ سنیں، پس بے شک قصہ یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں اور لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا﴾ ②

''ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں۔''

علامہ فیروز آبادیؒ فرماتے ہیں: ''عقل ایک نور ہے جس سے انسان علوم ضروریہ اور نظریہ کا اِدراک حاصل کرتا ہے۔''

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

''دل چشمے کی مانند ہے اور اس میں عقل کا عمل دخل اسی طرح ہے جیسے آنکھ میں قوت بصری کا ہے۔'' ③

---

① الحج:64
② الأعراف:179
③ احياء علوم الدين: 16/3

اس آیت میں عقل کی نفی کا یہی مفہوم ہیکہ تم لوگ دشمن سے خبردار کر دینے کے باوجود اسی کے ہم نوا بنے رہے، اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی۔ قیامت کے روز اعتراف کریں گے:

﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ ①

''اگر ہم (اللہ اور اس کے رسول کی بات) سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔''

یہاں سمعی دلائل اور عقل کی نفی سے مراد یہی انفسی وآفاقی دلائل سے بے اعتنائی ہے۔

دل کی حکمرانی:

ایک دور میں یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ دل محض خون کو پمپ کرنے کا آلہ ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دل سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا ایک اہم عضو ہے۔ ہر زبان میں اور ہر دور کے ادب میں محبت، نفرت، دوستی، دشمنی، امانت، خیانت، سخاوت اور بخل جیسے تمام جذبات کا تعلق دل سے ہی جوڑا جاتا ہے۔ اسی تصور کے تحت دل جیتے اور ہارے جاتے ہیں۔ محبوب دلوں ہی میں بستے ہیں، محبت اور عداوت کو دل ہی سے جوڑا جاتا ہے۔ تنگ دلی اور دریا دلی کے محاورات قائم ہیں۔ تمام زبانوں میں دل کشی، دل فریبی، دل نوازی، دل ربائی، دل داری کی ترکیبیں رائج ہیں۔ دل صاف ہونا، دل میلا ہونا، دل ٹوٹنا، دل دکھانا، دل بہلانا، دل لگانا، دل جلانا، دل خوش کرنا، دل باغ باغ ہونا، دل نوازی، دل آزاری، دل میں نیت کرنا، دل نرم یا سخت ہونا، دل شکنی، دل شکستہ، اور دل سے دعا کرنا جیسے سینکڑوں محاورے اس حقیقت کے غماز ہیں کہ دل محض خون پمپ کرنے کا آلہ ہی نہیں بلکہ سمجھنے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی اسے حاصل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی اسی اہمیت کے پیش نظر ارشاد فرمایا:

---

① الملك:10

ألا وإنّ في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كلّه و
إذا فسدت فسد الجسد كلّه ألاّ وهي القلب. ①
خبردار! جسم میں ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا
ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار! وہ دل ہے۔

دل کے بگاڑ سے ہی حسد، بغض، کینہ، تکبر، حرص، لالچ، خود غرضی، خودنمائی، لوٹ مار، اور دنگا فساد جیسے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ اِس حقیقت کا اعتراف تو اب جدید سائنس بھی کر چکی ہے کہ دل سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک امریکی ریاست کیلیفورنیا کے ''دی انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ میتھ'' کے ڈائریکٹر ریسرچ ڈاکٹر رولن میک کریٹی نے کہا ہے کہ ''دل میں بھی ایک دماغ ہے۔'' اس کی وضاحت انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے: ''دل ایسے اعصاب اور خلیات رکھتا ہے جن کا کام بالکل وہی ہے جو دماغ کا ہے، مثلاً یادداشت۔ یہ علم الابدان کی ایک حقیقت ہے کہ دل دماغ کو اس سے زیادہ معلومات بھیجتا ہے جو دماغ دل کو ارسال کرتا ہے۔'' ''دل کا دماغ'' (heart brain) کی اصطلاح 1991 میں ڈاکٹر جے اینڈریو آرمر نے وضع کی۔ انھوں نے دل کو چھوٹے دماغ (mini brain) کا نام بھی دیا۔ ہارورڈ میڈیکل سکول کے مطابق ''دل اور دماغ کے درمیان کیمیائی بات چیت دونوں اعضا کو متاثر کرتی ہے۔ افسردگی، تناؤ، احساس تنہائی، مثبت سوچ اور دوسرے نفسیاتی و سماجی عوامل دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دل کی صحت دماغ اور ذہن پر اثر ڈال سکتی ہے۔''

اسی طرح ڈاکٹر ڈومینک سرل لکھتے ہیں: ''پچھلے دو عشروں میں ہونے والی تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ دل اطلاعات کی پروسیسنگ (processing) کا مرکز ہے، جو سیکھ سکتا ہے، یاد رکھ سکتا ہے۔ کھوپڑی میں موجود دماغ سے بالا رہتے ہوئے خودمختارانہ طور پر کام کر

---

① بخاري:52

سکتا ہے اور عملاً کلیدی طور پر دماغ کو سگنل بھیجتا اور مربوط کرتا ہے۔ اور یوں ہمارے فہم وادراک اور جذبات کو منضبط کرتا ہے۔ گویا ہم اپنے سینے میں ایک دوسرا دماغ رکھتے ہیں۔ ①

جدید سائنس نے گویا صدیوں بعد اُس حقیقت کا اعتراف کرلیا، جس کا اظہار بہت عرصہ پہلے خود خالقِ ہستی نے قرآن مجید میں فرمادیا تھا کہ سوچنے اور فیصلے کرنے کا مرکزی کردار دل ہی ادا کرتا ہے۔

---

① روزنامہ رہنمائے صحت، فیصل آباد جون 2014

﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [یٰسٓ: 63-65]

"یہ ہے وہ جہنم جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ آج اس میں داخل ہو جاؤ اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے۔ آج ہم ان کے مونھوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کمایا کرتے تھے۔"

ہماری بار بار یاد دہانیوں کے باوجود تم شیطان کے ہاتھوں کھلونا بنے رہے۔ ہم نے تمھیں عقل دی مگر تم نے بے عقلی کا مظاہرہ کیا، اب اس کا انجام یہی جہنم ہے جس کا تمھیں نافرمانیوں کے نتیجے میں وعدہ دیا گیا تھا۔ ہمارے رسول تمھیں اس بھڑکتی آگ سے ڈراتے تھے کہ اگر تم ایمان نہ لائے اور اللہ کی بندگی میں کسی کو شریک ٹھہرایا تو تمھارا ٹھکانہ جہنم ہوگا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ○﴾ ①

"بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔"

مگر تم نے ان کی اس وارننگ کو کوئی اہمیت نہ دی، اس لیے کفر و شرک کی جو راہ تم نے اختیار کی اس کے بدلے میں جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

---

① المائدۃ:72

﴿اِصۡلَوۡ﴾ کا مادہ "صلی" ہے جس کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں۔

"صلي بالنار." یعنی اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ ①

فرشتوں کو حکم ہوگا:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ﴾ ②

"اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنا دو۔ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو۔"

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ﴾ "آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے۔"

﴿نَخْتِمُ﴾ جمع متکلم کا صیغہ ہے اور اس کا مادہ "ختم" ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا۔ اور کبھی اس نشان کو بھی "ختم" کہہ دیتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔ اور کبھی اس سے مراد محفوظ کرنا ہوتا ہے، جیسے کتابوں یا دروازوں یا تھیلوں پر مہر لگا کر انھیں سیل کر دیا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے اندر داخل نہ ہو۔

"أفواه" "فم" کی جمع ہے اور "فم" اصل میں "فوہ" ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں قول کی نسبت "فم" کی طرف کی گئی ہے وہاں دروغ گوئی کی طرف اشارہ ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں، حقیقت اس کے خلاف ہے، جیسے فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ﴾ ③

"یہ تمھارا اپنے مونہوں سے کہنا ہے۔"

قیامت کے دن جب نامۂ اعمال ان کے سامنے کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھو تو وہ اس کا انکار کریں گے کہ ہم نے تو یہ اعمال کیے ہی نہیں، خواہ مخواہ ہمارے ذمے لگا دیے گئے ہیں۔ حتی کہ وہ اپنے مشرک ہونے کا بھی انکار کر دیں گے، چنانچہ جب انھیں کہا جائے گا: جنھیں تم نے شریک بنا رکھا تھا وہ آج کہاں ہیں تو وہ

---

① مفردات ② الحاقة:31,30 ③ الأحزاب:4

کہیں گے:

﴿وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ٥ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ٥﴾ ①

''اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔ دیکھ انھوں نے کیسے اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے۔''

چنانچہ ان کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضاء بول بول کر بتائیں گے کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں کیوں ہنسا ہوں؟'' ہم نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے بندے کی اپنے رب سے اس بات پر ہنسی آئی ہے کہ بندہ کہے گا: اے میرے رب! کیا آپ نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیوں نہیں! بندہ کہے گا: آج میں اپنے خلاف اپنے سوا کسی اور کو گواہی دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: آج تمھارے خلاف تمھاری اپنی گواہی یا ''کراماً کاتبین'' کی گواہی کافی ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضاء سے کہا جائے گا: تم بتلاؤ، پھر اس کے اعضاء اس کے اعمال کو بیان کریں گے۔ (جب اعضاء گواہی دے دیں گے) تو پھر وہ اپنے اعضاء سے کہے گا:

«بعدا لكن وسحقا، فعنكن كنت أناضل.» ②

''دور دفع ہو، میں تمھارے لیے ہی جھگڑا کر رہا تھا۔''

اس موضوع کی دیگر روایات کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر میں اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ''الدر المنثور'' میں ذکر کیا ہے۔ یہاں صرف ہاتھوں کے کلام کرنے اور پاؤں کی گواہی

---

① الأنعام: 24,23

② صحیح مسلم: 2968، أحمد وغیرہ۔ الدر المنثور: 267/5

کا ذکر ہے مگر ان کے علاوہ دیگر اعضاء کے بولنے اور انسان کے خلاف گواہی دینے کا بھی ذکر ہے، چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۝ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝﴾ ①

''اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پھر ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی۔ یہاں تک کہ جونہی اس کے پاس پہنچیں گے ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے: ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔''

یہ آیت اس حقیقت کی غماز ہے کہ زبان اس لیے نہیں بولتی کہ وہ زبان ہے بلکہ یہ اللہ کا لطف وکرم ہے کہ وہ بولتی ہے۔ یہی نوعیت دوسرے اعضائے انسانی کی ہے۔ اگر کلام کرنے کا سبب صرف زبان ہوتی تو ضروری تھا کہ ہر زبان رکھنے والا بولتا خواہ وہ انسان ہے یا حیوان اور بالخصوص کوئی انسان گونگا نہ ہوتا اور قیامت کے دن بھی بولتا مگر روزِ قیامت زبان ہونے کے باوجود وہ نہیں بولے گا کہ آج اسے اپنی مرضی سے بولنے کی اجازت نہیں بلکہ بس وہی بول سکے گا جسے اجازت ہوگی اور اس کی بات سچی ہوگی، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا

---

① حٰمٓ السجدة: 19-21

يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ①

''جس دن ان کی زبانیں اوران کے ہاتھ اوران کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

زبان بولے گی کہ وہ کیا کیا کفر بولتی رہی، کیا کیا جھوٹ بولے، کن کن پر الزام تراشیاں اور بہتان طرازیاں کیں اور کیسے کیسے فتنے برپا کیے۔ ہاتھ بتائیں گے: انھوں نے کیا کیا ستم ڈھائے، کیسے کیسے جھوٹے افسانے اور جھوٹی احادیث لکھ لکھ کر انھیں فروغ دیا۔ پاؤں اعتراف کریں گے کہ وہ کن کن بے حیائی کے اڈوں اور مجلسوں میں چل کر گئے، کتنے ظالموں کی ہمدردی میں آگے بڑھے، چوری اور ڈاکہ ڈالنے کہاں کہاں پہنچے، کن کن بت خانوں اور آستانوں میں حاضری دی۔ یوں سب اعضاء اپنی ''کارکردگی'' کا اظہار کریں گے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سورۃ النور میں زبان کی گواہی کا ذکر ہے۔ زبان سے متعلقہ گناہوں میں ایک بڑا گناہ پاک باز عورت پر بدکاری کی تہمت لگانا ہے۔ اس آیت سے پہلے کی آیت میں اسی گناہ کا ذکر ہے اور اس جرم کے مرتکب کو دنیا و آخرت میں لعنت کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ سب سے بڑا بہتان صدیقہ کائنات سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ہے اور اسی تناظر میں روز قیامت زبان کی گواہی کا ذکر ہے۔ بلکہ زبان تمام اعضاء کی نسبت خطرے اور گناہ میں بڑھی ہوئی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا: ''معاذ اس کو روکے رکھو۔'' میں نے عرض کیا: کیا ہم جو کچھ بولتے ہیں اس کا مواخذہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا:

((ثكلتك أمك يا معاذ! وهل يكب الناس في النار على وجوههم إلا حصائد ألسنتهم.)) ②

---

① النور:24 ② جامع ترمذي: 2616

”اے معاذ! تمھیں تمھاری ماں گم پائے، لوگ اپنی زبان سے لوگوں کے بارے میں کہی گئی باتوں کی وجہ سے جہنم میں منہ کے بل ڈالے جائیں گے۔“

زبان کی بے شمار لغزشوں سے بچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے جس کی نشاندہی رسول اللہ ﷺ نے ((مَنْ صَمَتَ نَجَا.)) ① ”جو خاموش رہا نجات پا گیا۔“ کہہ کر فرمادی ہے۔

ایک اشکال کا جواب

یہاں بظاہر ایک اشکال وارد ہوتا ہے جس کا اظہار حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی کیا گیا تھا کہ قرآنِ مجید میں ایک جگہ تو ارشاد ہے:

﴿وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا۝﴾ ②

”اور (کفار قیامت کے دن) اللہ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔“

جب کہ دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۝﴾ ③

”(کفار کہیں گے:) اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔“

بظاہر ان دونوں آیات میں تعارض ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کفار دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے سوا جنت میں کوئی نہیں جا رہا اور شرک کے علاوہ ان کے گناہوں کی معافی اور تلافی ہو رہی ہے تو وہ اپنے ہم نوالہ وہم پیالہ سے کہیں گے کہ ہم شرک کے جرم سے ہی انکار کر دیں، چنانچہ جب وہ کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے تو ان کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی، اب وہ اپنی مرضی سے بول نہیں سکیں گے۔ زبان بول کر ان کے شرکیہ کلمات اور ان کے کفریہ اعمال کی گواہی دے گی بلکہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، تمام متعلقہ اعضاء بول کر حقیقت کا اظہار کر رہے ہوں گے۔ اعضاء کی ان کے خلاف گواہی ان کے لیے دہری شرمندگی کا باعث بن رہی ہوگی:

---

① جامع ترمذي: 2501

② النساء: 42 ③ الأنعام: 23

﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ط وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًاo﴾ ①

''اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، چاہیں گے کاش! ان پر زمین برابر کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔''

یہاں یہ بات باعثِ عبرت ہے کہ مشرکین دنیا میں اپنے شرک کا اعتراف کرتے تھے اور کہتے تھے:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ ②

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہی ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔''

مگر یہ اعتراف اس لیے تھا کہ انھیں کہا جاتا تھا کہ تم شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ اگر یہ شرک ہے اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اللہ کا شریک نہ بناتے۔ گویا وہ اپنے کفر و شرک کو حقیقتاً شرک نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھانے کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا مگر ان کی سرکشی ختم نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ قیامت کے روز جب وہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور دیگر اعضاء حقیقت کا اظہار کریں گے۔

آج یہود و ہنود اور نصاریٰ تو کیا، مسلمان بھی مشرکانہ اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کو نورِ وحدت کا ٹکڑا قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں، ان سے رزق اور اولاد طلب کرتے ہیں اور انھیں مافوق الاسباب مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ بیت اللہ کی طرح ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، انھیں غسل دیتے اور ان پر غلاف چڑھاتے ہیں۔ ان کی نذر و منت مانتے ہیں اور نماز کی طرح ان کے پاس ہاتھ باندھ کر قیام کرتے ہیں اور انھیں سجدہ کرتے ہیں۔ اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب انھیں

---

① النسآء:42 ② الأنعام:148

پکارا جائے تو وہ ہماری پکار سنتے اور مدد کو پہنچتے ہیں۔ یہ سب امورِ شرک بجالاتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں: ہم شرک نہیں کرتے۔ اور کل قیامت کو بھی کہیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے۔ مگر اس وقت یہ انکار الٹا ان کے لیے باعثِ ندامت و شرمندگی ہوگا۔

اعضاء کی گواہی:

یہاں مجرموں کے حوالے سے اعضاء کی گواہی کا ذکر ہوا ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، یکا یک آپ اتنا ہنسے کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر ہم سے فرمایا: جانتے ہو میں کیوں ہنسا ہوں؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: بندہ جو اپنے رب سے قیامت کے دن جھگڑا کرے گا، اس پر (ہنسا ہوں)۔ کہے گا: اے اللہ! کیا تو نے مجھے ظلم سے بچایا تھا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ہاں۔ وہ کہے گا: میں اپنے خلاف کسی کی گواہی قبول نہ کروں گے۔ میرا بدن ہی میرا ہے باقی سب میرے دشمن۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یونہی سہی۔ تیرے لیے تیرا جسم اور میرے بزرگ فرشتے ہی گواہ سہی۔ چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضائے بدن سے کہا جائے گا کہ خود گواہی دو کہ تم سے اِس نے کیا کام لیے ہیں؟ وہ ایک ایک بات بتا دیں گے۔ پھر جب اس کے منہ کی مہر کھول دی جائے گی، تو یہ اپنے اعضاء سے کہے گا: تمھارا ستیاناس ہو، تم ہی میرے دشمن بن گئے، میں تو تمھارے بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا۔ ① حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس موضوع کی دیگر احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اَوَّل عظم من الانسان يتكلّم يوم يختم على الافواه فخذه من الرَّجلِ اليسرى. ②

جس دن مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اس دن سب سے پہلے انسان کا جو عضو کلام کرے گا وہ اس کی بائیں ران ہوگی۔

---

① مسلم وغیرہ، ابن کثیر: 634/3 ② ابن کثیر احمد: 151/4، مجمع 351/10

ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے انسان کی ران اور ہاتھ بولیں گے۔ ①

صرف اعضاء ہی نہیں بلکہ زمین کے جس حصے پر جو عمل کیا گیا ہوگا زمین کا وہ ٹکڑا بھی بول کر بتلائے گا کہ اس نے مجھ پر یہ اور یہ عمل کیا تھا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ ②

''اس دن وہ (زمین) اپنی خبریں بیان کرے گی۔'' اور پوچھا:

''تمھیں معلوم ہے کہ اس کی خبریں کیا ہوں گی؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی خبریں یہ ہیں کہ ہر مرد اور عورت نے جو اُس (زمین) پر کیا ہوگا وہ ٹکڑا اس کی گواہی دے گا کہ اس نے فلاں اور فلاں دن یہ اور یہ کام کیا تھا۔'' ③

حکمؒ فرماتے ہیں: میں نے ابوامیہؒ کو بیت اللہ شریف میں دیکھا کہ وہ فرض نماز کے بعد کچھ آگے بڑھے اور اس جگہ پر نماز پڑھی، پھر آگے بڑھے تو وہاں بھی نماز پڑھی۔ یوں جگہ بدل بدل کر وہ نوافل پڑھتے تھے۔ میں نے انھیں پوچھا: یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: میں نے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن یہ جگہیں گواہی دیں۔ ④

عبداللہ بن عبدالرحمٰنؒ فرماتے ہیں: مجھے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں دیکھتا ہوں کہ تم بکریوں اور صحرا کو پسند کرتے ہو۔ جب تم صحرا میں ہو اور نماز کے لیے اذان کہو تو اونچی آواز سے اذان کہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مؤذن کی آواز جو بھی سنتا ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان یا کوئی اور قیامت کے دن سب اس کی شہادت دیں گے۔ ⑤

ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ درخت، مٹی کے ڈھیلے، پتھر اور جن وانس الغرض جہاں تک آواز پہنچی ہوگی، کل قیامت کے دن وہ سب چیزیں گواہی دیں گی۔

---

① مسند احمد 3/5، مجمع الزوائد: 351/10 ② الزلزال: 4

③ ترمذي: 3353 وقال: حسن صحيح، أحمد، ابن جرير، حاکم وغیرہ

④ عبد بن حميد، الدر المنثور: 380/6 ⑤ صحیح بخاری: 609

ابوداود اور نسائی میں ہے کہ ہر تر اور خشک چیز گواہی دے گی۔ ①

حضرت یسیرہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا:

((علیکن بالتسبیح والتهلیل والتقدیس، واعقدن بالأنامل فإنهن مسؤولات مستنطقات ولا تغفلن فتنسین الرحمة.)) ②

''تم تسبیح تہلیل اور تقدیس کو لازم پکڑو اور انگلیوں کے پوروں سے ان کا شمار کرو کیونکہ ان سے سوال کیا جائے گا اور ان سے کہلوایا جائے گا۔ تم (ان کے پڑھنے میں) غفلت نہ کرو کہ اللہ کی رحمت کو بھول جاؤ گی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مومن کے اعضاء اس کے نیک اعمال کی گواہی دیں گے۔ فرعون کی تباہی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ﴾ ③

''پھر نہ ان پر آسمان و زمین روئے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے۔''

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آسمان کے جس دروازے سے مومن کا رزق آتا ہے اور اعمالِ صالحہ اوپر جاتے ہیں مومن کے فوت ہونے پر وہ دروازہ بند ہو جاتا ہے اور وہ روتا ہے۔ اور جہاں وہ نماز پڑھا کرتا تھا اور جہاں ذکر کرتا تھا زمین کا وہ حصہ بھی روتا ہے۔ آلِ فرعون کا کوئی عمل صالح نہ تھا، اس لیے نہ ان پر زمین روئی اور نہ آسمان۔ ④

تقریباً یہی قول امام مجاہد، قتادہ اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ سے منقول ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندۂ مومن ذکر کرتا ہوا پہاڑ کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ دوسرے پہاڑ کو آواز دیتا ہے کہ کیا تمھارے پاس بھی کوئی اللہ کا ذکر

---

① فتح الباري: 89/2

② ترمذي: 3486، 3583، أبو داود، حاكم، ابن حبان وغيرهم

③ الدخان: 29

④ ابن جرير، عبد بن حميد وغيره، الدر المنثور: 30/6

کرتا ہوا گزرا ہے؟ جب وہ کہتا ہے: ہاں، گزرا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ ①

اس لیے قیامت کے دن صرف اعضاء ہی کی گواہی نہیں ہوگی بلکہ زمین بھی گواہی دے گی۔ فساق وفجار کے بارے میں یہ گواہی ان کو ذلیل ورسوا کرنے کے لیے ہوگی اور صالحین کے بارے میں یہ گواہی ان کی رفعِ منزلت اور عزت افزائی کے لیے ہوگی۔

﴿بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ جو وہ کمایا کرتے تھے۔ یہاں "يَعْمَلُونَ" نہیں بلکہ ﴿يَكْسِبُونَ﴾ فرمایا گیا ہے۔ "کسب" اس عمل کو کہتے ہیں جو قصد اور ارادے سے کیا جائے۔ جب کہ "عمل" سہو وخطا اور جہالت وبے علمی کی بنا پر بھی ہوتا ہے اور اس پر مواخذہ نہیں ہوتا، اسی لیے فرمایا گیا ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ ②

"اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا۔"

یہاں بھی ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ کہا گیا ہے کہ اعمال کا دارومدار قصد ونیت پر ہے۔ اسی نیکی کا اجر ہے جو اللہ کی رضا کے لیے کی گئی تھی اور آخرت میں اسی گناہ پر مواخذہ ہوگا جو قصد وارادے سے کیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وضع عن أمتي الخطأ والنسيان وما استكرهوا عليه.)) ③

"میری امت سے خطا ونسیان اور وہ عمل جس پر انھیں مجبور کردیا جائے ختم کردیا گیا ہے۔"

---

① طبراني ورجاله رجال الصحيح، مجمع: 10/79

② البقرة:286 ③ طبراني، إرواء الغليل:82

﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ۝ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [یٰسٓ: 66-68]

''اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً ان کی آنکھیں مٹا دیں، پھر وہ راستے کی طرف بڑھیں تو کیسے دیکھیں گے؟ اور اگر ہم چاہیں تو یقیناً ان کی جگہ ہی پر ان کی صورتیں بدل دیں، پھر نہ وہ (آگے) چل سکیں اور نہ واپس آئیں۔ اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا کر دیتے ہیں تو کیا یہ نہیں سمجھتے۔''

پہلی آیات میں قیامت کے دن مجرموں سے جو ہونے والا ہے اس سے خبردار کرنے کے بعد اب ان آیات میں متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو انھیں مہلت ملی ہوئی ہے، اس سے وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، درست ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوتا تو انھیں انعام و اکرام سے نہ نوازتا۔ ان کی اس غلط فہمی کا ازالہ ایک مقام پر یوں فرمایا گیا ہے:

﴿وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ ①

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کریں کہ بیشک جو مہلت ہم انھیں دے رہے ہیں وہ ان کی جانوں کے لیے بہتر ہے، ہم تو انھیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

---

① آل عمران:178

یہی بات ایک دوسرے اسلوب میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے کفر وشرک کے باوجود جو انھیں مہلت دی جارہی ہے وہ، اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو انھیں چلتے پھرتے یا مجلسوں میں بیٹھے ہوئے آنِ واحد میں اندھا کر دیں اور ان کی آنکھوں کا نشان مٹا دیں۔

''طـمـس'' کے معنی ہیں کسی چیز کے خدوخال اور نشان مٹا دینا۔ ''عـمـي'' یعنی اندھا پن، یہ آنکھ کے نہ ہونے کو مستلزم نہیں مگر ''طـمـس'' سے آنکھ کا یک بارگی نام و نشان مٹا دینا مراد ہے۔ گویا جو ذات آنکھ کا حالہ بنانے پر قادر ہے، وہ اسے آناً فاناً مٹا دینے پر بھی قادر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے التجا کی تھی کہ اے اللہ! انھیں مال وزینت اس لیے دے رکھی ہے کہ یہ تیرے راستے سے گمراہ کریں؟

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ﴾ ①

''اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے۔''

یعنی تباہ و برباد اور ختم کر دے۔ اس آیت میں طمس کے معنی ہیں تباہ و برباد کرنا اور نام ونشان مٹا دینا۔

﴿فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ﴾ ایسی صورتِ حال کے بعد جب وہ ان راستوں کی طرف بڑھیں جن راستوں پر وہ روزانہ آتے جاتے ہیں تو انھیں کیا نظر آئے گا؟ اچانک اندھے ہو جانے پر وہ کوشش کریں کہ ایک دوسرے سے سبقت لے جا کر راستے کو پالیں تو وہ راستہ کیونکر پائیں گے؟ یہی قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو درست قرار دیا ہے۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی منقول ہے اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ اگر ہم انھیں گمراہ کریں تو وہ ہدایت کو کیسے پا سکتے ہیں؟ گویا وہ یہاں بصارت کے ساتھ بصیرت کی محرومی مراد لیتے ہیں۔

---

① یونس:88

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر جباری لگا دی ہے اور وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کسی کی آنکھوں کو مٹا دے تو وہ راستہ نہیں پا سکتا اسی طرح اللہ جس سے بصیرت سلب کر لے وہ راہِ ہدایت کیونکر پا سکتا ہے؟

﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ﴾ "مسخ" کے معنی ہیں شکل وصورت بگاڑ دینا۔ اور اگر ہم چاہیں تو آنِ واحد میں جہاں وہ کھڑے یا بیٹھے ہیں، انھیں مسخ کر دیں۔ یعنی وہ وہاں سے ہلنے بھی نہ پائیں، جیسا کہ بعد کے الفاظ اس کے مُشعر ہیں:

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ۝﴾

''پھر نہ وہ (آگے) چل سکیں اور نہ واپس آئیں گے۔''

یہی مفہوم امام حسن بصری اور امام قتادہ رحمہما اللہ نے لیا ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ یعنی جن ٹانگوں کے بل بوتے پر وہ سارے کام سرانجام دے رہے ہیں، ہم چاہیں تو ان میں بگاڑ پیدا کر دیں یا ان پر فالج گرا دیں اور یوں ان کی ساری دوڑ دھوپ خاک میں مل جائے۔ یا ان کی شکلیں تبدیل کر دیں اور ندامت کے مارے کہیں آنے جانے کے لائق بھی نہ رہیں۔ مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مسخ" سے مراد اُن کی ہلاکت و بربادی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گھروں میں انھیں ہلاک کر دیں۔ ابوصالح سے مروی ہے کہ ہم انھیں پتھر بنا دیں اور وہ کہیں آ جا نہ سکیں۔

یاد رہے کہ بعض نے "مسخ" سے اخلاق و عادات کا بگاڑ مراد لیا ہے، مثلاً کسی انسان کے اندر کتے کی سی حرصِ شدید پیدا کر دی جائے یا اسے خنزیر کی طرح جنسی خواہش میں اندھا کر دیا جائے۔ لیکن یہ تاویل یہاں درست نہیں کیونکہ عادات کے بدلنے سے ان کے آنے جانے میں کوئی فرق نہیں آتا مگر یہاں تو آنے جانے کی صاف نفی ہے، اس لیے یہاں مسخِ عادات یا مسخ معنوی مراد لینا درست نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہفتے کے دن کا احترام نہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ ①

''ہم نے ان سے کہا ذلیل بندر بن جاؤ۔''

ایک جگہ ان کے بارے میں ﴿وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ﴾ ② کے الفاظ ہیں کہ ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دیا۔ بعض نے یہاں بھی معنوی طور پر ان کا مسخ مراد لیا ہے کہ ان کے اخلاق و اطوار بندروں اور خنزیروں کی طرح کے ہو گئے تھے، ان کی شکلیں تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر امام ابن جریرؒ اور علامہ رازیؒ نے اس تاویل کی سخت تردید کی ہے اور اس بارے میں توہمات کے مُسکت جواب دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سزا کو موجودہ لوگوں اور آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت اور تقویٰ شعار لوگوں کے لیے نصیحت قرار دیا ہے:

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ ③

''تو ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے، ایک عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت بنا دیا۔''

محض عادات کے بدلنے سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ شخص خود بھی اسے سزا محسوس نہیں کرتا۔ یورپ آج بھی خنزیروں کی طرح جنسی خواہشات میں اندھا ہے۔ وہاں باہمی رضا سے زنا کو زنا شمار نہیں کیا جاتا۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جنسی تسکین کے لیے مردوں کی مردوں سے شادی قانوناً جائز قرار دے دی گئی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے اخلاقی بگاڑ کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے اغلام بازی سے روکنے والوں کے بارے میں کہا:

﴿اَخْرِجُوْا آلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ ④

''لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے نکال دو، بلاشبہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بہت پاکباز

---

① البقرۃ:٦٥ ② المائدۃ:60 ③ البقرۃ:66 ④ النمل:56

بنتے ہیں۔‘‘

گویا بُرائی سے روکنے والوں کو وہ پاک بازی کا طعنہ دیتے تھے۔ آج بھی اہل یورپ اپنی ان بدخصلتوں پر پابندی کے مطالبے کو آزادی کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ کیا خنزیروں کی ایسی خصلت اختیار کر لینے والے اسے اپنے لیے عذاب تصور کرتے ہیں؟ اور اس معاشرے میں بسنے والوں کے لیے اس میں کوئی عبرت کا سامان ہے؟ اگر نہیں تو اس مسخ کو معنوی مسخ قرار دینا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

اگرچہ مسخ کے یہ دونوں معنی کیے گئے ہیں مگر زیرِ بحث آیت میں جیسے مسخ سے مراد مسخ معنوی لینا درست نہیں اسی طرح یہود پر مسخ کے عذاب کو بھی مسخ معنوی مراد لینا درست نہیں۔ یہاں مسخ حقیقی و حسی ہی مراد ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں۔ وہ جس کے بارے میں جو چاہے فیصلہ فرما دیتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أما يخشى أحدكم -((أو:ألا يخشى أحدكم)) - إذا رفع رأسه قبل الإمام أن يجعل الله رأسه رأس حمار أو يجعل الله صورته صورة حمار.))①

’’تم میں سے کوئی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ جب وہ (رکوع یا سجدے سے) امام سے پہلے سر اٹھالے تو اس کا سر اللہ تعالیٰ گدھے کا سر بنادے یا اس کا چہرہ گدھے کا چہرہ بنادے۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے، اس لیے ”مسخ“ سے معنوی مسخ مراد لینا درست نہیں۔ طمسِ أعین ہو یا مسخ ہو، یہ سب اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اور اس کی مشیت بھی حکمت پر مبنی ہے:

---

① صحيح بخاري: 691، صحيح مسلم: 427

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ ①

''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا کمال حکمت والا ہے۔''

اس لیے اگر کسی نافرمانی پر مسخ کی سزا نہیں دیتا تو یہ اس کے علم وحکمت کے مطابق ہے۔

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ سابقہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ کی جس قدرت کاملہ کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمھیں اندھا کر دینا اور تمھیں مسخ کر دینا کوئی مشکل نہیں، اس آیت میں اسی پر ایک روشن دلیل کا ذکر ہے کہ جسے ہم عمر دیتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا کر دیتے ہیں۔

﴿نُعَمِّرْ﴾ عمر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمر بڑھانا، عمر دراز کرنا۔ سورۂ فاطر میں ہے:

﴿وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ﴾ ②

''اور نہ کسی عمر پانے والے کی عمر بڑھائی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے۔''

﴿نُنَكِّسْهُ﴾ اس کا مادہ ''نکس'' ہے جس کا معنی کسی چیز کو اوندھا اور الٹا کر دینا ہے۔ اسی سے ''نکس الولد'' ہے، یعنی ولادت کے وقت بچے کے پاؤں کا سر سے پہلے باہر آنا۔ گویا یہ بھی الٹی کیفیت ہے، ورنہ ولادت کے وقت سر پہلے باہر آتا ہے۔ مجرموں کے بارے میں آیا ہے:

﴿وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ③

---

① الدهر:30 ② فاطر:11 ③ السجدہ:12

''اور کاش! تُو دیکھے جب مجرم لوگ اپنے رب کے پاس اپنے سر جھکائے ہوں گے۔''

انسان بہت سے مراحل سے گزر کر پیدا ہوتا ہے۔ درجہ بہ درجہ جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے۔ شان وشوکت کے مظاہرے کر کے، اپنی قوت وطاقت تسلیم کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ زندگی کی یہ نشوونما رُک جاتی ہے اور چکر اُلٹا چلنے لگتا ہے۔ قویٰ کمزور ہونے لگتے ہیں، ساری عادتیں وخصلتیں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔ آنکھ اور کان جیسے ساتھی ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں حتی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ بچوں کی طرح دوسروں کے سہارے پر اُٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا ہے۔ بچوں کی طرح بستر پر بول وبراز نکل جاتا ہے، پھر بچوں کی طرح کپڑے تبدیل کیے جاتے ہیں۔ جس عقل ودانش پر ناز کرتا تھا وہ بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ لوگ کہنے لگتے ہیں: کیسی بچوں جیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس زندگی کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ۝﴾ [1]

''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں کمزوری سے پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد قوت بنائی، پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا بنا دیا، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا ہے، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

یہ بات ذرا تفصیل سے یوں بیان ہوئی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ

---

[1] الروم 54:

تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ ①

''اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کے بارے میں کسی شک میں ہو تو بے شک ہم نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر کچھ جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کی ایک بوٹی سے جس کی پوری شکل بنائی ہوئی ہے اور جس کی پوری شکل نہیں بنائی ہوئی، تا کہ ہم تمھارے لیے واضح کریں اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر ہم تمھیں ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں، پھر تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو قبض کر لیا جاتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تا کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے اور تُو زمین کو مردہ پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور اُبھرتی ہے اور ہر خوب صورت قسم میں سے اُگاتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ بے شک اللہ ہی حق ہے اور (اس لیے) کہ بے شک وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور (اس لیے) کہ بے شک وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

سورۂ یٰسٓ کی اس آیت میں اسی صورتِ حال کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور بتلایا گیا

---

① الحج:6,5

ہے کہ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں۔ زندگی و موت، صحت و جوانی، قوت و طاقت اور عقل و فہم سب اللہ کی عطا کا نتیجہ ہے۔

آخر میں فرمایا: ﴿اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ﴾ یہ (اس حقیقت کو) کیوں نہیں سمجھتے۔ جیسے ان کی جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو کر ختم ہو جاتی ہے اسی طرح یہ دنیا بھی ایک دن ختم ہونے والی ہے، نہ انھیں یہاں رہنا ہے نہ ہی دنیا باقی رہنے والی ہے۔ جس طرح اپنے زوال کو کوئی روک نہیں سکتا اسی طرح دنیا کے زوال اور قیامت کے آنے کو بھی کوئی روک نہیں سکتا۔ اس آیت میں جہاں اللہ کی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ ہے وہاں قیامت کے آنے کی طرف بھی واضح اشارہ ہے۔

ارذل العمر:

سورۃ الحج میں جو ارذل العمر کا ذکر آیا ہے، اس کا ذکر سورۃ النحل میں بھی ہوا ہے:

﴿وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ۠﴾ [1]

"اور اللہ نے تمھیں پیدا کیا، پھر وہ تمھیں فوت کرتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے، تا کہ وہ جان لینے کے بعد کچھ نہ جانے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

﴿اَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ کے معنی نکمی، حقیر اور ذلیل عمر کے ہیں۔ اس عمر میں ایک عالم بھی (معاذ اللہ) علم کھو بیٹھتا ہے۔ اس میں دراصل اللہ کی قدرت کا اظہار ہے کہ جس طرح وہ زندہ کرنے اور مارنے پر قادر ہے۔ اسی طرح شہ زور کو ناتواں بنانے اور عالم کو علم سے محروم کر دینے پر بھی قادر ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو حسب ذیل کلمات ایسے سکھاتے تھے جیسے

---

[1] النحل:70

استاد بچوں کو لکھنا سکھاتا ہے۔اور فرماتے تھے رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے تھے:

((اللهم إني أعوذبك من الجبن، وأعوذبك أن أرد إلى أرذل العمر، وأعوذبك من فتنة الدنيا، وأعوذبك من عذاب القبر.))①

''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں بزدلی سے، اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ ذلیل عمر کی طرف لوٹایا جاؤں، اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں دنیا کے فتنے سے اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں عذابِ قبر سے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''ارذل العمر'' کی بجائے ''الھــــرم'' ہے یعنی بڑھاپا۔ ② اور بعض الفاظ کا اضافہ بھی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

((اغتنم خمسا قبل خمس: شبابك قبل هرمك، وصحتك قبل سقمك، وغناك قبل فقرك، وفراغك قبل شغلك، وحياتك قبل موتك.)) ③

''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے، صحت وتندرستی کو بیماری سے پہلے، خوشحالی کو فقیری سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''75

---

① بخاري: 2877

② بخاري: 2723

③ حاكم: 4/306، الترغيب: 4/251

سال کی عمر ارذل عمر ہے۔ اس میں ضعفِ اعصاب اور سوءِ حفظ کے عوارض شروع ہو جاتے ہیں۔ ①

یہاں ''ارذل عمر'' کے حوالے سے یہ بات یاد رہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اس قسم کے عوارض سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر وہی ان کا شکار ہو جائیں تو راہبری وراہنمائی کا فریضہ کیونکر ادا ہو سکے گا؟ اس لیے اللہ تعالی نے ان عوارض سے انھیں محفوظ رکھا ہے۔ اسی طرح اہل علم وفضل بھی اکثر وبیشتر اس سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ امام عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«من قرأ القرآن لم يرد إلى أرذل العمر.» ②

''جو قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کرتا ہے وہ ارذل عمر کو نہیں پہنچتا۔''

عبدالملک بن عمیر بھی فرماتے ہیں:

«إن أبقى الناس عقولا قُرّاء القرآن.» ③

''لوگوں میں زیادہ دیر تک عقل رکھنے والے وہ ہوتے جو تلاوت قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔''

اسی طرح امام طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«إن العالم لا يخرف.» ④

''عالم بڑھاپے کی وجہ سے فاسد العقل نہیں ہوتا۔''

زر بن حبیش رحمہ اللہ کی عمر 127 سال تھی، معرور بن سوید رحمہ اللہ کی 120، ابوعثمان نھدی رحمہ اللہ کی 130 اور سوید بن غفلہ رحمہ اللہ 120 سال میں نماز تراویح پڑھاتے تھے۔

قاضی ابوالطیب طبری کی عمر ایک سو سال سے زائد تھی تو کسی نے ان کی صحت پر تعجب کا اظہار کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میری صحت کا راز یہ ہے:

---

① ابن كثير: 761/2 ② ابن أبي شيبة: 10/ 428

③ ابن ابي شيبة: 468/10 ④ ابن ابي شيبة: 53/14

«"ما عصيت الله بواحدة منها.»» ①

''میں نے اللہ کی کوئی نافرمانی نہیں کی۔''

بلکہ علامہ ابن جوزیؒ نے تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ذکر کیا ہے:

«"ليس هذا في المسلمين المسلم لا يزداد في طول العمر والبقاء إلا يزداد كرامة عند الله وعقلا ومعرفة.»» ②

''ارذل العمر کے عوارضات مسلمانوں میں نہیں ہوتے، مسلمان کی جس قدر عمر بڑھتی ہے اللہ کے ہاں اس کی عزت وکرامت بڑھتی ہے عقل ومعرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔''

لیکن یہ سارے اقوال اکثری واغلبی ہیں۔ محدثین کرام کی ایک جماعت ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے اختلاط کا شکار ہوئی، مثلاً: امام عطاء بن السائب، امام سعید بن ایاس البصری الجریری، امام سعید بن ابی عروبہ، امام حصین بن عبدالرحمٰن السلمی، امام محمد بن فضیل، ابوالنعمان عارم، امام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عقبہ المسعودی، امام حسین بن علی بن محمد البروعی السمرقندی، امام محمد بن الفضل ابوطاہر، امام ابواحمد محمد بن احمد بن الحسین الغطریفی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ جیسے اساطینِ علم اس عارضہ کے شکار ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے "روي" سے نقل کیا ہے۔ کوشش کے باوجود اس کا ماخذ نہیں ملا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی الدر المنثور میں اسے ذکر نہیں کیا۔

اہل علم وفضل کا وقار اور عزت بلاشبہ بڑی عمر میں بڑھ جاتی ہے اور ان کی قدردانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اختلاط وفساد عقل کا عارضہ بہر حال خوف ناک ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارذل العمر سے ہمیشہ اللہ کی پناہ طلب کی ہے۔ جہاں تلک پیرانہ سالی میں ضعف

---

① السير: 670/17

② زاد المسير: 4 / 468 تحت آية النحل: 70

اور کمزوری کا معاملہ ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے جس سے انبیائے کرام بھی محفوظ نہیں ہوتے۔ علامہ محمد یوسف شامی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گرمی، سردی، بھوک، پیاس، تھکن، ضعف و بڑھاپے سے دوچار ہوئے، آپ ﷺ زخمی بھی ہوئے اور بیماری سے بھی سامنا ہوا۔ ①

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آپ تیرہ رکعت وتر پڑھتے تھے "فلما کبر و ضعف أوتر بسبع" جب بوڑھے اور کمزور ہو گئے تو وتر سات رکعت پڑھتے تھے۔ ②

یہی روایت صحیح مسلم ③ میں "فلما أسن" کے الفاظ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ بڑی عمر کے ہو گئے تو وتر سات پڑھتے تھے۔ علامہ علی قاریؒ نے فرمایا ہے: یہاں بالوں کی سفیدی مراد نہیں بلکہ مراد "آثار الضعف" ہیں، بال تو چند گنتی کے سفید ہوئے تھے۔ ④

رسول اللہ ﷺ دو سجدوں کے بعد جلسہ استراحت کر کے اٹھتے تھے۔ علمائے احناف اس کے قائل نہیں، وہ فرماتے ہیں: یہ جلسہ بڑھاپے کی وجہ سے تھا۔ ⑤

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری بیماری میں عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ مسواک لیے حاضر ہوئے: "فضعف النبي ﷺ عنه" نبی کریم ﷺ کمزوری کی بنا پر اسے چبا نہ سکے، میں نے چبا کے اسے نرم کیا، پھر آپ ﷺ نے مسواک کی۔ ⑥

لہٰذا بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ضعف ایک فطری عمل ہے جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ مگر "ارذل العمر" کا بالآخر جو نتیجہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا انبیائے کرام اس سے مستثنیٰ ہیں ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ جسے چاہے اس عارضہ سے محفوظ رکھتا ہے۔ قاضی عیاضؒ نے ذکر کیا

---

① سبل الهدى: 3/12 ② ترمذي مع التحفة: 1/ 337 وغيره
③ مسلم: 746 ④ تحفة الأحوذي
⑤ هداية مع الفتح: 1/ 217 ⑥ صحيح بخاري: 3100

ہے کہ شیخ ابراہیم بن محمد الحضرمیؒ (المتوفی 396ھ) وفات سے چھ ماہ پہلے فالج کا شکار ہو گئے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ سوائے لا الٰہ الا اللہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے کچھ بھی بول نہیں سکتے تھے۔ ①

علامہ سخاویؒ نے الضوء اللامع میں ذکر کیا ہے کہ شیخ برہان حلبی کو فالج ہوا تو وہ ہر چیز بھول گئے حتیٰ کہ سورۂ فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ پھر بچوں کی طرح آہستہ آہستہ باتیں یاد ہونے لگیں۔ ②

اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے جسے چاہے اس عارضہ میں مبتلا کر دے جسے چاہے اس میں مبتلا کر کے یادداشت بحال کر دے اور جسے چاہے اس سے محفوظ رکھے۔ وما ذلك علی الله بعزيز.

---

① ترتیب المدارک: 4 / 678

② الضوء اللامع1 / 144

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [یٰسٓ: 69]

''اور ہم نے نہ اسے شعر سکھایا ہے اور نہ وہ اس کے لائق ہے۔ وہ تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن کے سوا کچھ نہیں۔''

پہلی آیات میں توحید اور اس کے انکار پر منکرین کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے۔ اب یہاں رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے حوالے سے منکرین کے ایک دعویٰ کی تردید ہے۔ چنانچہ کفار رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو غیر مؤثر ثابت کرنے کے جو مختلف حیلے بہانے کرتے اور باتیں بناتے تھے ان میں ایک یہ بات بھی تھی کہ وہ آپ کو شاعر کہتے تھے۔ اس کلام کی اثر پذیری اس لیے نہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے بلکہ اس لیے ہے کہ یہ شاعرانہ کلام ہے، جس سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سرنگوں تھے۔ قرآن کے اس اعجاز کا ایک حل انھوں نے یہ نکالا کہ جیسے بڑے بڑے شعراء کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے، محمد ﷺ کے کلام میں بھی تاثیر ہے۔ اس لیے یہ شاعر ہیں، رسول نہیں۔ علامہ راغب نے فرمایا ہے: یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن اسلوبِ شعری سے مبرا ہے، اس حقیقت کو تو عجمی عوام بھی سمجھ سکتے ہیں، پھر فصحاءِ عرب کا کیا ذکر، بلکہ وہ آپ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب اور شاعر بمعنی کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو ''ادلة شعرية'' کہا جاتا ہے، اور مقولہ مشہور ہے کہ ''احسن الشعر اکذبه'' ''سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو''[1]۔ بلاشبہ شعر میں جس قدر مبالغہ آمیزی ہوتی ہے اتنا ہی وہ زیادہ مقبول ہوتا ہے، حتیٰ کہ اشعار میں شراب نوشی اور جنسی مواصلت کی حکایت ہوتی ہے۔ کسی اور کی کیا بات حافظ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ حضرت نعمان بن عدی بن نضلہ صحابی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے شہر بیسان کا گورنر مقرر کیا، وہ شاعر تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے شعروں میں کہا: کیا

---

[1] مفردات

حسینوں کو اطلاع نہیں ہوئی کہ ان کا محبوب یسان میں ہے، جہاں شیشے کے گلاسوں میں شراب کا دور چل رہا ہے۔ جب میں چاہتا ہوں گاؤں کی لڑکیاں مجھے گیت سناتی ہیں اور مجھے رقص و سرود مہیا کرتی ہیں۔ اللہ کرے امیر المؤمنین کو خبر نہ ہو، ورنہ وہ برا مانیں گے اور سخت سزا دیں گے۔ ہوا یوں کہ یہ اشعار حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئے۔ آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: مجھے اس سے تکلیف پہنچی ہے اور اسی وقت خط لکھ کر قاصد روانہ کیا جس میں تحریر فرمایا کہ تیرے اشعار سے مجھے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ میں تمھیں گورنری کے عہدے سے معزول کرتا ہوں۔ یہ خط ملتے ہی حضرت نعمان بن عدی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں مدینہ طیبہ پہنچے اور کہا: امیر المؤمنین واللہ! میں نے کبھی شراب نہیں پی، یہ محض شاعرانہ تخیل تھا جو زبان پر آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمھارے بارے میں میرا یہی گمان ہے مگر اللہ کی قسم تم کبھی بھی عامل مقرر نہیں ہو سکتے۔ ①

شعر گوئی میں کسی کی بے جا تعریف، مدح سرائی، کسی کی مذمت اور ہجو حتیٰ کہ غلو میں عابد و معبود کا فرق بھی مٹا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا۔ آزاد فکری میں دین اور دینی قدروں کے استہزاء میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ بریلوی مکتب فکر کے اعلیٰ حضرت مجدد بریلو یہ کہتے ہیں:

جس نے ٹکڑے کیے ہیں قمر کے
وہ ہے نورِ وحدت کا ٹکڑا، ہمارا نبی ②

صرف اشعار ہی میں اس عقیدہ کا اظہار نہیں بلکہ نثر میں بھی ملاحظہ فرمائیں:

”حضور پر نور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم بلا شبہ اللہ کے نورِ ذاتی سے پیدا ہیں۔“ ③

خواجہ یار محمد دیوان محمدی الموسوم بہ ”انوارِ فرید“ میں کہتے ہیں:

خدا کہتے ہیں جس کو مصطفیٰ معلوم ہوتا ہے
جسے کہتے ہیں بندہ خود خدا معلوم ہوتا ہے ④

---

① تفسیر ابن کثیر: 3/471 ② حدائق بخشش 1/61
③ صلاۃ الصفاء عن نور المصطفی: ص 15 نیز ص 16 ④ انوار فرید: ص 101

بجاتے تھے جو اِنّــــی عَبْــــدُہ' کی بنسری ہر دم
خدا کے عرش پر اِنّــی اَنَــا اللّٰـہُ بن کر نکلیں گے ①

رسول اللہ ﷺ کو ''اللہ'' ہی بنادینے کی بڑی یاوا گوئی کی گئی حتی کہ یوں بھی کہا گیا:

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے؟
جو کچھ ہمیں لینا ہے ، لے لیں گے محمدؐ سے

یہ صورت صرف رسول اللہ ﷺ سے مختص نہیں، حضرت علیؓ، شیخ معین الدین چشتی، شیخ فرید، شیخ عبدالقادر جیلانی اور دیگر اولیائے کرام کے بارے میں بھی یہی تصور ہے اور ان سے ہر مشکل میں استغاثہ معمول کا مشغلہ ہے۔ ہمارے فیصل آباد کے جھنگ بازار میں لسوڑی شاہ کا دربار ہے جس کی قبر کی دہلیز پر یہ اشعار رقم ہیں:

بنا زمین پہ عرشِ بریں کی ڈالی ہے
لسوڑی شاہ کا یہ دربارِ عالی ہے
ہے ''اسم'' اور ''جسم'' کے پردے میں عین ذاتِ خدا
دلوں کا نور ہے ، دونوں جہاں کا والی ہے
اولیاء اللہ،اللہ اولیاء، ہیچ فرقے درمیان نبود روا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حوالے سے ، اس قسم کی خرافات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ روافض کے نزدیک حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور ان کے اماموں کا جو درجہ ہے اس کی داستان بھی طویل ہے۔ بیت اللہ کی بجائے قبور صالحین کا حج اور ان کے گرد طواف کا مشاہدہ آنکھوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں خرافیوں کے اشعار بھی معروف ہیں۔ دوزخ کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک نے کہا تھا:

اے شیخ !ڈراتا ہے تو جنھیں آتشِ دوزخ سے
پی جاتے ہیں وہ آگ کو پانی کر کے

ایک اور صاحب کہتے ہیں:

---

① انوار فرید: ص 103

اک فرصت گناہ ملی ، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

غالبؔ نے جنت کے بارے میں کہہ دیا تھا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

علامہ اقبال کو دیکھیے، کہتے ہیں:

فارغ نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

احمد فراز، جسے اردو ادب کا چیئر مین بنایا گیا تھا، اس کی جسارت دیکھیے:

ان رسولوں کی کتابیں طاق میں رکھ دو فرازؔ
نفرتوں کے یہ صحیفے عمر بھر دیکھے گا کون

ایسی خرافات بکنے والوں کے متعلق ہی تو ایک دل جلے نے کہا تھا:

گناہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اس قبیل کے شعراء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ﴾ ① بے شک وہ ہر وادی میں سر مارتے (بھٹکتے) پھرتے ہیں۔ شعراء کی یہ خرافات اور کذب بیانیاں بجا مگر علامہ راغب کا فرمانا کہ وہ آپ کو شاعر اس لیے کہتے تھے کہ وہ معاذ اللہ آپ پر جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے محل نظر ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ'' ② کہ بے شک وہ تجھے نہیں جھٹلاتے۔ آپ ﷺ کو تو وہ صادق اور امین تسلیم کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہنم کے بارے میں جو کچھ ذکر فرمایا ہے اور قرآن مجید میں جو اس کی تفصیل ہے کہ اس میں زقوم (تھوہر) کا

---

① الشعراء: 225 ② الانعام: 33

درخت ہوگا، جہنمیوں کولہو اور پیپ پینے کے لیے ملے گی۔ کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو اُن کی انتڑیوں کوٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اسی طرح جنت کے بارے میں، اس کی وسعت، اور اس کی نعمتوں کو شاعرانہ مبالغہ سمجھتے ہوئے آپ ﷺ کو شاعر کہتے ہوں۔ کفارِ مکہ قرآن مجید کے قصص پر بھی معترض تھے کہ یہ پرانے قصے اور کہانیاں ہیں۔ شعراء چونکہ اپنے اشعار میں قصہ گوئی بھی کرتے ہیں، ممکن ہے اس مناسبت سے وہ آپ کو شاعر کہتے ہوں۔ یا قرآن مجید میں جو صوتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جیسے سورہ الرحمٰن میں ہے یا سورۃ الکوثر اور بعض دیگر سورتوں میں، اسے بھی وہ کلام مقفی سمجھتے ہوں، جس کی بنا پر آپ ﷺ کو شاعر سمجھتے ہوں۔ ان کا یہ اعتراض قرآن مجید میں ایک جگہ یوں بیان ہوا ہے:

﴿وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ﴾ ①

”اور کہتے تھے کہ کیا واقعی ہم یقیناً اپنے معبودوں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر چھوڑ دینے والے ہیں۔“

ان کا یہ اعتراض سورۃ الانبیاء: ② اور سورۃ الطور ③ میں بھی ذکر ہوا ہے، اسی اعتراض کا یہاں جواب ہے کہ ہم نے تو انھیں شعر و شاعری کی تعلیم ہی نہیں دی۔

اشعار کے باقاعدہ اوزان ہیں اور وہ ردیف اور قافیہ کی مناسبت سے کہے جاتے ہیں، چند اشعار زبان پر آجانے سے کوئی شاعر نہیں بن جاتا، مناسب اور موزون کلام پر بھی اشعار کا اطلاق نہیں ہوتا، جنگ کے موقع پر دشمن کے مقابلے میں کہے گئے کلام موزون کو رجز کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ سے بھی بعض مواقع پر ایسا موزون کلام ثابت ہے۔ مثلاً غزوہ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ خندق کھودتے ہوئے حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی انصاری کا رجزیہ کلام پڑھتے تھے:

اللھم لولا انت ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

---

① الصفت:36 ② الانبیاء:5

③ الطور:30

فانزلن السكينة علينا وثبت الاقدام ان لاقينا
ان الاولى قد بغوا علينا وان ارادوا فتنة ابينا ①

اے اللہ! اگر آپ نہ ہوتے تو ہم ہدایت نہ پاتے، اور نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ سو ہم پر سکینت نازل فرما۔ اور اگر کافروں سے ہمارا مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدم رکھ۔ بے شک انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ اگر وہ فتنہ کا ارادہ کریں تو ہم انکار کریں گے۔

آپؐ رجز کے آخری لفظ کو کچھ لمبا کر کے پڑھتے تھے۔ راوی حضرت براء بھی اسے "یرتجز بکلمات ابن رواحة" سے تعبیر کرتے ہیں کہ آپ ابن رواحہ کے کلمات رجز سے پڑھتے تھے۔ اسی طرح جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور اپنی مسجد مبارک کی بنیاد رکھی تو آپ فرما رہے تھے:

اللهم لا خير الا خير الاخرة فاغفر للانصار والمهاجرة ②

اے اللہ! آخرت کے علاوہ کوئی خیر نہیں۔ پس آپ انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔

صحابہ کرام جو سب سے زیادہ آپ سے واقف اور سفر و حضر کے ساتھی تھے، وہ بھی جانتے تھے کہ آپ کو شعر و شاعری سے کوئی شغف نہیں، بلکہ دورانِ گفتگو اگر کسی شاعر کا اچھا شعر زبان مبارک پر آ جاتا تو اسے غیر موزوں پڑھ جاتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؐ کسی چیز کی مثال شعر سے دیتے تھے، تو انھوں نے فرمایا: صرف طرفہ بن العبد البکری کا یہ شعر تھا۔

ستبدى لك الايام ما كنت جاهلا ويأتيك بالأخبار من لم تزود

عنقریب زمانہ تم پر ایسی چیزیں ظاہر کرے گا جن سے تو بے خبر ہے، اور تمھارے پاس ایسی خبریں لائے گا جو تم نے سنی نہیں ہوں گی۔

---

① بخاری: 4106 ② بخاری: 428

مگر رسول اللہ ﷺ نے آخری مصرع یوں پڑھا: ویأتیك من لم تزود بالأخبار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جناب یہ اس طرح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انی لست بشاعر ولا ینبغی لی : میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شاعری میرے شایان شان ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہے کہ شعر سے بڑھ کر آپ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ آپ کبھی کبھار بنو قیس کے شاعر کا شعر پڑھتے تھے مگر اوّل کو آخر اور آخر کو اوّل پڑھ جاتے تھے۔ ابوبکرؓ عرض کرتے یا رسول اللہ ﷺ! شعر یوں نہیں بلکہ یوں ہے تو آپؐ فرماتے: انّی واللّٰہ ما انا بشاعر ولا ینبغی لی میں شاعر نہیں ہوں، نہ شعر گوئی میرے لائق ہے۔ ①

مسند امام احمد وغیرہ میں اسی طرح مذکورہ بالا شعر کی نسبت طرفہ کی طرف ہے جب کہ ترمذی ② میں اس کی نسبت عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف ہے۔ شارح ترمذی محدث مبارک پوریؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت ابن رواحہ کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے۔ یہ دراصل طرفہ ہی کا شعر ہے جیسا کہ اس کے معلقہ میں ہے۔ ③

کفارِ مکہ اپنے حلقۂ احباب کو مطمئن کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو شاعر اور کاہن کہہ کر دل کا غبار کم کر لیتے تھے، مگر خود اُن کے ایک سردار ابوالولید عتبہ بن ربیعہ کی گواہی ان کے بالکل برعکس ہے، چنانچہ ایک روز وہ کفار کے مشورے سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: بھتیجے! ہماری قوم میں تمھارا جو مرتبہ ہے اور جو بلند پایہ نسب ہے وہ تمھیں معلوم ہے اور اب تم اپنی قوم میں ایسی دعوت لے کر آئے ہو جس کی وجہ سے تم نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے، ان کے معبودوں اور ان کے دین پر نقطہ چینی کرتے ہو، ان کے آباء واَجداد کو کافر کہتے ہو۔ میری بات سنو، میں تمھارے سامنے چند تجویزیں پیش کرتا ہوں، ان پر

---

① ابن کثیر: 764/3 ② ترمذی: 2848

③ تحفۃ الاحوذی: 33/4

غور کرو، ہوسکتا ہے تم کوئی بات قبول کرلو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابوالولید! کہو، میں سنوں گا۔'' ابوالولید نے کہا: بھتیجے! یہ معاملہ جسے تم لے کر آئے ہو اگر اس سے تم یہ چاہتے ہو کہ مال حاصل کرو تو ہم تمھارے لیے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ گے۔ اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اعزاز و مرتبہ حاصل کرو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں یہاں تک کہ تمھارے بغیر کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کریں گے۔ اور اگر تم چاہتے ہو کہ بادشاہ بن جاؤ تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تمھارے پاس جن بھوت آتا ہے جسے تم دیکھتے ہو لیکن اپنے آپ سے اسے دور نہیں کر سکتے تو ہم تمھارے لیے اس کا علاج تلاش کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اپنا اتنا مال خرچ کرنے کو تیار ہیں کہ تم شفایاب ہو جاؤ۔

عتبہ بن ربیعہ یہ باتیں کر رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ سن رہے تھے۔ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو آپ نے فرمایا: ''ابوالولید! جو کہنا تھا کہہ لیا؟'' اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب میری بات سنو۔'' اس نے کہا: ہاں، سنوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾ ①

رسول اللہ ﷺ آگے پڑھتے جا رہے تھے اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے ہوئے خاموشی سے سنتا جا رہا تھا۔ جب آپ ﷺ سجدے کی آیت پر پہنچے تو آپ ﷺ نے سجدہ کیا، پھر فرمایا: ''ابوالولید! تمھیں جو کچھ سننا تھا سن چکے، اب تم جانو اور تمھارا کام۔''

عتبہ بن ربیعہ وہاں سے اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ مشرکین نے اسے آتا ہوا دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا: اللہ کی قسم! ابوالولید جو چہرا لے کر گیا تھا وہ چہرا لے کر نہیں آ رہا۔

---

① حٰمٓ السجدۃ: 1-3

ابوالولید جب آ کر بیٹھ گیا تو مشرکین نے پوچھا: ابوالولید کیا خبر لے کر آئے ہو؟ اس نے کہا: خبر یہ ہے کہ:

«إني سمعت قولا واللہ ما سمعت مثله قط، واللہ ما هو بالسحر ولا بالشعر ولا بالكهانة.»

''میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اللہ کی قسم اس جیسا کلام کبھی نہیں سنا۔ اللہ کی قسم! نہ وہ جادو ہے، نہ شعر ہے، نہ کہانت ہے۔''

یہ روایت ابن ہشام، مسند ابی یعلی، حاکم، ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، دلائل النبوۃ للبیہقی اور تفسیر بغوی میں معمولی اختلاف کے ساتھ منقول ہے اور سیرت و تاریخ کی کتابوں اور سورۂ فصلت کی تفسیر میں بھی اس کا ذکر ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ کفار یہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ شاعر وغیرہ نہیں تھے۔

اسی طرح صحیح مسلم میں باب من فضائل أبي ذر رضی اللہ عنہ کے تحت امام مسلمؒ نے ایک طویل روایت ذکر کی ہے جس میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بھائی اُنَیسؓ کا بیان ہے کہ میں مکہ میں گیا اور رسول اللہ ﷺ سے ملا، لوگوں کا ان کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ شاعر، کاہن اور جادوگر ہیں۔ اُنَیسؓ کا شمار شعراء میں ہوتا تھا، وہ کہتے ہیں:

«لقد سمعت قول الكهنة فما هو بقولهم، ولقد وضعت قوله على أقراء الشعر فما يلتئم على لسان أحد بعدي أنه شعر، واللہ إنه لصادق وإنهم لكاذبون.» ①

''بے شک میں نے کاہنوں کا قول سنا ہے ان کا قول کاہنوں جیسا نہیں ہے۔ میں نے ان کا قول ماہر شعراء کے سامنے پیش کیا، میرے ساتھ دوسروں میں سے بھی کسی کی زبان پر یہ نہیں کہ یہ شعر ہے۔ اللہ کی قسم! وہ سچے ہیں اور کفار جھوٹ

---

① صحیح مسلم: 6359

بولتے ہیں۔‘‘

اُنَیسؓ، جن کا شمار شعراء میں ہوتا تھا، ان کا یہ بیان بھی دلیل ہے کہ آپ ﷺ شاعر نہیں تھے۔

قرآنِ مجید میں صوتی ہم آہنگی یا کسی کلام کا کبھی وزن کے مطابق ہونا اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ شعر ہے۔ علامہ ابن العربی نے قرآنِ مجید کی ایسی بہت سی آیات کا ذکر کیا ہے جن میں صوتی موافقت پائی جاتی ہے، پھر وضاحت فرمائی ہے کہ یہ وزن کے مطابق نہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا غزوۂ حنین کے موقع پر فرمانا:

أنا النبي لا كذب　　　أنا ابن عبدالمطلب [1]

’’میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔‘‘

علامہ ابن العربی نے کہا ہے کہ ’’کــذب‘‘ میں دراصل ’’ب‘‘ مرفوع ہے اور ’’عبدالمطلب‘‘ میں ’’د‘‘ اضافت کی وجہ سے مکسور ہے، یوں یہ کلام وزنِ شعر پر نہیں ہے۔

یہ اور اسی نوعیت کا دیگر کلام جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، گو ان کی علماء نے توجیہ کی ہے اور اسے شعر قرار نہیں دیا لیکن اس قسم کے گنتی کے کلام کی بنیاد پر آپ ﷺ کو شاعر قرار دینا ہی صحیح نہیں کیونکہ کسی کی زبان سے محض کلام موزون کا ادا ہو جانا اس کے شاعر ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جو کلام موزون شعر کے قصد و ارادے سے کہا جائے وہی شعر ہے اور اس کا قائل شاعر ہے۔ ایک دو روٹی پکانے والا نہ ’’خباز‘‘ کہلاتا ہے اور نہ ہی ایک آدھ قمیص سینے والا درزی کہلاتا ہے۔

شیخ اسماعیل حقی حنفی (متوفی 1137ھ) نے یہ ’’درفشانی‘‘ فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو نظم و شعر پر قدرت تھی مگر قدرت فعل کو مستلزم نہیں ہوتی۔ جب آپ ﷺ کو اچھے

---

[1] صحيح بخاري: 4317 وغيره

اور بُرے شعر میں موزون اور غیر موزون کلام میں تمیز حاصل تھی تو احکام شرعیہ کو نظم و نثر میں بیان کرنے پر قدرت کیوں نہیں ہوگی۔ ①

مگر یہ بات نصِ صریح کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا: ہم نے انھیں شعر کی تعلیم نہیں دی بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے شایانِ شان ہی نہیں۔ نہ تو فطرتاً آپ ﷺ شاعر تھے اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے تھے، جیسا علامہ راغبؒ نے مفردات میں "بـغـی" کے مادہ کے تحت کہا ہے۔ پہلے باحوالہ گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے شعراء کے بعض اشعار وزن کے خلاف پڑھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ شعر دراصل یوں ہے، جس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((إني والله ما أنا بشاعر وما ينبغي لي.))

"اللہ کی قسم! میں شاعر نہیں اور نہ یہ (شعر گوئی) میرے مناسب ہے۔"

جس کا علم ہی اللہ تعالیٰ نے نہ دیا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا ہو کہ میں شاعر نہیں، اللہ تعالیٰ نے اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہو کہ شعر گوئی میرے شایانِ شان نہیں اور واقعاتی شہادتیں بھی اس کے مطابق ہوں تو اس کے باوجود یہ کہنا کہ آپ ﷺ کو شعر کہنے کی قدرت تھی مگر آپ ﷺ شعر کہتے نہیں تھے، محض خرانی ذہن کی عکاسی ہے۔ آپ ﷺ سے شعر و شاعری کی نفی بہ طورِ نقص اور عیب کے نہیں بلکہ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے فرمایا:

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ﴾ ②

"اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔"

اس آیت کے مطابق آپ ﷺ کا کتاب نہ پڑھ سکنا عیب تھا اور نہ ہی نہ لکھ سکنا

---

① روح البیان:4/506 ملخصاً ② العنکبوت:48

عیب اور نقص تھا۔ اور نہ ہی یہاں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پڑھنے لکھنے کی قدرت تو رکھتے تھے مگر آپ ﷺ نے کتاب پڑھی نہیں اور نہ ہی کوئی مکتوب لکھا۔

علامہ قرطبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ مامون کے دربار میں ابو علی المنقری حاضر ہوا تو مامون نے کہا: تُو صحیح شعر نہیں کہہ سکتا، تیرے کلام میں لحن ہے اور معلوم ہوا ہے کہ تُو اُمّی ہے، یعنی کچھ لکھ نہیں سکتا۔ ابو علی نے کہا: بعض اوقات کلام میں غلطی و لحن سبقتِ لسانی کا نتیجہ ہے۔ رہا اُمّی ہونا اور شعر نہ کہہ سکنا تو رسول اللہ ﷺ بھی لکھنا نہیں جانتے تھے اور نہ صحیح طور پر شعر کہہ سکتے تھے۔ مامون نے کہا: میں نے تجھ سے تیرے تین عیوب کے بارے میں سوال کیا تھا، تُو نے اس کے جواب میں اپنے اندر ایک چوتھے عیب کا اضافہ کیا ہے اور وہ ہے تیری جہالت۔ اے جاہل! رسول اللہ ﷺ کا نہ لکھنا اور شعر نہ کہنا نقص نہیں فضیلت ہے اور یہ تیرے لیے نقص اور عیب ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ شعر و شاعری آپ ﷺ کے مناسب حال نہیں تو یہ اس لیے کہ:

««فيظن أنه قوي على القرآن بما في طبعه من القوة على الشعر.»» ①

''یہ خیال کیا جائے گا کہ آپ ﷺ شعر گوئی پر قدرت رکھنے کی وجہ سے قرآن سازی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔''

اسی طرح علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے:

««وإنما لم يعط ﷺ القدرة على الشعر.»» ②

''رسول اللہ ﷺ کو شعر کہنے پر قدرت نہیں دی گئی تھی۔''

انھوں نے مزید فرمایا ہے کہ ''المواهب اللدنيه'' میں ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں

---

① تفسير قرطبي: 55/15 ② روح المعاني: 44/23

کہ رسول اللہ ﷺ کو شعر کہنے کی قدرت تھی مگر آپ ﷺ کو شعر کہنے کی ممانعت تھی۔ مگر یہ بات کچھ حیثیت نہیں رکھتی، البتہ اتنی بات درست ہے کہ آپ ﷺ کو شعر کہنے کی ممانعت تھی، بلکہ علامہ قسطلانی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ لکھنا اور شعر کہنا آپؐ پر حرام تھا۔ اور ان کی بھی انھوں نے تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ آپؐ ایسا کر سکتے تھے مگر لکھتے اور شعر کہتے نہیں تھے۔ ①

یہاں یہ بات بھی پیشِ نگاہ رہے کہ نبوت کسبی یا سببی نہیں، یہ تمام تر اللہ تعالیٰ کی موہبت اور فیضان ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کو شعر کہنے کی قدرت تھی اور شعر کہنے کے اسباب و وسائل حاصل تھے اور جسے قدرت حاصل ہو ضروری نہیں کہ وہ شاعر بھی ہو۔ حالانکہ یہاں آپ ﷺ سے شعر کہنے کی نفی نہیں بلکہ شعر کی تعلیم دینے کی نفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ ②، نیز فرمایا: ﴿عَلَّمَهُ الْبَيَانَ﴾ ③ یہ قرآن کی تعلیم اور بیان کی تعلیم بغیر کسی سبب کے محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح فرمایا ہے: ﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ ④ اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر ہمیشہ سے بہت بڑا ہے۔

اس لیے آپ ﷺ کو جو بھی تعلیم دی گئی ہے یہ کسی سبب کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان کا نتیجہ ہے۔ اس لیے آپ ﷺ کو شعر و شاعری کی تعلیم نہیں دی تو یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے شایانِ شان ہی نہیں۔ شعر و شاعری میں عموماً لہو و لعب کا عنصر اور شاعری کے قواعد و ضوابط اور اوزان شعری کی پابندی کا تکلف پایا جاتا ہے۔ اور یہ آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد نہیں، آپ ﷺ کی زندگی کا مقصد تو علم و حکمت سے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ علم آپ ﷺ کو سکھایا ہی نہیں۔ اس سے اس دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ آپ ﷺ کو تمام علوم سکھائے گئے ہیں۔

---

① المواہب مع الزرقانی: 221/5 ② الرحمن:4

③ الرحمن:4 ④ النسآء:113

شعر کی ہی نفی کیوں؟

علامہ رازیؒ نے فرمایا ہے کہ کفارِ مکہ تو رسول اللہ ﷺ کو ساحر اور کاہن بھی کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں یہ تو نہیں فرمایا کہ ہم نے انھیں جادو اور کہانت کی تعلیم نہیں دی، صرف اتنا کیونکر فرمایا ہے کہ ہم نے انھیں شعر وشاعری کی تعلیم نہیں دی؟ امام صاحب فرماتے ہیں:

''یہ اس لیے کہ کاہن تو وہ آپ ﷺ کو اس لیے کہتے تھے کہ آپ ﷺ جو آیندہ کی خبر دیتے تھے وہ سچی ثابت ہوتی تھی اور جادوگر اس لیے کہتے تھے کہ آپ نے جو معجزات دکھلائے وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں تھے، جیسے: چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھروں کا کلام کرنا وغیرہ۔ اور شاعر اس لیے کہتے تھے کہ آپ ﷺ انھیں قرآن پڑھ کر سناتے تھے اور اس کی تاثیر کی بنا پر آپ ﷺ کو شاعر کہتے تھے۔ اور قرآن کو ہی چیلنج کے طور پر آپ ﷺ نے پیش کیا کہ اگر تمھیں اس کے بارے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا لاؤ۔ مگر یہ کبھی نہیں کہا کہ تم بھی درختوں کو بلا کر دکھلاؤ یا کوئی مستقبل کی خبر دو جو سچی ثابت ہو۔ اس لیے جب چیلنج قرآن کے بارے میں تھا اور وہ اسے شاعرانہ کلام سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی نفی کی کہ ہم نے اپنے نبی ﷺ کو شعر وشاعری کی تعلیم ہی نہیں دی۔''

شاعری نبوت کے لیے نامناسب کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ شاعری آپ ﷺ کی شان سے فروتر ہے۔ اس کی نبوت سے مناسبت نہیں۔ اس لیے کہ شاعری اکثر خیالی تک بندی اور تصوراتی طبع آزمائی پر مبنی ہوتی ہے جب کہ نبی تو دنیا و آخرت کے ٹھوس حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اگر کسی واقعہ کی حکایت بیان کرتا ہے تو اس میں عبرت و نصیحت کا پہلو ہوتا ہے، محض قصہ گوئی مقصود نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے خود شعراء کی تین خامیاں سورۃ الشعراء میں بیان فرمائی ہیں:

﴿وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ ٥ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَهِيْمُوْنَ ٥ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ٥﴾ ①

---

① الشعراء: 224-226

”اور شاعر لوگ، ان کے پیچھے گمراہ لوگ لگتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں۔ اور یہ کہ بے شک وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔“

اوّلاً: یہ اس دور کے عموماً شعراء کی حقیقت ہے کہ ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں جو بے حیائی کی تمام حدود پار کر جاتے ہیں۔ برعکس انبیائے کرام کے پیروکاروں کے کہ وہ اعلیٰ اخلاق و کردار کے پیکر ہوتے ہیں۔

ثانیاً: وہ ہر وادی میں منہ مارتے پھرتے ہیں۔ کسی کی مدح سرائی اور تعریف ہے تو کسی کی مذمت اور ہجو ہو رہی ہے۔ اگر کبھی کسی کو آسمان پر چڑھا دیا، تو کسی دوسرے موقع پر اسے تحت الثریٰ میں گرا دیا۔ کبھی کلام مومنانہ شان لیے ہوئے ہے تو کبھی رندانہ اور ملحدانہ اس کے برعکس نبیؑ کے کلام میں یکسانیت ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ مبنی برحقیقت ہی ہوتا ہے۔

ثالثاً: شاعر گفتار کا غازی ہوتا ہے کردار کا غازی نہیں ہوتا، علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ۔

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اس کے برعکس نبیؑ جو کہتا ہے سب سے پہلے اس پر خود عمل کرتا ہے اور کہتا ہے: ﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ ① یعنی کوئی تسلیم کرے نہ کرے، میں سب سے پہلے تسلیم کرتا ہوں۔

ایک سوال کا جواب:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعر نہ ہونا رسول اللہ ﷺ کا خاصا ہے یا تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ وہ شاعر نہیں تھے؟

اس بارے میں بعض حضرات تو عموم کے قائل ہیں اور بعض اسے صرف رسول اللہ ﷺ کا خاصا قرار دیتے ہیں کیونکہ آپ کا مرتبہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل و اعلیٰ ہے۔ قرآنِ مجید آپ ﷺ کے معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ ہے، اگر آپ ﷺ شاعر ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ جو خود اتنا اچھا شاعر ہو اس کا اپنی طرف سے ایسا معجزانہ کلام

---

① الانعام: 163

پیش کرنا کچھ بعید نہیں۔ یہ حضرات آپ ﷺ کا خاصا قرار دینے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کے ان اشعار کو ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے فرزند ہابیل کے قتل پر کہے تھے۔

تغیرت البلاد و من علیها
فوجه الأرض مغبر قبیح
تغیر کل ذي لون و طعم
و قل بشاشة الوجه الملیح

''شہروں میں اور ان میں بسنے والوں میں تبدیلی آ گئی ہے۔ زمین کا چہرہ بری طرح خاک آلود ہو گیا ہے۔ تمام رنگ اور ذائقے بدل گئے ہیں۔ اور روشن چہرے پر بشاشت کم پڑ گئی ہے۔''

مگر علامہ ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ ان اشعار کا حضرت آدم علیہ السلام کی طرف انتساب محلِ نظر ہے۔ انھوں نے اپنی لغت میں حزن وملال کا اظہار کیا ہوگا جسے کسی نے اشعار کا لبادہ اڑھا دیا ہے۔ ①

اسی طرح کہا گیا ہے کہ حضرت داود علیہ السلام کو زبور شعر کی شکل میں دی گئی تھی۔ مگر یہ بھی دوسرے انبیائے کرام کے لیے شاعر ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

اوّلاً: زبور کو معروف معنوں میں شعروں کی کتاب قرار دینا محلِ نظر ہے، اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثنا پر مشتمل مسجع کلام کہنا چاہیے۔ یہ کلام بھی اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا تھا، حضرت داود علیہ السلام کا کلام نہیں تھا۔ مسجع کلام کو سریلی آواز سے پڑھنے والا شاعر نہیں ہوتا بلکہ شعروں پر مشتمل کتاب کو پڑھنے والا بھی شاعر نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ زبور کی حیثیت تورات کے ضمیمے کی ہے جو مناجاتوں، دعاؤں اور نصیحتوں پر مشتمل تھی۔ اصل الاصول اور شریعت کا درجہ تورات کو ہی حاصل تھا، اس لیے یہی رائے زیادہ صحیح ہے کہ کوئی نبی شاعر نہیں ہوتا۔

---

① البدایۃ: 95,94/1

اس سے مرزا قادیانی کذاب کے دعویٰ نبوت کی بھی تردید ہو جاتی ہے، جو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عاشق مزاج شاعر تھا جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

پسندیدہ اشعار:

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے حوالے سے شعر و شاعری کی نفی کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ یہ علم اور ذوق شعر و شاعری بالکل ممنوع اور ناجائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جہاں جھوٹ، مبالغہ آمیزی، تشبیب اور عشق و عاشقی پر مبنی اشعار کے متعلق اور جس پر قرآن کی بجائے شعر و شاعری کا ہی غلبہ ہو اُس کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر کسی کا پیٹ پیپ سے بھر جائے تو وہ اِس سے بہتر ہے کہ اس کا پیٹ شعر سے بھر جائے۔ ① وہاں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

((إن من الشعر حكمة.)) ②

''کچھ شعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو حکمت و دانائی پر مبنی ہوتے ہیں۔''

جو اشعار اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، رسول اللہ ﷺ کی نعت، بشرطِ کہ وہ غلو پر مبنی نہ ہو اور آپ ﷺ کی حمایت اور دفاع میں ہوں، اسلام کے محاسن، اسلام کی عظمت اور نصرت، اعمالِ حسنہ اور محاسنِ اخلاق، مسلمانوں کی اصلاح اور خیر خواہی اور حقائق پر مبنی ہوں وہ سب جائز ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو قسم دے کر پوچھتے تھے کہ کیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے:

((اللّٰهم أيده بروح القدس.))

''اے اللہ! حسان کی روح القدس سے تائید فرما۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، میں نے سنا ہے۔ ③

---

① ترمذي: 2852

② صحيح بخاري: 6145 وغيره

③ صحيح بخاري: 6152 وغيره

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لبید شاعر کا سب سے سچا مصرع یہ ہے:

((ألا كل شيء ما خلا الله باطل.))

''اللہ کے علاوہ ہر شے فانی ہے۔''

اور فرمایا کاش! امیہ بن ابی صلت مسلمان ہو جاتا۔ ①

یہ امیہ عیسائی تھا، بعض نے یہودی کہا ہے۔ اس کے اشعار توحید اور قیامت کے بارے میں تھے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس کے شعر مومنانہ ہیں اور دل کافر ہے۔'' ②

ایک مرتبہ ایک صحابی نے اسی امیہ کے سو (۱۰۰) اشعار رسول اللہ ﷺ کو سنائے۔ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اشعار پڑھتے اور زمانہ جاہلیت کی باتیں بھی کرتے تھے۔ ③

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں منبر رکھواتے اور وہ ان کفار کی ہجو اور مذمت بیان کرتے جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں بدگوئی کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے:

''جب تک یہ میری مدافعت کرتے ہیں روح القدس ان کی تائید کرتے ہیں۔'' ④

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے آگے آگے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

---

① صحيح بخاري: 6148,3841 وغيره ② فتح الباری: 154,153/7

③ ایضاً: 540/10 ، ترمذی: 2850

④ ترمذي: 2846 وغيره

خَلُّوْا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيْلِهٖ

اَلْيَوْمَ نَضْرِبُكُمْ عَلٰی تَنْزِيْلِهٖ

ضَرْباً يُزِيْلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيْلِهٖ

وَيُذْهِلُ الْخَلِيْلَ عَنْ خَلِيْلِهٖ ①

''اے کفار کی اولاد! آپ ﷺ کا راستہ چھوڑ دو۔ آج ہم قرآنِ پاک کے حکم سے تم پر ایسی ضرب لگائیں گے جو کھوپڑی کو اس کی جگہ سے جدا کر دے گی۔ اور دوست کو اپنا دوست بھلا دے گی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم حرم میں رسول اللہ ﷺ کے آگے یہ شعر پڑھ رہے ہو! آپ ﷺ نے فرمایا:

''عمر! اسے نہ روکو، یہ شعر تیروں سے زیادہ اثر پذیر ہیں۔''

اس لیے ایسے اشعار ممنوع نہیں بلکہ محمود ہیں۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ﴾ یہ قرآن شاعر کا کلام نہیں، نہ اس میں شاعرانہ مبالغہ آرائی اور جھوٹ فریب کا کوئی عنصر ہے بلکہ یہ سراسر نصیحت اور یاددہانی ہے اور واضح صحیفۂ ہدایت ہے جو ساری انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، مجلس مشاعرہ سجانے کے لیے نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ②

''یہ تو جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں۔''

اسی لیے اس کی حفاظت کا ذمہ اس کے نازل کرنے والے نے لیا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ③

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت

---

① ترمذی: 2847 وغیرہ

② یوسف: 104 ③ الحجر: 9

کرنے والے ہیں۔"

قرآن صحیفۂ نصیحت بھی ہے اور صحیفۂ یاد دہانی بھی۔ یہ انبیائے کرام علیہم السلام کی تکذیب کرنے والوں کے انجام سے خبردار کرتا ہے جس میں نصیحت ہے کہ رسول ﷺ کی تکذیب سے بچو، ورنہ تمھارا بھی وہی انجام ہوگا جو پہلوں کا ہوا۔ اور ان واقعات کو یاد رکھو طاقِ نسیاں میں نہ پھینک دو۔ اس میں قیامت کے حساب وکتاب اور آفاقی وانفسی دلائلِ توحید کی یاد دہانی ہے۔ اس میں ان امور کی بھی یاد دہانی ہے جنھیں وہ بھول گئے تھے یا جنھیں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس میں اللہ کے عذاب سے بچنے کی نصیحتیں اور اسباب بھی بیان ہوئے ہیں اور دنیوی زندگی کو سنوارنے اور دنیا کو امن واَمان کا گہوارہ بنانے کی بھی نصیحتیں ہیں۔

جو انسان ان نصیحتوں سے سبق حاصل نہیں کرتا بلکہ شیطان اور اس کے چیلوں کے ہاتھوں کھلونا بنا رہتا ہے، کل قیامت کے روز وہ کفِ افسوس ملے گا اور کہے گا:

﴿يَاوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْاِنسَانِ خَذُوْلًا ﴾ ①

"ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔ بے شک اس نے تو مجھے نصیحت سے گمراہ کر دیا اس کے بعد کہ میرے پاس آئی اور شیطان ہمیشہ انسان کو چھوڑ جانے والا ہے۔"

یہ ﴿قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ﴾ "واضح قرآن" ہے جس میں دنیا کی زندگی اور آخرت کی صداقتوں کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں بیان ہے کہ کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا۔ زندگی کے ہر پہلو کے لیے اس میں واضح راہنمائی موجود ہے، جیسے فرمایا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ﴾ ②

---

① الفرقان: 29,28 ② النحل:89

"اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی اس حال میں کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے۔"

یہ وضاحت صریح الفاظ میں بھی ہے اور اشارات اور عمومات کے اعتبار سے بھی ہے۔

بعض اہم اور بنیادی مسائل جو بظاہر قرآنِ مجید میں نہیں، مثلاً: نماز کی تعدادِ رکعات، اوقات کی تعیین، زکاۃ کا نصاب یا حج کا طریقہ تو ان کی طرف اشارہ حسبِ ذیل آیت میں فرما دیا گیا ہے:

﴿وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ①

"اور رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔"

قرآنِ پاک کے اس بیان اور وضاحت کی طرف اشارہ یوں بھی ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ②

"اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ اُن کی طرف اُتارا گیا ہے۔"

حدیث میں جتنے مسائل ہیں وہ بھی من جانب اللہ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی آپ ﷺ کی اتباع کا حکم فرمایا ہے، بلکہ آپ کا ارشاد ہے: مَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا اَمَرَ اللّٰهُ بِهِ إِلَّا قَدْ اَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَا تَرَكْتُ شَيْئًا مِمَّا نَهَاكُمُ اللّٰهُ عَنْهُ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ" ③ جس کا اللہ نے تمھیں حکم فرمایا ہے اس میں کوئی چیز میں نے نہیں چھوڑی (جو تمھیں نہ بتلائی ہو) اور جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے اس میں سے بھی میں نے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔" سب کچھ تمھیں بتلا دیا ہے۔

اس لیے رسول اللہ ﷺ کے تمام اوامر و نواہی من جانب اللہ ہیں اور "قرآنِ مبین" کا بیان ہیں۔

اس "ذکر" میں اہل کتاب کو یاددہانی ہے جو ان کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے

---

① الحشر:7 ② النحل:44

③ مسند الشافعي: 673، بيهقي: 67/7 الصحيحة: 417/4

متعلق بشارتیں تھیں جنھیں وہ نظر انداز کر چکے اور اس توحید کی یاددہانی بھی ہے جس کی تلقین حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اور ان کی اولاد نے آگے اپنی اولاد کو کی ہے۔ اور ''مبین'' میں مشرکینِ مکہ اور اہل کتاب دونوں کو بتلایا ہے کہ یہ ''قرآنِ مبین'' اللہ کا نازل کیا ہوا ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے جیسے پہلے رسول بھیجے اور ان پر اپنی کتابیں اور صحائف نازل کیے اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ کے رسول ہیں اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔

﴿لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ○﴾ [يٰسٓ: 70]

''تاکہ اسے ڈرائے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر بات ثابت ہو جائے۔''

یہاں ﴿لِيُنْذِرَ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ آپ ﷺ شاعر نہیں، رسول ہیں۔ ان پر اس لیے ''قرآن مبین'' نازل کیا گیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کو ڈرائیں، جیسے فرمایا:

﴿وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ﴾ ①

''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمھیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔''

شروع سورت میں بھی بیان ہوا ہے کہ آپ ﷺ رسول ہیں، غالب اور رحیم ہستی نے آپ ﷺ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ قوم کو ڈرائیں، اور ڈرائیں اُسے ﴿مَنْ كَانَ حَيًّا﴾ ''جو زندہ ہے۔'' زندگی سے مراد یہاں حیاتِ عقلی اور حیاتِ قلبی دونوں ہیں، یعنی جن میں سوچنے سمجھنے کی بصیرت ہے۔ جن کے دل مردہ ہوں اور تکبر و عناد کی وجہ سے عقل و فکر میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہو انھیں آپ ﷺ کتنی ہی دردمندی اور جاں کاہی سے سمجھائیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو زندہ ہیں اور انذار کو قبول کرتے ہیں اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

دوسرے وہ جو مردہ ہیں وہ انذار قبول نہیں کرتے اور انھیں انذار کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ ان کے دل کی زمین بنجر ہے بلکہ پتھر بنی ہوئی ہے۔ جس طرح پتھر پر بارش کا کوئی

① الأنعام:19

اثر نہیں ہوتا اسی طرح ان کے دل پر قرآن کا کوئی اثر نہیں ہوتا:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ①

''پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔''

پتھر بھی اللہ کے جلال کی بنا پر خشیت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جیسا کہ کوہِ طور اللہ کی تجلی سے پاش پاش ہو گیا تھا۔

اللہ کے کلام پاک کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ②

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تُو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا۔''

مگر جس کا دل پتھر ہو گیا ہو اُس پر قرآن کی کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی۔ یہی مردہ دلوں کا حال ہے۔ اللہ کا رسول اِنذار تو تمام کو کرتا ہے اور اس کے مخاطب سبھی لوگ ہوتے ہیں مگر اس اِنذار کا فائدہ انھی کو پہنچتا ہے جن کے دل زندہ، نرم اور خیر و بھلائی کو قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اللہ کا ڈر اُن کے دلوں میں سمایا ہوا ہوتا ہے جیسا پہلے اسی سورۂ یٰسٓ میں

---

① البقرة:74 ② الحشر:21

بیان ہوا ہے:

﴿اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ ①

''تُو تو صرف اسی کو ڈراتا ہے جو نصیحت کی پیروی کرے اور رحمان سے بن دیکھے ڈرے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ○﴾ ②

''اور نصیحت کر کیونکہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔''

سورۂ قٓ میں بھی ہے:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ○﴾ ③

''سو قرآن کے ساتھ اس شخص کو نصیحت کر جو میرے عذاب کے وعدے سے ڈرتا ہے۔''

اور جو اِنذار کے باوجود قرآن سے کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے قرآنِ مجید میں انھیں مردہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے سورۂ فاطر ④ میں بیان ہوا ہے۔

﴿وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور اِنذار کا انکار کرنے والوں (کافروں) پر بات ثابت ہو جائے۔ گویا یہ عقوبت ان کے انکار کا نتیجہ ہے۔ اسی ''حق القول'' کا ذکر پہلے بھی ہوا ہے ⑤ کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان ہے جو شیطان کے جواب میں تھا:

﴿قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ○ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ○﴾ ⑥

''فرمایا حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور اُن سب لوگوں سے بھر دوں گا جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

---

① یٰسٓ:11 ② الذاریات:55 ③ قٓ:45

④ فاطر:23،22 ⑤ یٰسٓ:7 ⑥ صٓ:85،84

یہی بات ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمائی:

﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ ①

''اسی طرح ان لوگوں پر تیرے ربّ کی بات ثابت ہوگئی جنھوں نے کفر کیا کہ بے شک وہی آگ والے ہیں۔''

سورۃ الزمر میں بھی ہے کہ جب کافروں کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ ②

''کیا تمھارے پاس تم میں سے کچھ رسول نہیں آئے جو تم پر تمھارے رب کی آیات پڑھتے ہوں اور تمھیں تمھارے اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ کہیں گے: کیوں نہیں، اور لیکن عذاب کی بات کافروں پر ثابت ہوگئی۔''

جیسے کفار کے لیے عذاب ''حق'' اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اسی طرح ان کی گمراہی اور ایمان سے محرومی بھی ان کا ''حق'' اور مقدر ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ③

''اسی طرح تیرے ربّ کی بات ان لوگوں پر سچی ہوگئی جنھوں نے نافرمانی کی کہ بے شک وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

یعنی یہ چلتے پھرتے مردہ کفار انذار کو قبول نہ کرکے دولتِ ایمان سے بھی محروم رہیں گے اور عذابِ جہنم کے بھی مستحق بنیں گے۔

---

① غافر:6 ② الزمر:71 ③ یونس:33

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ○ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○﴾ [یٰسٓ: 71-73]

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان چیزوں میں سے جنھیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا ان کے لیے مویشی پیدا کیے، پھر وہ ان کے مالک ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور ان میں سے بعض کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان میں کئی فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔''

پہلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا بیان تھا اور کفار کے اس زعم فاسد کی تردید تھی کہ محمد ﷺ شاعر ہیں۔ اس کی تردید میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا گیا کہ ہم نے انھیں شعروشاعری کی تعلیم ہی نہیں دی اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے بلکہ یہ تو جو کچھ تمھیں سناتے ہیں وہ سراسر نصیحت اور قرآنِ مُبین ہے۔ ان کا مشن خبردار کرنا اور قیامت سے ڈرانا ہے، مشاعرے کی مجلس سجانا نہیں۔

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اللہ کی توحید کا بیان ہی رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا اصل مقصد ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ﴾ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے جو کچھ پیدا کیا اس میں سے ہم نے مویشی پیدا کیے۔ ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا﴾ یہ استفہام تقریری ہے جو کسی واضح حقیقت کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ اور کبھی ''ألم يعلموا'' ''کیا انھیں معلوم نہیں'' کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کوئی بھی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس کی

طرف متوجہ کرنا اور اس پر غور و تدبر کی دعوت بھی مطلوب ہے کہ جن چوپاؤں کو ہم نے پیدا کیا ہے انھیں عبث اور بے کار پیدا نہیں کیا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت کارفرما ہے۔ اور وہ کیوں غور نہیں کرتے کہ ان کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کا کوئی مفاد وابستہ نہیں بلکہ یہ سب انسانی فائدے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ صرف یہ چوپائے ہی نہیں بلکہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ ①

''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔''

چوپائے، مثلاً: گائے، بھینس، بھیڑ، بکری اور اونٹ ہی نہیں زمین سے پیدا ہونے والا اناج، پھل، میوے، ترکاریاں اور درخت وغیرہ سب انسانوں کے فائدے کے لیے ہیں۔

﴿مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا﴾ ''جو کچھ ہمارے ہاتھوں نے بنایا ان میں سے مویشی بھی ہیں۔''

''أنعام'' یہ ''نعم'' کی جمع ہے جو خاص طور سے اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اونٹوں کو ''نعم'' اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عرب کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے۔ ''أنعام'' کا لفظ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے پر بھی بولا جاتا ہے مگر ان جانوروں پر ''أنعام'' کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹ بھی ان میں شامل ہو۔ اور اس کا اطلاق (گھاس پھوس کھانے والے) تمام جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ ②

جب کہ ''دواب'' اور ''دابة'' کا لفظ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات اور حشرات الارض پر بولا جاتا ہے۔

﴿اَيْدِيْنَا﴾ کے معنی ''ہمارے ہاتھ'' ہیں مگر یہاں مراد اللہ کی قدرت وقوت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کی نگاہ جدھر اٹھتی ہے اور ہر سو جو مخلوق اسے نظر آتی ہے کیا وہ اسے

---

① البقرة:29 ② مفردات

دیکھتا نہیں اور اس پر غور و فکر نہیں کرتا کہ ان سب کو ہم نے ہی اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے۔ ان کے بنانے میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں۔ نہ ہی ان کے بنانے میں ہمارا کوئی شریک ہے، نہ ہی ان کو پیدا کرنے میں ہم نے کسی کو وکالت نامہ دیا ہے بلکہ یہ بس ہماری قدرت و حکمت کا نتیجہ ہے۔

"یــد" کا لفظ قرآنِ مجید میں مفرد، تثنیہ اور جمع تینوں اعتبار سے آیا ہے: ﴿بِیَدِهِ الْمُلْكُ﴾ ①، ﴿خَلَقْتُ بِیَدَیَّ﴾ ②، ﴿عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا﴾ ③

حافظ ابن قیم نے فرمایا ہے کہ جہاں کسی فعل کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہو، اور "یــد" کے ساتھ "باء" کا استعمال ہو، جب کہ وہ مفرد اور تثنیہ ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عمل مباشرۃً اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہاں مجازی معنی کا کوئی احتمال نہیں برعکس ﴿عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا﴾ کے کہ یہاں مجازی معنی مراد ہیں کہ ہم نے اسے اپنی قوت سے بنایا اور پیدا کیا ہے، جیسے ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ﴾ ④

"اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا۔"

یہاں ﴿اَیْدِیْكُمْ﴾ سے مراد صرف ہاتھوں کا کسب نہیں بلکہ وہ تمام عمل و کسب مراد ہیں جو اپنی قوت و طاقت سے کیے گئے ہوں۔ بلکہ علامہ راغبؒ نے لکھا ہے کہ "أیــد" سے مراد قوت ہے۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے:

﴿اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ﴾ ⑤

"جو قوت والے صاحبِ نظر تھے۔"

---

① الملك:1 ② صٓ:75 ③ یٰسٓ:72
④ الشوریٰ:30 ⑤ صٓ:45

اسی طرح فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ﴾ ①

''اور ہمارے بندے داود کو یاد کر جو قوت والا تھا۔''

اس لیے ﴿عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا﴾ سے مراد بھی یہی ہے کہ جسے ہم نے اپنی قوت وقدرت سے بنایا ہے۔ مگر جہاں ''ید'' واحد یا تثنیہ آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہی مراد ہے۔ متعدد احادیث میں اس کی صراحت آئی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

«أنت آدم الذي خلقك الله بيده.» ②

''آپ وہ آدم ہیں جنھیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔''

اور آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ موسیٰ ہیں، آپ کو اللہ نے اپنا ہم کلام بنایا:

«وخط لك بيده.» ③

''اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے تورات لکھی۔''

یہی روایت مختصراً صحیح بخاری کے علاوہ امام ابن خزیمہ کی کتاب التوحید ④ اور السنۃ لابن ابی عاصم ⑤ وغیرہ میں بھی ہے۔ ان دونوں نبیوں کے اس مکالمے کا ذکر دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیثِ شفاعت میں مروی ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے:

«أنت آدم أبو الخلق، خلقك الله بيده.» ⑥

''آپ آدم سارے انسانوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے

---

① صٓ:17 ② صحیح مسلم: 6744 وغیرہ

③ صحیح مسلم: 6742 ④ کتاب التوحید: 127/1

⑤ السنۃ لابن ابی عاصم: 153

⑥ صحیح مسلم: 322

بنایا ہے۔‘‘

بلکہ قرآنِ مجید میں بھی ہے:

﴿قَالَ يَا إِبْلِيسُ! مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ﴾ ①

’’فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تُو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا؟ کیا تُو بڑا بن گیا، یا تھا ہی اونچے لوگوں میں سے؟‘‘

اگر اس سے یہ مراد ہے جیسا کہ عموماً مؤولین نے کہا ہے، کہ میں نے اسے خود آپ بنفس نفیس بلا واسطہ بنایا ہے تو اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا کیا شرف ہے؟ ساری مخلوق کو اللہ ہی نے بنایا ہے۔ آدم کو مٹی سے اور دوسرے انسانوں کو پانی سے، ان کے بنانے میں بھی کسی کا کوئی عمل دخل نہیں۔

علامہ ابن ابی العز رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ کے یہ معنی صحیح نہیں کہ میں نے اسے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو ابلیس لعین بھی کہہ دیتا کہ مجھے بھی آپ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے، اس لیے آدم کو مجھ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر اس نے یوں نہیں کہا کیونکہ ابلیس کو اپنے کفر کے باوجود جہمیہ فرقے سے زیادہ اللہ کی معرفت تھی۔ ②

اللہ تعالیٰ کی صفت ’’ید‘‘ سے قطعاً یہ مراد بھی نہیں کہ انسان کے اعضاء و جوارح کی طرح یہ بھی (معاذ اللہ) اللہ کے اعضاء ہیں۔ بلکہ:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ ③

’’اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے۔‘‘

---

① صٓ:75 ② شرح العقيدة الطحاوية، ص:241 ③ الشورىٰ:11

جیسے وہ سمیع وبصیر ہے مگر انسان کی مثل سمیع وبصیر نہیں۔ جس طرح اس کی ذات بے مثال اور بے نظیر ہے اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ ان کو انسان کی صفات کی طرح سمجھنا سراسر ضلالت اور گمراہی ہے۔ یہی صحابہ کرام اور سلف کا موقف ہے جس کی تفصیل کتاب التوحید لابن خزیمہ، السنہ لابن ابی عاصم، السنہ لعبداللہ بن احمد، الاسماء والصفات، العقیدۃ الواسطیہ، الصواعق لابن قیم اور شرح العقیدۃ الطحاویۃ وغیرہ میں موجود ہے۔

﴿فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ﴾ ہم نے نفع بخش چیزوں کو پیدا کر کے انسانوں کو ان کا مالک بنا دیا، اب وہ ان میں ہر طرح کا مالکانہ تصرف کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو ان سے فائدہ حاصل کریں اور اپنی ضروریاتِ زندگی میں ان سے کام لیں اور اگر چاہیں تو فروخت کر کے ان کی قیمت حاصل کریں۔

عقل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو کسی چیز کو پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہے وہی اس کا مالک ہوتا ہے۔ یہ چوپائے جب اللہ نے بنائے ہیں تو حقیقی مالک بھی وہی ہے۔ اس نے انسانوں پر احسان کیا ہے کہ انھیں ان کی ملکیت میں دے دیا ہے۔

ان کا مالک بنانے کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ وہ ان سے جیسا چاہیں سلوک کریں۔ زمانہ جاہلیت میں جانوروں پر بھی غلاموں کی طرح بڑا ظلم ڈھایا جاتا۔ جانوروں کو باندھ کر نشانہ بازی کی جاتی تھی۔ زندہ اونٹ کی کوہان یا دنبے کی چکی یا کوئی اور حصہ کاٹ کر کھایا جاتا تھا۔ کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کو اس کی قبر کے پاس باندھ دیا جاتا اور وہ بھوکی پیاسی مرجاتی۔ اس قسم کے ظلم وستم سے اسلام نے منع کر دیا بلکہ حکم فرمایا کہ ان سے وہی کام لیے جائیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اونٹوں بلکہ تمام جانوروں کو باہم لڑانے سے منع کیا ہے۔ ①

---

① أبو داود: 2562

اسی طرح جانوروں کے منہ پر مارنے یا منہ پر داغ لگانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے بلکہ ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ ①

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا تو بیل نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا:

«لم أخلق لهذا، خلقت للحراثة.» ②

''میں اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا، میں کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم شادابی کے زمانے میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانے میں سفر کرو تو ان کو تیزی سے چلاؤ۔'' ③

گویا قحط اور خشک سالی کی وجہ سے اونٹوں کو گھاس یا چارہ نہ ملنے کی جو تکلیف ہوتی ہے اس سے وہ بچ سکیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، اللہ نے انھیں تمھارا فرمانبردار اس لیے بنایا ہے کہ وہ تمھیں ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشکل سے پہنچ سکتے ہو۔ ④

یعنی بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھنا یا بیل پر یوں بیٹھنا کہ اس سے اسے تکلیف پہنچے مناسب نہیں۔ یہ ان کا مصرف نہیں بلکہ ان کا مصرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا اور ان سے کام کاج میں معاونت لینا ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری

---

① أبو داود: 2563

② صحيح بخاري: 2324

③ صحيح مسلم: 4959

④ أبو داود: 2569

کے باغ میں ضرورت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس میں ایک اونٹ تھا، جیسے ہی اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا وہ آب دیدہ ہوگیا اور بلبلانے لگا۔ آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا: ''یہ کس کا اونٹ ہے؟'' انصاری نوجوان نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ میرا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَفَلَا تَتَّقِي اللّٰهَ فِي هٰذِهِ الْبَهِيمَةِ الَّتِي مَلَّكَكَ اللّٰهُ إِيَّاهَا؟ فَإِنَّه‘ شَكٰى إِلَيَّ أَنَّكَ تُجِيعُه‘ وَتُدْئِبُه‘.)) ①

''کیا تم اس اونٹ کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے جس کا مالک اللہ نے تمھیں بنایا ہے۔ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔''

جانوروں کے ساتھ شفقت ورحمت کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ آپ ﷺ نے (ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء) ② ''زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحمت کرے گا۔'' فرما کر جو سبق دیا ہے وہ صرف انسانوں کے بارے میں نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی اس میں داخل ہیں اور یہ بھی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ③ کی ایک تعبیر ہے۔

اس لیے ان چوپاؤں کا مالک بنانے کے یہ قطعاً معنی نہیں کہ ان سے جو چاہو اور جس طرح چاہو معاملہ کرو بلکہ انسانوں کی طرح ان کے بھی حقوق ہیں جن کی پاس داری ضروری ہے۔

﴿وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ﴾ ''اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا تو ان میں سے کچھ ان کی سواری ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں۔'' اس میں

---

① أبو داود: 2549 ② ترمذی: 1924
③ الأنبياء: 107

چوپاؤں کے حوالے سے مزید احسانات کا ذکر ہے کہ انسان کو چوپاؤں کا صرف مالک ہی نہیں بنایا بلکہ ان کو تابع فرمان اور مطیع بھی بنا دیا۔ مملوک اگر مطیع نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ایسی چیز کا مالک ہونا بھی کوئی باعثِ عزو شرف نہیں رہتا۔ انسان اونٹ جیسے بڑے جانور کو نکیل ڈال کر جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے، جب اشارہ کرتا ہے وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور جب اشارہ کرتا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ بلکہ ایک بچہ بھی اونٹ کی نکیل پکڑے اسے اپنے پیچھے لے چلتا ہے، پھر ایک اونٹ کیا متعدد اونٹوں کی قطار اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے بیلوں سے ہل چلواتا ہے اور دیگر بھاری کام لیتا ہے۔ یہ سب اللہ کی مہربانی سے ہے، ورنہ اونٹ کی ایک ٹانگ اور بیل کی ایک ٹکر جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔

عموماً یہ چوپائے مالک کی اطاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر کبھی کبھی وہ سرکشی پر بھی اُتر آتے ہیں تو اس کا سبب دراصل انسان کی اپنے مالک (اللہ ربّ العزت) کی سرکشی اور نافرمانی ہے جس میں جانور کی حق تلفی اور اس پر ظلم بھی شامل ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ بعض اللہ والوں نے فرمایا ہے:

««إني لأعصى الله فأرى ذلك في خُلق دابتي.»» ①

''میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے جانور کے طور اطوار میں دیکھ لیتا ہوں۔''

انسان اللہ کا اطاعت گزار بن جائے تو مویشی کیا وحشی جانور بھی اس کے سامنے اپنی وحشت سے رُک جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جو وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اس میں یہ بھی فرمایا:

(احفظ الله يحفظك.) ②

''اللہ کے حقوق کی حفاظت کرو، اللہ تمھاری حفاظت کرے گا۔''

---

① الداء والدواء، ص:74 ② ترمذي: 2516

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشتی ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایک جزیرے میں پہنچ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ شیر آ رہا ہے انھوں نے فرمایا: اے شیر! میں سفینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں۔ اس نے سر نیچے کر لیا۔ پھر ان کے ہم راہ ہو گیا اور راستے کی طرف لے چلا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگے تو شیر الوداعی نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ ①

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ علامہ دمیری نے ''حیاۃ الحیوان'' میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی ذکر کیا ہے۔ ②

یہ ایسے مطیع ہیں کہ جب چاہتے ہو انھیں ذبح کر کے کھا لیتے ہو۔ انسان کی طرح ہر جان دار اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے مگر یہ چوپائے ایسے ہیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی اولاد کو ذبح کر دیتے ہو تو وہ تب بھی دم نہیں مارتے۔ ان کے بارے میں ﴿ذَلَّلْنٰهَا﴾ کہہ کر گاؤ پرستی کی بھی جڑ کاٹ دی ہے کہ جنھیں اس قدر ان کا تابع بنا دیا ہے، کس قدر حماقت ہے کہ انسان انھی کی پرستش کرتا ہے!

﴿وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ﴾ اس کے علاوہ ان میں اور بھی کئی فائدے ہیں۔ گائے، بھینس، بکری، اونٹنی کا دودھ حاصل کیا جاتا۔ ان سے دہی، گھی، لسی اور طرح طرح کی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔ ان کی اون اور چمڑے سے لباس، جوتے، خیمے، ڈول، مشکیزے اور دیگر مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔

اس کا ذکر قرآنِ مجید میں یوں بھی ہوا ہے:

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝﴾ ③

''اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپاؤں میں یقیناً بڑی عبرت ہے، ہم ان چیزوں میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہیں گوبر اور خون کے درمیان سے تمھیں خالص دودھ

---

① الحاکم: 606/3، طبرانی: 6432 وغیرهما

② حیاۃ الحیوان: 7/1 ③ النحل: 66

پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے حلق سے آسانی سے اُتر جانے والا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مظاہرہ دیکھیے کہ چوپاؤں کا کھایا ہوا چارہ عملِ انہضام کے بعد گوبر اور خون کی صورت اختیار کرتا ہے، پھر ان دونوں کے درمیان سے ایک تیسری چیز دودھ کی صورت میں پیدا ہوتی ہے جس میں گوبر کی آمیزش تو کیا اس کی بُو بھی محسوس نہیں ہوتی، نہ خون کی رنگت کا کوئی نام ونشان ہوتا ہے۔ ایسا سفید وشفاف کہ اس کی سفیدی ضرب المثل بن چکی ہے۔

چوپاؤں میں دودھ کی افزائش کے علاوہ بھی بڑا عبرت کا سامان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چوپاؤں کا چارہ جب ہضم ہوتا ہے تو اس کا فضلہ نیچے ہوتا ہے جب کہ دودھ کی تہ اس کے اوپر ہوتی ہے اور خون اس کے اوپر ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جگر کے ذریعے خون اور دودھ کو علیحدہ علیحدہ مقامات میں تقسیم کر دیتے ہیں، خون رگوں میں جاری وساری ہو جاتا ہے، دودھ جانور کے تھنوں میں اور فضلہ گوبر کی شکل میں خارج ہو جاتا ہے۔ اور ان میں جس قدر زائد پانی ہوتا ہے وہ مثانے کے ذریعے خارج ہو جاتا ہے اور ان اشیاء کے مابین قطعاً ایک دوسرے کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ كَثِیْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ○﴾ ①

''اور بلاشبہ تمھارے لیے چوپاؤں میں یقیناً بڑی عبرت ہے، ہم تمھیں ان میں سے جو ان کے پیٹوں میں ہے، پلاتے ہیں اور تمھارے لیے ان میں بہت سے فائدے ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو اور انھی پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔''

ایک اور مقام پر ذرا تفصیل سے ارشاد فرمایا:

﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

---

① المؤمنون 23:21، 22۔

وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً وَّ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ﴾ ①

''اور چوپائے، اس نے انھیں پیدا کیا، تمھارے لیے ان میں گرمی حاصل کرنے کا سامان اور بہت سے فائدے ہیں اور انھی سے تم کھاتے ہو۔ اور تمھارے لیے ان میں ایک جمال ہے جب تم شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب صبح چرانے کو لے جاتے ہو۔ اور وہ تمھارے بوجھ اس شہر تک اٹھا کر لے جاتے ہیں جس میں تم کبھی پہنچنے والے نہ تھے مگر جانوں کی مشقت کے ساتھ، بے شک تمھارا رب یقیناً بہت نرمی کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔ اور گھوڑے اور خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے اور وہ پیدا کرے گا جو تم نہیں جانتے۔''

یہ سارے جانور صرف تمھارے فائدے کے لیے ہم نے پیدا کیے ہیں۔ بلکہ جو کچھ ہم نے پیدا کیا یا آئندہ جو کچھ پیدا کریں گے، وہ بس تمھارے لیے ہے، ہمارا کوئی مفاد ان سے وابستہ نہیں اور ''جو تم نہیں جانتے'' فرما کر گاڑی موٹر سائیکل، بحری اور ہوائی جہاز وغیرہ سب کی طرف اشارہ فرما دیا۔

﴿اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ﴾ جب حقیقتِ واقعی یہ ہے تو یہ لوگ شکر گزار کیوں نہیں بنتے۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورہ یٰسٓ میں پہلے گزر چکا ہے۔ چنانچہ زمین میں پیدا کی جانے والی اشیاء کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ﴾ ② یعنی یہ غلہ، کھجوریں، انگور وغیرہ سب ہم نے ان کے لیے پیدا کیے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار کیوں نہیں بنتے کہ ان نعمتوں سے مستفید ہوتے رہیں اور شکر کے بدلے مزید انعامات حاصل کرتے رہیں۔

ذکر و شکر دین کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① النحل:5-8 ② یٰسٓ 33-35

﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ﴾ ①

''سوتم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو۔''

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جو وصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اس میں فرمایا کہ ہر نماز کے بعد یہ کلمات پڑھا کرو:

((اَللّٰهُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ.))

''اے اللہ! میری اعانت فرما کہ میں تیرا ذکر، تیرا شکر اور تیری اچھی عبادت کروں۔''

ذکر وشکر سے یہاں مراد ذکر وشکر لسانی بھی ہے اور قلبی بھی کہ اللہ کی زبان سے تسبیح وتحمید، تہلیل وتکبیر بھی کی جائے اور اس کے اوامر ونواہی کو بھی یاد رکھا جائے اور اس کے انعامات واحسانات کا بھی اعتراف کیا جائے۔ اسی طرح اللہ کے انعامات پر کلماتِ شکر بھی ادا کیے جائیں اور اعتراف کیا جائے کہ یہ سب انعامات میرے مولیٰ کی عنایتوں کا نتیجہ ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے شکر اور ایمان کو ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر وہ شکر کریں اور ایمان لائیں تو انھیں عذاب دینے کی کوئی وجہ نہیں:

﴿مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِیْمًا۝﴾ ②

''اللہ تمھیں عذاب دینے سے کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ ہمیشہ سے قدر کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

شیطان نے بھی کہا تھا کہ میں انھیں ہر جانب سے گمراہ کروں گا اور:

﴿وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ۝﴾ ③

---

① البقرۃ: 152 ② النساء: 147 ③ الأعراف: 17

”اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔“

اسی طرح ناشکری اور کفر کو ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ ①

”اور جب تمھارے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا اور بے شک اگر تم ناشکری کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب یقیناً بہت سخت ہے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ②

”بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔“

علامہ راغب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ”کفران“ کا لفظ زیادہ تر نعمت کا انکار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ”کفر“ کا لفظ انکارِ دین کے معنی میں اور ”کفور“ کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ ③

﴿وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ ④

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال پھیر پھیر کر بیان کی مگر اکثر لوگوں نے کفر کے سوا ہر چیز سے انکار کر دیا۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے بلقیس کا تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے آ گیا تو انھوں نے فرمایا:

---

① إبراهيم:7 ② الدهر:3
③ مفردات ④ الإسراء:89

﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ﴾ ①

''یہ میرے رب کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جس نے شکر کیا تو وہ اپنے لیے ہی شکر کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو یقیناً میرا رب بہت بے پروا بہت کرم والا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الزمر ② میں بھی شکر اور کفر کا ساتھ ساتھ ذکر ہوا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شکر و ایمان کے مابین کیا مناسبت ہے اور ناشکری اور کفر میں باہم کتنی مقارنت ہے۔

یہاں ﴿اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ﴾ سے شکر لسانی، شکر قلبی اور شکر فعلی مراد ہیں۔ اللہ کے ان انعامات کا شکر کیوں نہیں کرتے اور اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ یہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہی ہمیں حاصل ہیں۔ ان کے عطا کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

شکر سے متعلقہ امور وسیع الذیل ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ تاہم پہلے بھی اس حوالے سے جو کچھ ہم نقل کر آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ③

---

① النمل:40 ② الزمر:7 ③ یٰسٓ:35

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ○ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾

[یٰسٓ: 74-76]

''اور انھوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے تا کہ ان کی مدد کی جائے۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اور یہ ان کے لشکر ہیں جو حاضر کیے ہوئے ہیں۔ پس ان کی بات تجھے غم زدہ نہ کرے، بے شک ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

پہلی دو آیات میں کفار کی انتہائی ضلالت وحماقت کا بیان ہے کہ چاہیے تو یہ کہ جس مُنعِم نے ان پر اس قدر احسانات فرمائے ہیں اس کا شکر بجالایا جائے اور دل وجان سے اس کے انعامات کا اعتراف کر کے اس کی بندگی کی جائے۔ مگر انھوں نے ایسے محسن ومنعم کی بجائے بہت سے ایسے الٰہ بنا لیے ہیں جن سے اپنی مدد واعانت کی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں جو قطعاً ان کی مدد نہیں کر سکتے اور ان کے کوئی کام نہیں سنوار سکتے، چنانچہ فرمایا ہے:

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ آلِهَةً﴾

''انھوں نے اللہ کے سوا کئی معبود بنا لیے۔''

مشرکینِ مکہ براہِ راست اس آیت کے مخاطب ہیں جنھوں نے تین سو ساٹھ بت بنا رکھے تھے۔ عین اللہ کے گھر میں اللہ کی بجائے ان کی پرستش کرتے تھے۔ جب اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے لیے انسان مخلص نہ ہو تو پھر وہ ایک الٰہ پر اکتفا نہیں کرتا۔ اپنے خیال کے مطابق بہتر سے بہتر اور افضل سے افضل کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، گو ہر مقصود مل جانے پر اس کے سامنے سر جھکاتا ہے اور اس کو راضی کرنے کے بہانے اس کی نذریں

اور منتیں مانتا ہے کہ مشکل میں اور بوقتِ ضرورت یہ میری مدد کرے گا۔

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا﴾ ①

''اور انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے تاکہ وہ ان کے لیے باعثِ عزت ہوں۔''

ان کی پرستش سے عزت بنی ہوئی ہے، ان کے سب پجاری عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کسی مقدمے میں پھنس جائیں یا بیماری میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی بدولت بری اور شفایاب ہو جائیں گے۔ مشرکین کا جو طبقہ قیامت کا قائل ہے وہ یہ بھی سمجھتا ہے جیسے یہاں ان کی بدولت اور برکت سے عزت بنی ہوئی ہے قیامت میں بھی ان کی سفارش سے عزت ملے گی:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ②

''یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ③

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے اچھی طرح قریب کرنا۔''

بلکہ لڑائی اور قتال میں بھی ان کی مدد کے امیدوار ہوتے تھے۔ غزوۂ احد میں ابوسفیان کا ''أعْـلُ هبل'' کہنا بھی اس بات کا غماز ہے۔ غرض یہ کہ دفعِ ضرر اور جلبِ نفع کے لیے اپنے معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور آخرت میں بھی ان سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا:

﴿كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ ④

''ہرگز ایسا نہ ہوگا، عنقریب وہ ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے خلاف مدمقابل ہوں گے۔''

---

① مریم:81 ② یونس:18 ③ الزمر:3 ④ مریم:82

دنیا میں یہ جو اُن کے اولیاء بنے ہوئے تھے آج یہی ان کے اعداء ہوں گے اور یوں اظہار عداوت کریں گے کہ یہ ہماری پوجا پاٹ نہیں کرتے تھے بلکہ شیطانوں کے ہتھے چڑھے ہوئے تھے۔ یہ وہ ہوں گے جو اُن کو اپنی پوجا پاٹ سے روکتے تھے اور ان کے اس مشرکانہ فعل سے نالاں تھے۔ مگر جو اس سے خوش ہوتے، انھیں تھپکیاں دیتے اور اپنی ہمدردیاں جتلاتے تھے وہ اپنے عبادت گزاروں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے:

﴿اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَ كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ ①

''بے شک تم اور جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں، تم اسی میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور یہ سب اسی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

ان کی یہ ساری پوجا پاٹ اور نذریں نیازیں اس لیے تھیں کہ وہ مدد کریں گے اور مشکل میں کام آئیں گے حالانکہ وہ خود نہ اپنے نفع ونقصان کے مالک ومختار ہیں اور نہ ہی تمھیں نفع پہنچانے کے مجاز ہیں۔ چنانچہ عیسائی جنھوں نے (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا سمجھ کر اپنا معبود بنا رکھا تھا، ان کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بالآخر یہ بھی فرمایا ہے:

﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ ②

''کہہ دے: کیا تم اللہ کے سوا اُس کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے لیے نہ کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ نفع کا اور اللہ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

مسیحیوں کی مشہور ومستند کتاب انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (104/1) میں ایک جگہ

① الأنبیاء:99,98 ② المائدۃ:76

فخر سے لکھا ہے کہ کلیسا نے اپنی طویل تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا کہ خدا کے ساتھ مسیح سے بھی دعا نہ کی ہو۔ ①

حالانکہ خود اللہ تعالیٰ نے ان معبودوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا﴾ ②

''کہہ: آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہہ دے: اللہ، کہہ: پھر کیا تم نے اس کے سوا کچھ کارساز بنا رکھے ہیں جو اپنی جانوں کے لیے نہ کسی نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے۔''

اسی حقیقت کا بیان سورۃ الفرقان، الفتح، یونس اور الاعراف میں بھی ہوا ہے۔ ③ اس لیے یہاں مراد محض بت یا مورتیاں نہیں بلکہ وہ سب اس کا مصداق ہیں جن کی کسی نہ کسی صورت عبادت کی جاتی ہے۔

یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً﴾ سے بظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مشرکین نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا معبود بنالیا تھا۔ حالانکہ وہ اللہ کی بھی عبادت کرتے تھے، اللہ کے گھر کا طواف کرتے اور اللہ کو اپنا خالق و مالک سمجھتے تھے۔ مشرکینِ مکہ ہی نہیں بلکہ تمام مشرکین کا یہی وطیرہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبودوں کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی اس شراکت کی بنا پر ہی وہ مشرک ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا حکم خالص اپنی بندگی کا ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ ④

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس حال میں

---

① تفسیر ماجدی، ص:265 ② الرعد:16

③ الفرقان:3، الفتح:11، یونس:49، الاعراف:188 ④ البینة:5

کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن الله لا يقبل من العمل إلا ما كان له خالصا وابتغي به وجهه.)) ①

"بے شک اللہ تعالیٰ کسی عمل کو قبول نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ خالص اسی کے لیے ہو اور اس سے اسی کی رضا مقصود ہو۔"

اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ کوئی شریک گوارا نہیں، نہ اپنی عبادت میں اور نہ دیگر معاملات میں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«أنا أغنى الشركاء عن الشرك، من عمل عملاً أشرك فيه معي غيري تركته وشركه.» ②

"میں شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کسی عمل میں میرے ساتھ کسی کو شریک بنایا میں نے اسے اور اس کے شرک کو رد کر دیا۔"

طبرانی اوسط ③ کے الفاظ ہیں:

«فأنا منه بريء، وهو للذي أشرك.»

"میں اس سے بیزار ہوں اور وہ عمل اسی کے لیے جسے اس نے شریک بنایا۔"

ریا کی مذمت کے بارے مزید احادیث پیشِ نظر رہیں تو ان سے اس کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنا لیا گیا تو اس نے گویا اللہ کی خالص عبادت نہیں کی بلکہ اس شریک کی عبادت کی ہے۔ اسی لیے مشرک دراصل اللہ کا عبادت گزار نہیں ہوتا، "من دون الله" کا عبادت گزار ہوتا ہے۔ اور ایسا عمل اللہ کے ہاں مردود ہے۔ وہ عبداللہ و عبدالرحمٰن نہیں بلکہ عبدالطاغوت ثابت ہوا ہے۔

---

① نسائي: 3089 ② صحيح مسلم: 2985
③ طبراني اوسط: 272/7

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ﴾ نہ صرف یہ کہ وہ کسی کی مدد کرنے کے مالک ومختار نہیں بلکہ وہ ان کی مدد کرنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ مدد تو تب کریں جب وہ نفع و نقصان کے مالک ہوں، حال تو یہ ہے کہ وہ اپنے نفع ونقصان کے بھی مالک نہیں۔ ﴿لَا يَمْلِكُوْنَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾ ① اور نہ انھیں مصائب بدلنے کا کوئی اختیار ہے۔ ② اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ○﴾ ③

''کہہ: کون ہے جو رات اور دن میں رحمان سے تمھاری حفاظت کرتا ہے بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیرنے والے ہیں۔ یا ان کے لیے ہمارے سوا کوئی اور معبود ہیں جو انھیں بچاتے ہیں؟ وہ نہ خود اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری طرف سے ان کا ساتھ دیا جاتا ہے۔''

یعنی اگر اللہ رحمٰن تمھیں رات یا دن کے کسی حصے میں اپنی گرفت میں لینا چاہے تو کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ تمھارے بچانے میں کام آ سکے۔ تمھیں کیا وہ تو اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا اور نہ اللہ کے مقابلے میں تمھارا کوئی ساتھ دے سکتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کی پکڑ کا فیصلہ کر لے تو نہ کوئی معبود اسے بچا سکتا ہے اور نہ کوئی نگران ونگہبان۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت نہ ہو تو نہ کوئی معبود خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی عابد اور نہ کوئی محافظ انھیں تحفظ دے سکتا ہے۔ ضعف الطّالب والمطلوب۔

ایک اشکال کا جواب:

یہاں عموماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکین جب غیر اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں اور اپنی حاجات کے لیے انھیں پکارتے ہیں تو بعض اوقات انھیں ان کا مطلوب حاصل ہو جاتا

---

① الرعد:16 ② بنی اسرائیل:56 ③ الأنبیاء:43,42

ہے اور ان کی ضرورت وحاجت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ بظاہر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے منافی ہے کہ ''وہ ان کی مدد کی استطاعت نہیں رکھتے۔'' اور مشرکین یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارے حضرت صاحب نے ضرورت پوری کر دی ہے۔

مگر حقیقت یوں نہیں۔ حاجت برآری کرنے والا، مصائب سے بچانے والا، شفا دینے والا، اولاد عطا کرنے والا تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے اور یہ جو مشرک کے عمل کے نتیجے میں اس کا مقصد پورا ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اسبابِ معصیت کو آسان بنا کر بھی اپنے بندے کی آزمائش کرتا ہے کہ یہ گناہ سے بچتا ہے تو کیا مجھ سے ڈرتے ہوئے بچتا ہے یا عدمِ قدرت کی بنا پر بچتا ہے۔ یہود کو یومِ سبت کے احترام کا حکم تھا۔ مگر آزمائش کے لیے ہفتے کے روز مچھلیاں پانی کے اوپر آجاتیں، دوسرے ایام میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ یہود اس آزمائش پر پورے نہ اترے، ایک حیلے سے ہفتے کے روز کا احترام نہ کیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حالتِ احرام میں شکار حرام قرار دے کر صحابہ کرام کو آزمایا، چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ ①

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ تمھیں شکار میں سے کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائے گا جس پر تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہوں گے تاکہ اللہ جان لے کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے، پھر جو اس کے بعد حد سے بڑھے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

حالتِ احرام میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے شکار آتا مگر وہ اس آزمائش پر پورے اترتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مشرکین کو ان کی حاجات برآری کر کے آزماتا ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہیں یا میرے ساتھ شریک بنانے پر اڑے رہتے ہیں۔

---

① المائدۃ:94

حاجت برآری تو بت پرستوں کی بھی ہوتی تھی اور ہوتی ہے مگر حقیقۃً ہوتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن مشرک اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ مشکل کشائی ان کے مشکل کشاؤں نے کی ہے۔ تو کیا بس اس غلط فہمی کی بنا پر ان کے شرک کو سندِ جواز دے دی جائے اور اسے درست قرار دے دیا جائے؟ ہرگز نہیں۔ اللہ اپنے بندے سے ویسا ہی معاملہ کرتا ہے جیسا وہ اللہ تعالیٰ پر گمان ویقین رکھتا ہے:

" أنا عند ظن عبدي بي."

یعنی میں اپنے بندے کے اس گمان کے مطابق ہوتا ہوں جو وہ میرے بارے رکھتا ہے۔

جسے اللہ پر بھروسا نہیں اللہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔

﴿وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ﴾ ''اور یہ ان کے لشکر ہیں جو حاضر کیے ہوئے ہیں۔'' اس کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں:

ا:...... ایک یہ کہ ﴿وَهُمْ﴾ سے جھوٹے معبود مراد ہیں اور ﴿لَهُمْ﴾ سے ان کے جان نثار اور عبادت گزار مراد ہیں، یعنی یہ معبود اپنے مشرکوں کے ساتھ اللہ کے ہاں حاضر کیے جائیں گے۔ ﴿مُحْضَرُوْنَ﴾ کے لفظ سے عیاں ہے کہ انھیں مجرموں کی صورت میں فرشتے دربارِ الٰہی میں حاضر کریں گے تو ان کے اجتماع میں ان کے جھوٹے معبودوں کو بھی حاضر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت دونوں کے لیے شرمندگی اور ندامت میں مزید اضافے کا باعث بنے گی کہ ہم نے دنیا میں ایک دوسرے کے بارے میں کیا سمجھ رکھا تھا اور آج ہم کس پوزیشن میں ہیں۔ اسی حقیقت کا بیان سورۂ انبیاء ① میں ہوا ہے جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ سورۃ الصافات میں بھی ہے:

﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ○ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ○ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ○ ﴾ ②

---

① الانبياء: 98، 99 ② الصافات: 22 تا 25

’’اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔ اللہ کے سوا، پھر انھیں جہنم کی راہ کی طرف لے چلو۔ اور انھیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔ کیا ہے تمھیں، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟‘‘

گویا جہنم کی طرف لے جاتے ہوئے ان کی مزید توبیخ اور تفضیح کے لیے کہا جائے گا کہ دنیا میں تو تمھاری اللہ کے سوا اپنے معبودوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور تم ان پر اپنی جانیں نچھاور کرتے تھے، آج ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر معبود کے ساتھ اس کے پیروکاروں کے الگ الگ جتھے ہوں گے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ظالموں کی الگ الگ ٹولیاں ہوں گی، سود خوروں کا گروہ الگ ہوگا، زنا کرنے والوں کا الگ اور شراب نوشوں کا الگ۔ ①

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ سب انسانوں کو ایک میدان میں جمع کریں گے، پھر فرمائیں گے:

««ألا يتبع كل إنسان ما كانوا يعبدون.»»

کیوں نہیں چلا جاتا ہر انسان اپنے معبود کے ساتھ؟

چنانچہ صلیب کے پجاریوں کے لیے صلیب، بت پرستوں کے لیے بت اور آتش پرستوں کے لیے آگ پیش کی جائے گی اور جو جس کی پوجا کرتے تھے ان کے ہم راہ ہوں گے۔‘‘ ②

اور یہ صورت بھی دراصل ان کی فضیحت میں اضافے کے لیے ہوگی تاکہ ہر ایک دیکھ لے کہ کون کس کے ساتھ ہے؟

---

① فتح القدير

② ترمذی: 2557، وقال: حسن صحيح، احمد: 368/2 وغیرھما

2:......دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ﴿وَهُمْ﴾ سے مشرکین اور ﴿لَهُمْ﴾ سے ان کے معبود مراد ہیں، یعنی یہ مشرک ان معبودوں کے جتھے اور لشکر ہیں۔ ان کے دربار اور استھان ان کے نذرانوں سے روشن اور آباد ہیں۔ یہی ان کی بارگاہیں سجانے والے ہیں اور ان کے پروپیگنڈا سیکرٹری ہیں۔ ان کے دفاع اور ان کی حمایت میں یہ لڑتے ہیں تب کہیں ان کی خدائی چلتی ہے۔ جیسے نمرود اور اس کے ہم نواؤں نے کہا تھا:

﴿قَالُوا حَرِّقُوهُ وَ انْصُرُوٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ﴾ ①

''انھوں نے کہا: اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔''

سردارانِ مکہ بھی جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کی اس بات پر متعجب ہوئے کہ بس ایک ہی معبود بنا ڈالا تو ناراض ہو کر چل دیے اور جو انھوں نے کہا قرآن مجید میں ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ﴾ ②

''اور ان کے سرکردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔''

اس لیے ان معبودوں نے کیا کسی کی مدد کرنی ہے الٹا لشکروں کے لشکر ان کے مددگار بنے ہوئے ہیں اور ان کے دربار اور مزار سجا رہے ہیں۔

﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی ہے کہ یہ مشرکین جب اپنے منعم حقیقی کے ناشکرے واقع ہوئے ہیں اور ایک معبود کی عبادت کی دعوت پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں، آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہوئے

---

① الأنبیاء:68 ② صٓ:6

آپ ﷺ کو شاعر، مجنون اور کاہن کہتے ہیں تو اس سے آپ دل برداشتہ اور غم زدہ نہ ہوں۔ آپ ﷺ کے خلاف ان کی یہ سب زبان درازیاں میری وجہ سے ہیں۔

﴿اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ ''ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔'' یہ جملہ مستانفہ ہے۔ پہلے ﴿قَوْلُهُمْ﴾ پر وقف لازم ہے۔ اور اس میں بیان ہے کہ کفارِ مکہ ظاہری طور پر آپ ﷺ کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے جو الزام تراشیاں کرتے ہیں اور جو ہتھکنڈے اختیار کیے ہوئے ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں اور نجی مجلسوں میں جو سرگوشیاں کرتے ہیں اور نت نئے محاذ کھولنے کی سازشیں کرتے ہیں انھیں بھی ہم جانتے ہیں۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ٥﴾ ①

''اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ ②

''ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونھوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں وہ زیادہ بڑا ہے۔''

گویا اس میں منافقین و مشرکین کے لیے تہدید و سرزنش ہے کہ ہم تمھارے ہر قسم کے کرتوتوں سے باخبر ہیں۔

اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ یہ اعلانیہ تو آپ کی مخالفت کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی دعوت کو دبانے اور لوگوں کو متنفر کرنے کے لیے آپ ﷺ کو شاعر

---

① القصص:69 ② آلِ عمران:118

اور دیوانہ کہتے ہیں۔ مگر نجی مجلسوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ﷺ شاعر نہیں اور جو الزام تراشیاں ہیں وہ بھی بے بنیاد ہیں۔

ایک یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جو عقائد فاسدہ ان کے دلوں میں ہیں اور جن افعال قبیحہ کے یہ مرتکب ہیں ہم انھیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی یہ باطل پرستی اور آپ ﷺ کے خلاف یہ ہرزہ سرائی دیر تک نہیں چل سکے گی۔ آپ ﷺ مطمئن رہیں اور اپنے کام سے کام رکھیں، ہم خود ہی ان سے نپٹ لیں گے۔

﴿يُسِرُّوْنَ﴾ "الإسرار" سے ہے اور اعلان کی ضد ہے۔ اس سے مراد راز کی بات یا بات کو چھپانا ہے۔ یہ "إسرار" ایک انسان کا بھی ہوتا ہے اور ایک جماعت کا بھی کہ وہ باہم ایک بات طے کریں اور اس کا کسی سے اظہار نہ کریں۔ یہاں "إسرار" سے فرداً فرداً اور ان کی اجتماعی سازشیں دونوں مراد ہیں۔ جس میں شدید وعید ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی اداؤں سے اور تمھاری منصوبہ بندیوں سے ہم آگاہ ہیں جس کا انجام وہ قیامت کے دن پالیں گے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ [يٰسٓ: 80-77]

”اور کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑنے والا ہے۔ اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ کہہ دے انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا خوب جاننے والا ہے۔ وہ جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی، پھر یکایک تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔“

پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی کا بیان تھا اب یہاں اسی کا تکملہ اس اسلوب میں بیان ہوا ہے کہ جو اپنی پیدائش کی حقیقت سے غافل ہو کر بڑے طنطنہ سے میرے بارے میں منہ کھول لیتے ہیں وہ اگر آپ ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کے مرتکب ہیں اور آپ ﷺ کو شاعر و کاہن کہتے ہیں تو اس سے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیامِ قیامت کے بارے میں بھی یہاں دلیل بیان ہوئی ہے کہ جس نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا ہے وہی اُسے حیاتِ نو دینے پر بھی قادر ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ﴾ کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے۔ ﴿الْاِنْسَانُ﴾ سے شانِ نزول کے اعتبار سے عاص بن وائل السہمی مراد ہے۔ یوں ﴿الْاِنْسَانُ﴾ میں ”ال“ عہد ذہنی ہے مگر اس سے مراد جنس انسان بھی ہو سکتی ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ①

"اس نے انسان کو ایک قطرے سے پیدا کیا پھر اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑنے والا ہے۔"

اور اس سے مراد ہر وہ انسان بھی ہو سکتا ہے جو قیامت کا منکر ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عاص بن وائل رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہڈی لے کر آیا اور اپنے ہاتھ سے اسے مسل دیا پھر کہنے لگا کیا اسے بھی زندہ کیا جائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((نعم یمیتك الله ثم یحییك ثم یدخلك جهنم.)) ②

"ہاں اللہ تمھیں موت دے گا پھر تمھیں زندہ کرے گا پھر تمھیں جہنم میں داخل کرے گا۔"

اس پر سورۂ یٰسٓ کی یہ آخری آیات نازل ہوئیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بسند صحیح اسے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مرسلاً بھی ذکر کیا ہے۔

اس میں پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو ایک قطرہ پانی سے پیدا کیا۔ یہ اپنی اوقات کو نہیں دیکھتا الٹا جھگڑا کرتا ہے۔ انسان اگر اپنی حیثیت جان لے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں ہرزہ سرائی نہ کرے بلکہ کہا جاتا ہے کہ "من عرفه نفسه فقد عرفه ربه" جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔ انسان سمجھ لے کہ میں فانی ہوں، بقا اور دوام اللہ کے لیے ہے، میں کمزور وناتواں ہوں، ہر چیز پر قوت وقدرت اللہ کی ہے۔ میں نادان و بے علم ہوں، علیم وخبیر اللہ ہے، بلکہ حافظ ابن قیم نے فرمایا ہے نعمت ایمان اور نعمت علم سے وہی مستفید ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پہچان لیتا

---

① النحل:4

② الحاکم: 429/2، الاحادیث المختارة: 87/10، ابن کثیر:767/3 وغیرہ واسنادہ صحیح، الاستیعاب فی بیان الاسباب: 155/3

ہے۔شائقین اس کے لیے ان کی کتاب الفوائد ملاحظہ فرمائیں۔ ①

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں: عرفت ربی بفسخ العزائم ''میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک قطرہ پانی سے بنایا ہے، جس کے بارے میں مزید وضاحت یہ بھی ہے:

﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ٥ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ٥﴾ ②

''کیا ہم نے تمھیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا۔ ایک معلوم اندازے تک۔''

اس کی تھوڑی سی تفصیل سورۃ السجدہ میں یوں بیان ہوئی ہے:

﴿اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ٥ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ٥﴾ ③

''جس نے اچھا بنایا ہر چیز کو جو اس نے پیدا کی اور انسان کی پیدائش تھوڑی سی مٹی سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے خلاصے سے بنائی۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی ایک روح پھونکی اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت کم شکر کرتے ہو۔''

یہاں انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کا بیان مقصود نہیں جیسا کہ سورۃ المومنون ④ میں بیان ہوا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں باتیں بنانے والوں کو

---

① الفوائد: 135 ② المرسلٰت: 20-22
③ السجدۃ: 7-9 ④ المؤمنون: 12-14

پہلے اپنی تخلیق پر غور کرنا چاہیے کہ پہلے مٹی سے ایک انسان بنایا پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے قطرے سے جاری کی۔ وہ قطرہ جو کپڑے اور جسم پر لگ جائے تو اس سے تکدُّر محسوس ہو اور دھوئے بغیر اطمینان نہ ہو۔ پھر ہم نے اس کی آنکھیں، کان، دل، جگر، معدہ، گردے، گوشت پوست، ہڈیاں، بال، ناخن، پٹھے اور رگیں بنا دیں۔ جو اللہ ایک قطرے سے مرحلہ وار یہ سب کچھ بنانے پر قادر ہے تو وہ اسے مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر کیوں نہیں؟:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِـۧ الْمَوْتٰى ۝﴾ ①

''کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بغیر پوچھے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔ پھر وہ جما ہوا خون بنا، پھر اس نے پیدا کیا، پس درست بنا دیا۔ پھر اس نے اس سے دو قسمیں نر اور مادہ بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟''

اس لیے جو ربّ انسان کو عدم سے وجود بخشتا ہے اس کے لیے مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں! ایک قطرہ سے انسان کے تمام اعضاء کو وجود بخشنے والے قادر مطلق کی قدرت پر غور کیا ہوتا تو اس کے بارے میں نازیبا باتیں کرنے کی جسارت نہ کرتا اور یہ نہ کہتا کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟

حضرت بُسر بن جحاش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز اپنی ہتھیلی پر لعاب مبارک ڈالا، پھر اس پر انگلی مبارک رکھ کر فرمایا:

((يقول الله عزّوجلّ: أنّى يُعْجِزُنِي، ابن آدم وقد خلقتك من

① القيامة: 36-40

مثل هذه، فإذا بلغت نفسُك الى هذه - واشار الى حلقه - قلتَ: أتصدق، وأنّى أَوانُ الصدقة.)) ①

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے آدم کے بیٹے! تو مجھے کیسے عاجز کرسکتا ہے، حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا کیا ہے، پھر جب تیری جان یہاں تک پہنچی، یہ کہتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے حلق مبارک کی طرف اشارہ فرمایا، تب تو کہتا ہے میں صدقہ کرتا ہوں، اب صدقہ کا وقت کہاں؟''

قطرۂ پانی سے رحمِ مادر میں انسان کی پیدائش و پرورش کی، حضرت انس رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لو ان الماء الذي يكون منه الولد أهرقته على صخرة لأخرج الله منها ولدا.)) ②

''جس پانی کے قطرہ سے بچہ پیدا ہونا ہے اگر اسے پتھر پر ڈالا جائے تو اللہ اس سے بھی بچہ پیدا کردے گا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل معاملہ نہیں، نہ ہی بچہ پیدا کرنے میں وہ رحم مادر کا محتاج ہے یہ تو اس کا ایک نظام ہے کہ رحم مادر سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس نظام کا پابند نہیں۔ بلکہ آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر پتھر سے گابھن اونٹنی کو پیدا کیا۔ اس ناقۃ اللہ کے ساتھ جو سلوک قوم نے کیا اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں نشانِ عبرت بنا دیا۔ جس کی تفصیل قرآنِ مجید اور تفاسیر میں موجود ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جب چاہے، جس سے چاہے جو کچھ چاہے پیدا کردے جو ہستی اس قدر قادر مطلق ہے وہ انسان کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر

---

① ابن ماجه: 2707، احمد: 4/210، حاكم: 2/502، 4/373، الصحيحة: 1099، 1143

② احمد: 3/147، بزار واسنادهما حسن، مجمع: 4/296

کیوں قادر نہیں؟

علم وعقل کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو کسی چیز کو پہلی بار بنا سکتا ہے اگر اس کے حصے بخرے کر دیے جائیں تو وہ از سر نو بھی اسے بنا سکتا ہے بلکہ دوبارہ بنانا اس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف ایک اور مقام پر بھی اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ ①

''اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے۔''

اسی طرح فرمایا: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ ② ''تو کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کے ساتھ تھک کر رہ گئے ہیں (جو دوبارہ ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا)؟''

یہ انسانوں کی عادت کے اعتبار سے ہے ورنہ قادر مطلق کے لیے تھکنے نہ تھکنے یا زیادہ آسان یا کم آسان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے پہلی بار بھی پیدا کرنا آسان ہے اور دوسری بار بھی۔

﴿خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ﴾ ''کھلم کھلا جھگڑنے والا۔'' گویا وہ جھگڑنے میں بڑی دلیری و بے باکی دکھاتا ہے۔ اس سے باطل امور پر جھگڑنے اور بحث ومناظرے کی مذمت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ آیت میں مذمت ہی کا پہلو بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ﴾ ③

''اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، اس کے بعد کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی، ان کی دلیل ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت سزا ہے۔''

لہٰذا توحید کے مقابلے میں کفر وشرک کی تائید میں یا سنت کے مقابلے میں بدعت کی حمایت میں جھگڑنا یا رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دوٹوک الفاظ ''خاتم النبیین'' اور

---

① الروم 27:30 ② قٓ 15:50 ③ الشوریٰ 16:42

حدیث میں "لا نبي بعدي" کی نصوص کے مقابلے میں، لایعنی استدلال کی بنیاد پر جھگڑنا سراسر خسارے کا سودا ہے اسی طرح باطل اور صریح جرم کی وکالت بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾ ①

"(اے میرے نبی ﷺ) تو خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والا نہ بن۔"

بلکہ اس کے ساتھ یہ کہہ کر خبردار بھی کر دیا:

﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا﴾ ②

"سن لو! تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا، تو ان کی طرف سے اللہ سے قیامت کے دن کون جھگڑے گا، یا کون ان پر وکیل ہوگا؟"

بلکہ جھگڑے اور جدال کے لیے علم حاصل کرنے کی حدیث میں مذمت بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من طلب العلم ليماري به السفهاء أو ليباهي به العلماء أو ليصرف وجوه الناس اليه فهو في النار.)) ③

"جو شخص اس لیے علم حاصل کرتا ہے کہ بے علموں سے جھگڑا و جدال کرے یا علماء کے مقابلے میں فخر کا اظہار کرے یا لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے اور اپنی طرف متوجہ کرے، وہ جہنم میں جائے گا۔"

حتیٰ کہ اثباتِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے بھی مناسب طریقے سے ہی جھگڑنے کی اجازت ہے چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① النساء:105 ② النساء:109 ③ ابن ماجه: 253 وله شواهد

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ ①

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔''

بحث و مناظرہ اچھے طریقے سے ہونا یہ ہے کہ گفتگو میں نرمی ہو، گرم گفتاری، طعن و ملامت اور بدکلامی سے بچا جائے۔ اپنی بات کو دلیل سے مزین کیا جائے۔ اہل کتاب کے ساتھ بھی مجادلے کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

﴿وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ ②

''اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔''

یہ مجادلہ دراصل ان کے لیے ہے جو عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں ورنہ اصل الاصول تو دعوت ہے جو حکمت و موعظہ حسنہ سے ہی ہونی چاہیے۔

﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ﴾ اس جھگڑالو انسان نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ یہ انسانوں کی طرح ہمیں بھی عاجز سمجھتا ہے اور ہماری قدرت کاملہ کا انکار کرتا ہے اور یہ وہ جسارت اپنی تخلیق کو نظر انداز کر کے کرتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ خود ''ماء مهین'' سے پیدا ہوا ہے اور ہمارے ساتھ جھگڑا کرتا ہے۔ اور کہتا ہے جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو انھیں کون زندہ کرے گا؟

''رمیم'' بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ اور ''أرقت عظامه'' کے معنی ہیں ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر باریک ہو جانا کہ پھونک سے اڑ جائیں۔ ③

گویا جب انسان کا گوشت پوست گل سڑ جائے گا اور اس کی ہڈیاں خاک میں مل جائیں گی تو یہ ہڈیاں کیونکر دوبارہ بنیں گی اور ان میں زندگی کی رمق کیسے آئے گی؟ اس عقلی

---

① النحل:125 ② العنکبوت:46 ③ مفردات

ڈھکوسلے کا جواب بعد کی آیت میں ہے:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ ”کہہ دے: انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔“ ”إنشــــاء“ کے معنی کسی چیز کو پیدا کرنا، ایجاد کرنا اور پرورش کرنا ہے۔ حیات بعد الممات کے بارے میں یہی استدلال ذرا تفصیل سے سورۃ الواقعہ میں بھی بیان ہوا ہے:

﴿نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ○ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ○ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ○ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ○ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ○﴾ ①

”ہم نے ہی تمھیں پیدا کیا تو تم (دوبارہ اٹھنے کو) کیوں سچ نہیں مانتے؟ تو کیا تم نے دیکھا وہ (نطفہ) جو تم ٹپکاتے ہو؟ کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا وقت مقرر کیا ہے اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں۔ اس بات سے کہ تمھاری جگہ تمھارے جیسے اور لوگ لے آئیں اور نئے سرے سے تمھیں ایسی صورت میں پیدا کر دیں جو تم نہیں جانتے۔ اور بلاشبہ یقیناً تم پہلی دفعہ پیدا ہونے کو جان چکے ہو تو تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے؟“

جب تمھیں یقین ہے کہ پہلی بار ہم نے ہی تمھیں اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے تو پھر تم کیوں نہیں سمجھتے کہ موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنے میں ہمیں کیا مشکل ہوگی؟

ہڈیوں میں حیات کا مسئلہ:

قرآنِ مجید کی اسی آیت کے تحت بعض مفسرین نے یہ بحث بھی کی ہے کہ کیا ہڈیوں میں بھی موت نفوذ کرتی ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور بعض شوافع کا خیال ہے کہ ہڈیوں میں

---

① الواقعۃ: 57-62

حیات ہے، ان میں موت نفوذ نہیں کرتی، اس لیے یہ پاک ہیں اور "میت" کے حکم میں نہیں ہیں۔ مگر امام شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ منکرین قیامت نے جو کہا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ تو ان کے جواب میں فرمایا گیا کہ انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ گویا اس آیت میں ہڈیوں کے مردہ ہونے کو تسلیم کیا گیا ہے، لہٰذا جب ہڈیاں مردہ ہیں تو وہ نجس ہیں اور ان سے انتفاع جائز نہیں۔

یہ نزاع حیوانات کی ہڈیوں کے بارے میں ہے۔ رہے انسان تو ان کی ہڈیاں، ان کے بال اور تمام اجزاء پاک ہیں۔ یہی جمہور علماء کی رائے ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ ①

"اور بلاشبہ، یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو بہت عزت بخشی ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«المسلم لا ينجس حيا ولا ميتا.»

"مسلمان زندہ اور مردہ پلید نہیں ہوتا۔"

بلکہ حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إن المسلم لا ينجس)) ②

"بے شک مسلمان نجس نہیں ہوتا۔"

میت کو غسل اس کی نظافت ونفاست کے لیے ہے، یوں نہیں کہ فوت ہونے سے مسلمان نجس ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر اس کے پیٹ سے کوئی چیز خارج ہو تو وہ بہر حال نجس ہے۔

رہے ماکول اللحم جانور جن کو ذبح کیا گیا ہو، ان کی ہڈیاں اور بال بھی جمہور علماء کے ہاں پاک ہیں۔ لیکن اگر وہ مر گئے ہوں یا غیر ماکول اللحم ہوں تو ان کی ہڈیاں بال، سینگ

---

① بني إسرائيل:70 ② صحيح بخاري: 283

وغیرہ امام مالک امام شافعی اور امام اسحاق رحمہم اللہ کے نزدیک نجس ہیں۔ یہی قول امام عطاء، حسن بصری، طاؤس اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ کا ہے۔ ①

مگر امام ابوحنیفہ، ابن سیرین، ابن جریج رحمہم اللہ وغیرہ کے نزدیک یہ سب پاک ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ابن وہب رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ ②

امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام عطاء رحمہ اللہ انسانوں کے بالوں کی رسیاں بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ③

اسی طرح امام زہری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: مردار ہڈیوں، مثلاً: ہاتھی دانت وغیرہ کے بارے میں مَیں نے بہ کثرت متقدمین کو دیکھا وہ ہاتھی دانت سے بنی ہوئی کنگھیوں سے کنگھی کرتے تھے اور ہڈیوں سے بنے ہوئے برتنوں میں تیل رکھتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ابن سیرین اور ابراہیم نخعی رحمہما اللہ نے فرمایا ہے کہ ہاتھی دانت کی تجارت میں کوئی حرج نہیں۔ ④

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ماکول اللحم جانور کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور وہ مر جائے تو اس کی نجاست خون کے نہ نکلنے کی بنا پر ہے۔ جس میں خون نہ ہو اور وہ مر جائے، تو وہ نجس کیسے ہوگا کیونکہ اس میں خون ہی نہیں، مثلاً: مکھی میں خون نہیں، اگر وہ پانی وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ نجس نہیں؟ تو ہڈی وغیرہ بالاولیٰ نجس نہیں ہوگی کیونکہ اس میں بہنے والا خون نہیں ہوتا۔ وہ متحرک بالارادہ بھی نہیں بلکہ

---

① المغني: 89/1

② تفسير قرطبي: 155/10

③ صحيح بخاري: كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان وفتح الباري: 272/1

④ صحيح بخاري: كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان وفتح الباري: 342/1

جسم انسانی کے بالتبع بڑھتی ہے۔ جب کامل حیوان متحرک بالارادہ ''دم سائل'' (بہنے والا خون) نہ ہونے کی وجہ سے نجس نہیں تو ہڈیاں جن میں خون نہیں وہ نجس کیسے ہوگئیں؟

مزید فرماتے ہیں کہ زندگی کی دو نوعتیں ہیں: ایک جو حیوانات سے متعلق ہے اور دوسری جو نباتات سے متعلق ہے۔ حیوانی زندگی کا خاصہ حس اور حرکت بالارادہ ہے اور نباتاتی زندگی کا خاصہ نمو یعنی بڑھنا اور غذا حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مردہ کو حرام قرار دیا ہے تو یہ اس لیے کہ اس سے حیات حیوانیہ ختم ہو جاتی ہے۔ حیات نباتاتیہ کا ختم ہونا یہاں مراد ہی نہیں۔ جیسے درخت اور کھیتی ہے، اگر وہ خشک ہو جائے تو بالاتفاق وہ نجس نہیں۔ بالوں کی زندگی بھی نباتات کی زندگی کی طرح ہے۔ ان میں بڑھنا اور غذا حاصل کرنا کھیتی کی طرح ہے، ان میں نہ حس ہے اور نہ یہ اپنے ارادے سے حرکت کرتے ہیں۔ جب انھیں حیاتِ حیوانیہ ہی حاصل نہیں کہ وہ موت سے دوچار ہوں تو ان کو نجس کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شیخ الاسلام نے اس کی تفصیل چھ صفحات میں بیان کی ہے جو قابلِ مراجعت ہے۔ ①

یہی موقف حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ②

رسول اللہ ﷺ کے فضلات کا حکم:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اسی بحث کے ضمن میں یہ بھی فرمایا ہے:

«فقد ثبت أن النبي ﷺ أعطى شعره لما حلق رأسه للمسلمين، وكان ﷺ يستنجي ويستجمر فمن سوى بين الشعر والبول والعذرة فقد أخطأ خطأً بينًا.» ③

''بے شک یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے جب اپنا سر مبارک منڈوایا تو اپنے سر کے بال مبارک مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔ اور آپ ﷺ بول و براز کے بعد استنجا کرتے اور ڈھیلا استعمال کرتے تھے، لہٰذا جو بالوں اور بول و براز کو برابر سمجھتا ہے

---

① مجموع فتاویٰ: 21/96-102

② التبيان في أقسام القرآن، ص: 315 ③ مجموع فتاویٰ: 21/59

بلا شبہ وہ واضح غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے پانی سے بھی استنجا کیا اور ڈھیلوں سے بھی، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے جاتے تو میں اور ایک غلام برتن میں پانی لے جاتے اور آپ ﷺ اس سے استنجا کرتے۔ ①

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے نکلے، میں آپ ﷺ کے پیچھے تھا۔ جب میں آپ ﷺ کے قریب ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے لیے پتھر لاؤ، میں اس سے استنجا کروں گا، ہڈی اور گوبر نہ لانا۔'' ②

بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ قضائے حاجت کے لیے نکلے تو استنجا کے لیے مجھے تین پتھر لانے کا حکم فرمایا۔ ③

اگر رسول اللہ ﷺ کے تمام فضلات پاک ہوتے تو قضائے حاجت کے بعد استنجا کی ضرورت ہی کیا تھی؟ صرف استنجا ہی نہیں بلکہ استنجا سے فارغ ہو کر وضو سے پہلے مزید نظافت کے لیے ہاتھ مٹی پر ملتے، پھر وضو کرتے تھے۔ ④

امام زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اے بیٹے! بول و براز کے وقت میں چاہتا ہوں کہ علیحدہ لباس بنالوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو مکھیاں بیت الخلاء میں ہوتی ہیں وہ میرے اوپر بیٹھتی ہیں، پھر وہ متنبہ ہوئے اور فرمایا:

«فما كان لرسول الله ﷺ ولا لأصحابه إلا ثوب فرفضه.» ⑤

---

① صحيح بخاري: 217,150 وغيره

② صحيح بخاري: 155 وغيره

③ صحيح بخاري: 156 وغيره

④ ابو داود: 46، نسائي: 50، 51 وغيره

⑤ الحلية: 133/3

''رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ایک ہی لباس ہوتا تھا تو آپ رحمہ اللہ نے علیحدہ لباس بنانے کا خیال ترک کر دیا۔''

علامہ ابن جوزیؒ نے تلبیس ابلیس ① میں لباس کے بارے میں صوفیوں کے اسی قسم کے توہم کی تردید میں یہ اثر نقل کیا ہے اور اسی فکر کی تردید میں اسے علامہ ابن قیمؒ نے اغاثۃ اللہفان ② میں بھی نقل کیا ہے۔ اس کے سب راوی ثقہ ہیں البتہ یہ مرسل ہے تاہم اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ بھی آپ ﷺ کے بول و براز کو نجس ہی سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے خود بیت الخلاء کے لیے علیحدہ لباس کا خیال ترک کر دیا۔ اگر وہ پاک ہوتا تو امام زین العابدین رحمہ اللہ کا استدلال ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے فضلات کو زمین نہیں نگلتی تھی۔ فتدبر

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ سبیلین سے بول یا براز نکلنے سے انسان کی طہارت ختم ہو جاتی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے آپ کو ایسی صورت میں غیر طاہر ہی قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پیشاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ کو سلام کہہ دیا۔ آپ ﷺ نے اس کا جواب نہ دیا، پھر آپ ﷺ نے تیمّم کر کے اسے جواب دیا۔ جب کہ حضرت مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ کی اسی نوعیت کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے وضو کر کے جواب دیا اور فرمایا:

((إني كرهت أن أذكر الله عزوجل إلا على طهارة.)) ③

''میں نے ناپسند کیا کہ اللہ کا ذکر طہارت کے بغیر کروں۔''

رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کے چھینٹوں سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے اور خبردار بھی فرمایا ہے کہ عذابِ قبر کا سبب پیشاب کے قطروں سے بچنے میں بے احتیاطی ہے۔ اور آپ

---

① تلبیس ابلیس ص: 181　② اغاثۃ اللہفان: 155/1

③ أبو داود: 16، 17 وغیرہ

خود بھی اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کرنا چاہا تو دیوار کی جڑ میں نرم جگہ پر پیشاب کیا اور فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی پیشاب کرے اسے چاہیے کہ پیشاب کے لیے نرم جگہ تلاش کرے۔'' ①

امام ابوداود رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ان الفاظ سے باب قائم کیا ہے: ''باب الرجل یتبوء لبوله.'' ''باب ہے اس بارے میں کہ آدمی پیشاب کے لیے نرم جگہ تلاش کرے۔'' تاکہ اس کے چھینٹے پیشاب کرنے والے کی طرف نہ آئیں۔

اس کی تائید حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیان سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ضرورت کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے وہاں کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ دیوار کی طرف تھا اور مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے کھڑا ہونے کا حکم فرمایا۔ ②

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام ابن حبان رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پیشاب کرنے کی مناسب جگہ نہ پا کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر کھڑے ہوکر پیشاب کیا تاکہ پیشاب کے چھینٹے لوٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ آئیں۔ ③

بلکہ صحیح ابن خزیمہ میں تو ہے:

«ففرج بين رجليه وبال قائما.»

''آپ نے اپنی ٹانگوں کو کھول لیا اور کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔''

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے اس حدیث پر باب کے الفاظ ہیں:

«باب استحباب تفريج الرجلين عند البول قائما إذ هو أحرى أن لا ينشر البول على الفخذين.» ④

یعنی کھڑے ہوکر پیشاب کرتے ہوئے ٹانگوں کو کھولنا مستحب ہے،

---

① ابوداود: 3 ② صحیح بخاری: 225 وغیرہ
③ فتح الباری: 330/1 نیز دیکھیے الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان: 293/3
④ صحیح ابن خزیمہ: 36/1

اس لیے کہ یہ صورت ٹانگوں کو پیشاب سے بچانے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

اگر آپ ﷺ کا پیشاب پاک تھا تو اس سے بچنے کا یہ اہتمام چہ معنی دارد؟

انسان کے جسم سے نکلنے والی اشیاء میں سے منی بھی ہے جس کے بارے میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ اسے پاک کہتے ہیں۔ صحابہ کرام میں حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی موقف ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ ناپاک کہتے ہیں۔ اس مسئلے کی تفصیل یہاں مقصود نہیں، بس یہ عرض کرنا ہے کہ منی کے بارے میں یہ اختلاف بھی اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فضلات کو پاک کہنے کا قول قطعاً متفق علیہ نہیں ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل کرتے:

«غسل فرجه وما أصابه من الأذى.» ①

”تو اپنی شرم گاہ کو اور جو نجاست آپ کے جسم مبارک کو لگی ہوئی ہوتی تھی، اسے دھوتے تھے۔“

غسلِ جنابت کے بارے میں مروی روایات میں یہ تفصیل بھی ہے کہ آپ ﷺ پہلے ہاتھ دھوتے، پھر شرمگاہ اور رانوں کو دھوتے۔ ②

شرمگاہ کے ساتھ رانوں کو دھونا اسی کی تفصیل ہے جسے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ”وما أصابه من الأذى“ کے الفاظ سے بیان فرماتی ہیں۔

”أذى“ سے مراد ہر تکلیف دینے والی چیز اور پلیدی و نجاست ہے۔ قرآنِ مجید میں حیض کے بارے میں بھی یہی لفظ (أذى) استعمال ہوا ہے:

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ③

---

① صحيح بخاري، رقم الحديث: 249

② ابوداود، رقم الحديث: 243,242 وغيره ③ البقرة:222

جس کا ترجمہ شیخ الہند محمود حسن دیو بندیؒ یوں کرتے ہیں:

''اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض، کہہ دے: وہ گندگی ہے، سوتم الگ رہو عورتوں سے حیض کے وقت اور نزدیک نہ ہو اُن کے جب تک پاک نہ ہوویں۔''

مجدد ملت بریلویہ احمد رضا خان اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

''اور تجھ سے پوچھتے ہیں حیض کا حکم، تم فرماؤ: وہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے الگ رہو حیض کے دنوں اور ان سے نزدیکی نہ کرو جب تک پاک نہ ہوں لیں۔''

مترجم قرآنِ مجید میں ﴿أَذًى﴾ کا ترجمہ گندگی، ناپاکی کیا گیا ہے۔ اور یہی لفظ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منی کے بارے میں بیان فرماتی ہیں۔ اگر ان کے ہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کے پاک ہونے کا تصور پایا جاتا تو کیا وہ منی کو ''أذی'' سے تعبیر کرتیں؟ ''أذی'' کے یہی معنی کئی احادیث میں وارد ہوئے ہیں مگر اس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

علامہ عینیؒ نے کہا ہے کہ منی فی نفسہ نجس ہے کیونکہ اس کے بارے ''أذی'' کا لفظ اسی طرح آیا ہے جیسے جوتے کے نیچے نجاست لگنے پر ''أذی'' کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ①

علامہ نوویؒ اس مسئلے میں اختلاف ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام قفالؒ نے ''شرح التلخیص'' میں کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضلات پاک ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔

علامہ نوویؒ یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں: ''یہ خراسان کے شیخ ہیں اور ان پر فتوے کا مدار ہے۔'' پھر اس پر فریقین کے دلائل کا مختصراً ذکر کر کے لکھتے ہیں:

«والصحيح عند الجمهور نجاسة الدم والفضلات وبه قطع العراقيون، وخالفهم القاضي حسين فقال: الأصح طهارة الجميع والله أعلم.» ②

---

① عمدة القاري: 145/3 ② المجموع: 234/1

”جمہور کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ خون اور فضلات نجس ہیں۔عراقی شیوخ کا یہی فیصلہ ہے اور قاضی حسینؒ نے ان کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے: زیادہ صحیح یہ ہے کہ تمام فضلات پاک ہیں۔“

علامہ نووی ؒ کا بظاہر یہی موقف معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ کی بھی یہی رائے ہے کہ آپ ﷺ کے فضلات پاک ہیں، چنانچہ فتح الباری میں رقم طراز ہیں:

«والحق أن حكمه حكم جميع المكلفين في الأحكام التكليفية إلا فيما خص بدليل، وقد تكاثرت الأدلة على طهارت فضلاته وعد الأئمة ذلك في خصائصه، فلا يلتفت إلى ما وقع في كتب كثير من الشافعية مما يخالف ذلك فقد استقر الأمر بين أئمتهم على القول بالطهارة.»[1]

”اور حق یہ ہے احکامِ شرعیہ میں آپ ﷺ کا وہی حکم ہے جو تمام مکلفین کے لیے ہے الا یہ کہ کسی دلیل سے آپ ﷺ کی تخصیص ثابت ہو۔ اور بہت سے دلائل آپ ﷺ کے فضلات کے پاک ہونے میں وارد ہیں اور ائمہ نے اسے آپ ﷺ کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ لہٰذا بہت سی کتب شافعیہ میں جو اس کے خلاف ہے اس کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے ائمہ کے مابین ان کی طہارت کا قول فیصلہ کن ہے۔“

علامہ کشمیری فرماتے ہیں:

«قد مرمني أن طهارة فضلات النبي ﷺ توجد في كتب مذاهب الأربعة، ثم لا أدري أنها منقولة عن الأئمة أم لا، إلا

---

[1] فتح الباري: 272/1 تحت باب الماء الذي يغسل به شعر الإنسان من كتاب الوضوء۔ حافظ ابن حجر کی اس وضاحت کے بعد ان کی طرف جس بات کا انتساب علامہ بنوری نے معارف السنن (98/1) میں کیا ہے وہ بالکل درست نہیں۔

أن القسطلاني نقل طهارتها عن أبي حنيفة رحمه الله تعالى بحوالة العيني ولم أجدها فيه، ولخفاء تلك المسألة لم يفصح بها البخاري في كتابه ومشى في كتابه على التسوية بينها وبين فضلات سائر الناس في أمر الطهارة والنجاسة.»» ①

''پہلے میری طرف سے یہ بات گزری ہے کہ نبی کریم ﷺ کے فضلات کے پاک ہونے کا مسئلہ مذاہب اربعہ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر میں نہیں جانتا کہ یہ ائمہ اربعہ سے بھی منقول ہے یا نہیں۔ البتہ علامہ قسطلانیؒ نے بحوالہ علامہ عینیؒ ان کی طہارت امام ابوحنیفہؒ سے نقل کی ہے مگر مجھے عینیؒ میں یہ قول نہیں ملا۔ اس مسئلے کی وضاحت نہ ہونے کے باعث ہی امام بخاریؒ نے کوئی وضاحت نہیں کی بلکہ اپنی کتاب میں انھوں نے آپ ﷺ اور تمام لوگوں کے فضلات کے پاک ونجس ہونے کے بارے میں برابری کا طریقہ اختیار کیا ہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر بھی انھوں نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف سے طہارت کا قول نقل کیا جاتا ہے مگر میں نے یہ قول نہیں پایا۔ ② بالفرض علامہ عینیؒ یا متاخرین میں سے کسی نے یہ کہا ہے کہ امام صاحب نے یہ فرمایا ہے تو یہ ثبوت کے لیے کافی نہیں تاآنکہ ظاہر الروایہ سے یا ضعیف الروایہ سے ہی سہی، اس کا ثبوت نہ پایا جائے۔

طہارتِ فضلات کے دلائل کا جائزہ:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے آنحضرت ﷺ کے فضلات کی طہارت کے دلائل کا ''فتح الباری'' میں تو ذکر نہیں کیا، صرف اتنا فرمایا ہے: یہ دلائل باکثرت ہیں۔ البتہ ''التلخيص الحبير'' میں ان دلائل کا ذکر کیا ہے۔ ہم یہاں ان دلائل کا جائزہ قارئین کرام کی خدمت میں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

---

① فيض الباري:1/239-240 ② أيضاً ص1/272

آپ ﷺ کے خون مبارک کے بارے میں روایات:

1 ..... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قریش کے ایک غلام نے رسول اللہ ﷺ کو سینگی لگائی۔ وہ آپ ﷺ کا خون مبارک لے کر گیا تو دیوار کے پیچھے جا کر اسے پی لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے منہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''تم پر افسوس ہے! تم نے خون سے کیا کیا؟'' اس غلام نے کہا: میں نے دیوار کے پیچھے اسے غائب کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہاں غائب کیا ہے؟'' تو اس نے کہا: میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اسے زمین پر گراؤں، میں نے اُسے اپنے پیٹ میں انڈیل لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ تم نے اپنے آپ کو آگ سے بچا لیا۔''

حافظ ابن حجرؒ نے ہی ذکر کیا ہے کہ اسے امام ابن حبان رحمہ اللہ نے "المجروحین" ① میں نقل کیا ہے: اس کا راوی نافع ابو ہرمز حضرت عطاء رحمہ اللہ کے واسطے سے ایک من گھڑت نسخہ روایت کرتا ہے، اس میں ایک یہ روایت بھی ہے۔ امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے کذاب کہا ہے۔ ②

گویا نافع ابو ہرمز کذاب کا بنایا ہوا یہ قصہ ہے۔ امام دارقطنیؒ اور امام ابو حاتم نے اسے متروک، امام نسائی نے لیس بثقة کہا ہے۔ ③

علامہ ابن جوزیؒ نے اسے "لا یصح" ④ اور علامہ ابن الملقنؒ نے "ضعیف جدا" کہا ہے۔ ⑤

2 ..... حافظ ابن حجر نے اس سلسلے میں دوسری حدیث سالم بن ابی ہند الحجام رضی اللہ عنہ کی ذکر کی ہے جسے ابو نعیم نے "معرفة الصحابه" ⑥ میں ذکر کیا ہے۔ سالمؓ فرماتے ہیں

---

① المجروحین: 59/3 ② التلخیص: 31/1
③ لسان المیزان: 146/6، الموضوعات: 215/3
④ العلل المتناهية: 181/1 ⑤ البدر المنیر: 474/1
⑥ معرفة الصحابه 134/3

کہ میں نے آپ ﷺ کو سینگی لگائی اور سینگی میں جمع شدہ خون پی لیا اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے وہ خون پی لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر افسوس ہے! تمھیں معلوم نہیں کہ خون حرام ہے آئندہ ایسا نہ کرنا۔'' ①

حافظ ابن حجر نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کی سند میں ابوالجحاف ہے اور اس میں کلام ہے۔ ابوالجحاف کا نام داود بن ابی عوف ہے اور وہ مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب میں کہا ہے:

«صدوق شيعي ربما أخطأ من السادسة.» ②

''وہ صدوق ہے، شیعہ ہے، بسا اوقات غلطی کرتا ہے اور چھٹے طبقے کا ہے۔''

اس لیے اس حدیث کو حسن درجے کی تسلیم کیا جائے تو بھی اس میں انقطاع کی علت پائی جاتی ہے کیونکہ خود حافظ ابن حجر نے ''تقریب'' کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''طبقۂ سادسہ کے راویوں کی کسی صحابی سے ملاقات ثابت نہیں۔'' مزید یہ کہ موسیٰ بن عبدالرحمٰن کے حالات تتبع کے باوجود نہیں مل سکے، اس لیے یہ روایت اپنے ضعف کے باوجود مسئلہ زیر بحث کے حق میں استدلال کے قابل نہیں اور نہ یہ روایت خون کے پینے کی تحسین اور خون کے طاہر ہونے کی دلیل ہے بلکہ ((ويحك! أما علمت أن الدم حرام، لا تعد.)) کے الفاظ اس کے حرام ہونے اور آئندہ اسے پینے کی ممانعت پر صریح دلیل ہیں۔

3..... حافظ ابن حجر نے تیسری حدیث بحوالہ بزار، ابن ابی خیثمہ اور شعب الایمان للبیہقی حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سینگی لگوائی، پھر فرمایا کہ جانوروں، پرندوں اور لوگوں سے بچانے کے لیے خون کو دفن کر دو۔ میں آپ ﷺ سے دور گیا اور اسے پی لیا۔ میں نے خون کے پینے کا آپ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ ہنس پڑے۔

---

① التلخيص: 30/1

② التقريب ص: 94

حافظ ابن حجر ؒ اس روایت کو ذکر کر کے بالکل خاموش رہے ہیں، صحت یا ضعف کا کوئی حکم نہیں لگایا۔ حالانکہ اس کا دارومدار ابراہیم بن عمر بن سفینہ پر ہے۔ حافظ ابن جوزیؒ نے العلل المتناہیہ ① میں اسے ذکر کیا ہے اور ابن حبان کا اس پر کلام نقل کیا ہے:

«لا يحل الاحتجاج بابراهيم بن عمر.»

"ابراہیم سے استدلال درست نہیں ہے۔"

بلکہ ان کا پورا کلام یہ ہے:

«يخالف الثقات في الروايات، يروي عن أبيه ما لايتابع عليه من رواية الثقات، فلا يحل الاحتجاج بخبره بحال.» ②

"وہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہے۔ اپنے باپ سے ایسی روایات بیان کرتا ہے کہ ثقات اس کی متابعت نہیں کرتے، اس لیے اس کی حدیث سے کسی صورت استدلال درست نہیں۔"

امام ابن حبانؒ نے اس کے ترجمے میں یہ روایت ذکر کی ہے۔ علامہ ابن الملقن نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ③ امام دارقطنیؒ نے بھی اسے الضعفاء و المتروکین میں ذکر کیا ہے۔ ④

تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر ؒ نے "التلخیص" میں اس روایت پر خاموشی اختیار کی ہے مگر "تقریب" ⑤ میں اسی راوی کو مستور قرار دیا ہے۔ اس کا لقب بُرَیْہ ہے۔ بعض نے اس کا نام ہی بُریہ قرار دیا ہے۔ خود حافظ ابن حجرؒ نے "لحم حباری" کی روایت، جو اسی کے واسطے سے ہے، کو ضعیف کہا ہے۔ ⑥

علامہ بوصیریؒ نے بھی کہا ہے کہ بعض راوی مجہول ہونے کی وجہ سے اس کی سند مجہول ہے۔ ⑦

---

① العلل المتناهيه:1/180 ② المجروحين:1/11 ③ البدر المنير:1/480 ④ الضعفاء والمتروكين:101 ⑤ التقريب:ص 22 ⑥ التلخيص: 4/154 ⑦ اتحاف الخيرة: 7/29

بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اس کی سند مجہول ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ البانی کی "الضعیفة" ① ملاحظہ ہو۔ اس لیے علامہ ہیثمیؒ نے طبرانی کے حوالے سے نقل کر کے جو اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے، قطعاً درست نہیں۔ ② ولـلـتـفـصـيـل موضع آخر.

4...... حافظ ابن حجرؒ نے چوتھی حدیث حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بحوالہ بزار، طبرانی، حاکم اور بیہقی وغیرہ نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگی لگوائی، مجھے سینگی کا خون دیا اور فرمایا: "جاؤ اسے غائب کر دو۔" میں گیا تو میں نے اسے پی لیا۔ جب واپس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نے کیا کیا ہے؟" میں نے عرض کیا: میں نے اسے غائب کر دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شاید تم نے اسے پی لیا ہے؟" میں نے عرض کیا: جی ہاں، میں نے اسے پی لیا ہے۔ ③

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "اس کی سند میں ہنید بن قاسم ہے جو "لا بـأس به" لیکن "مشهور بالعلم" نہیں ہے۔" ابن حبانؒ نے "الثقات" ④ میں اسے ذکر کیا ہے۔ اور حافظ ذہبیؒ نے کہا ہے: مجھے اس کے بارے میں جرح معلوم نہیں۔ ⑤

علامہ بوصیریؒ اور علامہ سیوطیؒ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ ⑥

مگر ان کی یہ تحسین محلِ نظر ہے۔ ابن حبان کا "ثقات" میں ذکر کرنا اس کے ثقہ ہونے کی قابلِ اعتماد دلیل نہیں، خود حافظ ابن حجر نے "لسـان الـمـيـزان" ⑦ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن ملقنؒ نے کہا ہے: "لا يعلم له حال." "اس کا حال معلوم نہیں۔" ⑧

---

① الضعيفة: 1074 ② مجمع الزوائد: 270/8
③ التلخيص: 30/1 ④ الثقات: 515/5 ⑤ السير: 366/3
⑥ اتحاف الخيرة: 91/2، الخصائص الكبرى: 320/3
⑦ لسان الميزان: 14/1 ⑧ البدر المنير: 476/1

بلکہ انھوں نے علامہ ابن دقیق العید کی "الإلمام" ① سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "ہنید بن قاسم کے علاوہ اس کی سند میں کوئی اور نہیں جس کا حال محتاجِ بیان ہو۔" اس لیے وہ مجہول الحال ہے۔

علامہ ہیثمی نے ایک جگہ (ابن حبان کی متابعت میں) اسے ثقہ کہہ دیا ہے۔ ②

جب کہ دوسرے مقام پر اسے مجہول کہا ہے۔ ③

امام بخاری رحمہ اللہ نے "التاریخ الکبیر" ④ اور امام ابن ابی حاتم نے "الجرح و التعدیل" ⑤ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

اس لیے اس راوی کی توثیق ثابت نہیں بلکہ وہ مجہول الحال ہے، لہٰذا یہ روایت بھی ضعیف ہے۔

5۔ حافظ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث (حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بجائے) حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق سے طبرانی اور دارقطنی میں ہے مگر اس میں علی بن مجاہد ضعیف ہے۔ ⑥

عرض ہے کہ یہ راوی ضعیف نہیں بلکہ متروک ہے جیسا کہ خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التقریب" ⑦ میں کہا ہے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے شیوخ میں اس سے زیادہ اور کوئی ضعیف نہیں ہے۔

مزید برآں اس کا استاد رباح النوبی مجہول ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

««لينه بعضهم ولا يدرى من هو.»» ⑧

"بعض نے اسے کمزور کہا ہے، حالانکہ معلوم نہیں یہ کون ہے۔"

یہی کچھ حافظ ابن حجر نے "لسان المیزان" ⑨ میں کہا ہے۔

---

① الإلمام: 385/3 ② مجمع: 270/8 ③ مجمع: 28/1
④ التاريخ الكبير: 248/8 ⑤ الجرح والتعديل: 121/9
⑥ التلخيص: 31/1 ⑦ التقريب ص: 248
⑧ ميزان: 38/2 ⑨ لسان الميزان 443/2

6.....حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جزء الغطریف، طبرانی اور ابونعیم کے حوالے سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی ہے اور اس پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ ①

البتہ علامہ علی متقی نے ''کنز العمال'' ② میں کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ کیسان مولی ابن الزبیر کا ترجمہ تتبع بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس کا شاگرد سعد ابو عاصم جو سعد بن زیاد ہے، امام ابوحاتم ③ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

«یکتب حدیثه ولیس بالمتین.» ④

تنہا ابن حبان نے الثقات ⑤ میں اسے ذکر کیا ہے۔ ⑥

ایسے راوی کی روایت قابلِ استشہاد تو ہوتی ہے استدلال کے قابل نہیں ہوتی۔

7.....المستدرك للحاكم ⑦ اور المعجم الكبير للطبراني ⑧ میں ہے کہ غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہوئے تو مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون چوس لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو چاہتا ہے کہ ایسے شخص کو دیکھے جس کے خون میں میرا خون ملا ہوا ہے وہ مالک بن سنان کو دیکھ لے۔'' یہ روایت معجم الصحابة للبغوي ⑨ اور ابونعیم کی ''معرفة الصحابة'' میں منقول ہے۔ امام حاکم نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے مگر علامہ ذہبی نے ''تلخيص المستدرك'' میں یہ کہہ کر اس کی کمزوری واضح کر دی ہے کہ ''إسناده مظلم'' اس کی سند تاریک ہے۔ کیونکہ ام سعید بنت مسعود اور ام عبدالرحمن بنت ابی سعید دونوں مجہول ہیں، ان کا کہیں اتا پتا نہیں ملا۔ شیخ مقبل بن ہادی رحمہ اللہ بھی ''رجال الحاكم في المستدرك'' میں ان کے بارے میں

---

① التلخيص: 31/1
② كنز العمال 469/13
③ الجرح والتعديل: 13/4
④ ميزان: 121/2
⑤ الثقات: 378/6
⑥ لسان: 16/3
⑦ المستدرك للحاكم: 563/3
⑧ المعجم الكبير للطبراني
⑨ معجم الصحابة للبغوي: 2085

خاموش ہیں۔ علامہ ابن ملقن نے کہا ہے:

"فيه مجاهيل، لا أعرفهم بعد الكشف عنهم." ①

''اس میں کئی مجہول ہیں، تلاش کے باوجود میں انھیں نہیں پہچانتا۔''

اس روایت کی ایک اور سند "المعجم الأوسط للطبراني" ② اور ابونعیم کی "معرفة الصحابة" ③ میں ہے مگر اس میں مصعب بن اسقع کو تنہا ابن حبان نے "الثقات" ④ میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ امام بخاری اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے۔ اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ تنہا ابن حبان کی توثیق معتبر نہیں۔ اس کا استاد ربیح بن عبدالرحمن بن ابی سعید الخدری ''مقبول'' ہے۔ ⑤

ابن حبان نے اسے "الثقات" میں ذکر کیا ہے اور ابن عدی نے "أرجو أنه لا بأس به" کہا ہے جب کہ امام بخاری نے منکر الحدیث، امام احمد نے "رجل ليس بمعروف" اور ابوزرعہ نے "شيخ" کہا ہے۔ ⑥

قارئین کرام! رسول اللہ ﷺ کا خون پینے والوں کے حوالے سے روایات آپ کے سامنے ہیں۔ ان میں کوئی روایت بھی ایسی نہیں جو حسن یا صحیح ہو۔ اگر ان تمام کے مجموعے سے اس کی اصل تسلیم بھی کر لی جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ کے تمام فضلات پاک ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کیا، عام انسان کا خون راجح قول کے مطابق انسان کی تکریم اور عظمت کی بنا پر حرام ہے۔ اس کا حرام ہونا نجس ہونے کی وجہ سے نہیں الّا یہ کہ وہ سبیلین سے نکلے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: مسلمان ہمیشہ سے اپنے زخموں میں نماز پڑھتے تھے۔ امام طاؤس، محمد بن علی، عطاء

---

① البدر المنير: 481/1 ② المعجم الأوسط للطبراني: 41,40/10

③ معرفة الصحابة: 2456/5

④ الثقات: 173/9 ⑤ تقريب ص:100

⑥ تهذيب: 238/3، ميزان:38/2

اور اہل حجاز نے کہا ہے: خون نکلنے سے وضو کی ضرورت نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ، ابن عمر، سعید بن جبیر، سعید بن مسیب رضی اللہ عنہم، فقہائے سبعہ مدینہ طیبہ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہوئے تو ان کا خون بہہ رہا تھا اور وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع میں صحابی کو تیر لگا، خون بہتا رہا اور وہ نماز پڑھتے رہے۔ خون نجس ہوتا تو اس کے نکلنے سے نہ وضو رہتا نہ ہی نماز جائز ہوتی۔ ①

اس لیے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پینا ثابت ہو جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ پینے والے نے نجس سمجھنے کے باوجود اسے پیا تھا۔ اکثر روایات میں خون کو دفن کر دینے کا حکم بھی اسی بات کا مُشعر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دم مبارک نجس نہیں تھا۔ یہ حکم بھی احتراماً تھا تاکہ جانور اور پرندے اسے نہ کھائیں۔

شُربِ بول کی روایات:

اس بارے میں سب سے مشہور روایت حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں ایک جانب پڑے برتن میں پیشاب کیا۔ میں رات کو اٹھی مجھے پیاس لگی تھی میں نے پیشاب کو لاشعوری طور پر پی لیا:

««فشربت ما فيها وانا لا أشعر.»»

جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امّ ایمن جاؤ اس برتن میں موجود پیشاب کو بہا دو۔ میں نے عرض کیا: اللہ کی قسم میں نے تو وہ پی لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوب ہنسے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں مبارک ظاہر ہو گئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارا پیٹ کبھی درد نہیں کرے گا۔ یہ روایت طبرانی کبیر ②، حاکم ③، الحلیہ ④، دلائل النبوۃ لأبی نعیم ⑤ وغیرہ کتب میں منقول ہے۔

---

① تحفة الأحوذي: 90/2
② طبراني كبير: 90,89/25
③ حاكم: 64,63/4
④ الحلية: 67/2
⑤ دلائل النبوة لأبي نعيم: 444/7، اطراف الغرائب للدارقطني: 388/5

مگر یہ روایت سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کا ایک راوی ابو مالک عبدالملک بن حسین النخعی متروک ہے۔ ①

اور اس کے دوسرے راوی نبیح بن عبداللہ العنزی کی امّ ایمن رضی اللہ عنہا سے ملاقات کا ثبوت محل نظر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"لم یلق ام ایمن." ②

"اس کی ملاقات ام ایمنؓ سے نہیں۔"

مگر الاصابہ ③ میں انھوں نے ملاقات کو راجح قرار دیا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ابن السکن سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ امّ ایمن مولاۃ النبی ﷺ اور ہیں اور ان کا انتقال آنحضرت ﷺ کے انتقال کے چھ ماہ بعد ہو گیا تھا اور ایک امّ ایمن مولاۃ ام حبیبہ ہیں، جن کا انتقال بعد میں ہوا تھا۔ جب یہ احتمال موجود ہے تو نبیح کا ام ایمن سے سماع مشکوک ہے۔ امام دارقطنی نے العلل ④ میں اسے مضطرب قرار دیا ہے۔

دوسری سند:

حضرت ام ایمن ہی سے متعلق یہی روایت حافظ ابن حجرؒ نے المطالب العالیہ ⑤ میں اور علامہ بوصیریؒ نے اتحاف الخیرہ ⑥ میں ابو یعلی سے نقل کی ہے۔ علامہ سیوطی نے اسے امام دارقطنیؒ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ ⑦ مگر یہ سند بھی درست نہیں الحسن بن حرب کا تذکرہ تتبع بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ الحسن بن حرب سے یہ روایت سلم بن قتیبہ نے بیان کی ہے۔ اور حسن اسے یعلی بن عطاء عن الولید بن عبدالرحمٰن عن ام ایمن کی سند سے روایت کرتا ہے۔ امام دارقطنی نے العلل ⑧ میں ذکر کیا ہے کہ سلم بن قتیبہ اور قرۃ بن عبدالرحمٰن اسے ابو مالک عن یعلی بن عطاء عن الولید سے

① تقریب ص: 424
② التلخیص: 31/1
③ الاصابہ: 433/4
④ العلل: 415/15
⑤ المطالب العالیہ: 3823
⑥ اتحاف الخیرہ: 92/7
⑦ الخصائص: 252/2
⑧ العلل: 581/15

روایت کرتے ہیں۔ گویا سلم کبھی حسن بن حرب سے اور کبھی ابو مالک سے روایت کرتے ہیں۔اس لیے یہ روایت اس اضطراب کی وجہ سے بھی ضعیف ہے۔

ابن السکن ؒ نے بھی اسے ابو مالک عبدالملک بن حسین عن نافع بن عطاء عن الولید کی سند سے ہی روایت کیا ہے ① اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: "فغلطت فشربتها" میں نے غلطی سے پی لیا۔جیسا کہ پہلی سند میں "فشربت ما فیها وانا لا أشعر" کے الفاظ ہیں کہ میں نے اس پیالے میں جو تھا لاشعوری طور پر پی لیا۔جس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام ایمنؓ نے اگر پیشاب پیا ہے تو اسے پاک سمجھ کر نہیں پیا اور اس عمل کو وہ غلطی پر محمول کرتی ہیں۔اس لیے غلط عمل طہارت کی دلیل نہیں۔

رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''تیرے پیٹ میں درد نہیں ہوگا۔'' تو یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے اسے شفاء بنا دیا۔کبھی نجس چیز بھی شفاء بن جاتی ہے مگر یہ اس کے پاک ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

دوسری حدیث:

حضرت امیمۃ بنت رُقیقۃ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کھجور کے بنے ہوئے برتن میں پیشاب کرتے تھے،وہ برتن آپ ﷺ کی چارپائی کے نیچے رکھ دیا جاتا تھا۔ایک دفعہ حسب معمول آپ نے اس میں پیشاب کیا پھر آپ تشریف لائے پیالے کو دیکھا تو اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔آپ ﷺ نے ایک عورت سے، جسے ''برکہ'' کہا جاتا تھا،فرمایا: پیالے میں موجود پیشاب کہاں ہے۔اس نے عرض کیا میں نے پی لیا ہے۔ایک روایت میں ہے کہ مجھے پیاس لگی تھی "وانا لا اعلم" اور میں نہیں جانتی تھی (کہ وہ پیشاب ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اپنے آپ کو جہنم سے بچا لیا۔

---

① الاصابۃ: 289/7

یہ روایت ابوداؤد، نسائی ①، الحاکم ②، بیہقی ③، ابن حبان، طبرانی ④، الآحاد والمثانی ⑤، بیہقی ⑥، الاستیعاب ⑦، المعرفۃ لابی نعیم ⑧ وغیرہ میں "حجاج بن محمد عن ابن جریج قال حدثتنی حکیمه بنت امیمة عن امها" کی سند سے مطولاً ومختصراً منقول ہے۔ اوّلاً تو یہ سند صحیح نہیں حکیمہ بنت امیمہ کے بارے میں خود حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے: "لا تعرف"۔ ⑨

البتہ امام ابن حبانؒ نے الثقات میں اسے ذکر کیا ہے۔ امام دارقطنیؒ نے ان کی ایک روایت کو الالزامات ⑩ میں ذکر کیا ہے، اسی بنا پر بعض نے اس کی سند کو حسن جید کہا ہے حتیٰ کہ شیخ البانیؒ نے بھی اسے حسن الاسناد کہہ دیا ہے۔ ⑪ اور فرمایا ہے کہ "حکیمۃ کو ابن حبانؒ نے الثقات میں ذکر کیا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ خواتین میں سے میں نے کسی کو متہم ومتروک نہیں پایا۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے ان کی موافقت کی ہے۔" مگر اتنی سی بات سے اس کی سند حسن قرار نہیں دی جاسکتی، خود علامہ البانیؒ نے متعدد مقامات پر فرمایا ہے کہ تنہا ابن حبانؒ کا ثقات میں ذکر کرنا راوی کی توثیق کے لیے کافی نہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے کہا ہے کہ حکیمۃ سے تنہا ابن جریج روایت کرتے ہیں۔ یہی بات حافظ ابن حجرؒ نے بھی کہی ہے۔ ⑫ یعنی وہ مجہول العین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے: "لا تعرف" وہ معروف نہیں۔ ⑬ اور کتنے مجاہیل ہیں جن کی اسناد کو امام حاکمؒ نے صحیح الاسناد کہا ہے۔

---

① ابوداؤد: 24 ، نسائی
② الحاکم: 167/1
③ بیہقی 99/1
④ ابن حبان طبرانی: 189/24
⑤ الآحاد والمثانی: 121/6
⑥ بیہقی: 67/7
⑦ الاستیعاب: 356/4
⑧ المعرفة لابی نعیم: 67/6
⑨ تقریب ص: 467
⑩ الالزامات والتتبع ص 114
⑪ سنن أبي داؤد 53/1
⑫ میزان ج: 606/4، الاصابة: 166/13
⑬ تقریب: 467

اور حافظ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ مگر علامہ البانیؒ ان سے متفق نہیں ہیں۔
خواتین کی روایات ہی دیکھیے ''ام بکر'' کے بارے میں الصحیحہ ① میں اور ''ام حبیبہ'' کے بارے میں بھی الصحیحہ ② میں کہا ہے کہ امام حاکمؒ نے ان کی حدیث کو صحیح الاسناد کہا اور حافظ ذہبیؒ نے ان کی موافقت کی ہے، حالانکہ خود علامہ ذہبیؒ نے ان کی طرف '' مجھولة '' ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ ہم بھی یہی عرض کرتے ہیں کہ علامہ ذہبی نے حکیمہ کی طرف مجہولہ ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ اس لیے اس کی سند حسن یا صحیح کیسے ہوسکتی ہے؟ شارح ابوداود، محدث ڈیانوی نے حافظ ذہبیؒ کا کلام میزان سے اور حافظ ابن حجرؒ کا الاصابہ سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: '' مفاد کلامهما انها مجهولة '' کہ ان دونوں کے کلام کا فائدہ یہ ہے کہ وہ مجہولہ ہے۔ ③

علامہ ابن قطانؒ نے بھی کہا ہے کہ امام دارقطنیؒ کی طرف اس کی تصحیح کی نسبت صحیح نہیں کیونکہ انھوں نے حکیمہ کی تعدیل وتجریح کا کوئی حکم نہیں لگایا:

«فالحديث متوقف الصحة على العلم بحال حكيمة، فإن ثبت ثقتها ثبتت روايتها وهي لم تثبت.» ④

''لہٰذا حدیث کی صحت حکیمہ کا حال معلوم ہونے پر موقوف ہے، اگر ثابت ہوجائے کہ وہ ثقہ ہے تو اس کی روایت ثابت ہے، مگر یہ توثیق ثابت نہیں۔''

علامہ مناویؒ نے بھی اقتفاء السنن سے نقل کیا ہے کہ '' اس کی تضعیف نہیں کی گئی حالانکہ یہ ضعیف ہے کیونکہ حکیمہ مجہولہ ہے۔'' ⑤

علامہ ابن قطانؒ کا مفصل کلام بیان الوہم والایہام ⑥ میں دیکھا جاسکتا ہے۔
اس لیے اس کی سند کو جید یا صحیح کہنا محل نظر ہے۔

---

① الصحيحة: 1995 ② الصحيحة: 1673
③ غاية المقصود: 150/1 ④ البدر المنير: 486/1
⑤ فيض القدير: 187/5 ⑥ الوهم والايهام: 514/5، رقم: 2756

ثانیاً: حلیمہؒ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی کہا ہے: "من السادسة" کہ یہ چھٹے طبقہ کی راویہ ہے۔ اور مقدمہ تقریب میں حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس طبقہ کے راویوں کا صحابہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس لیے حلیمہؒ کا اپنی والدہ اُمیمہؓ بنت رُقیقہ سے سماع بھی صحیح نہ ہوا اور روایت منقطع ہوئی۔

ثالثاً: حضرت ام ایمنؓ کی روایت کی طرح اس حدیث میں بھی ہے کہ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ پیشاب ہے۔ پیاس کی شدت سے پانی سمجھ کر پی گئیں۔ اس میں یہ قطعاً ثابت نہیں کہ انھوں نے پیشاب سمجھتے ہوئے قصداً اُسے پیا تھا۔

تیسری حدیث:

علامہ سیوطیؒ نے الخصائص میں بحوالہ عبدالرزاق عن ابن جریج ذکر کیا ہے کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لکڑی کے پیالے میں پیشاب کرتے تھے پھر اسے چارپائی کے نیچے رکھ دیتے تھے۔ ایک روز آپ تشریف لائے تو دیکھا پیالے میں کچھ بھی نہیں تو آپ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ برکہ سے پوچھا: پیالے میں پیشاب پڑا تھا کہاں گیا؟ تو اس نے عرض کیا میں نے پی لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھیں صحت نصیب ہو۔ چنانچہ مرض الموت کے علاوہ وہ کبھی بیمار نہ ہوئی۔ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ ① اور التلخیص ② میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر ابن جریج اس میں مدلس ہیں وہ ارسال بھی کرتے تھے۔ ③ اس لیے یہ سند بھی صحیح نہیں۔ اوپر دوسری حدیث کی سند میں گزرا ہے کہ تقریباً یہی روایت ابن جریجؒ، حلیمہؒ سے اور وہ اپنی والدہ امیمہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ابن جریجؒ کبھی اسے بالاسناد اور کبھی ارسالاً روایت کرتے ہوں۔ مسند روایت میں حلیمہؒ مجہولہ ہیں اور اس کا اپنی والدہ سے سماع بھی محل نظر ہے۔ اس لیے یہ روایت بہر نوع ضعیف ہے۔

---

① الاصابہ: 27/8 ② تلخیص: 31/1 ③ تقریب، ص: 219

آنحضرت ﷺ نے اپنے بال مبارک خود تقسیم کرنے کا حکم فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے بال مبارک سنبھال کر رکھتے تھے۔ امام ابن سیرین نے عبیدہ بن عمرو سے کہا کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے بال مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ملے تھے۔ یہ سن کر عبیدہ نے کہا: اگر میرے پاس آپ ﷺ کا بال مبارک ہوتا تو وہ میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوتا۔ ①

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک اور ناخن مبارک تھے۔ فوت ہونے سے پہلے فرمایا کہ میرے فوت ہو جانے پر یہ میرے منہ اور ناک میں رکھ دینا۔ ②

مگر آپ ﷺ کا پیشاب جس نے پیا لاعلمی میں پیا نہ کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم کیا، نہ ہی صحابہ کرام نے تبرک رکھا۔ اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس نے آپ ﷺ کے موئے مبارک اور پیشاب کو ایک ہی پلڑے میں رکھا اس نے ظاہر باہر خطا کھائی ہے۔

کیا زمین آپ ﷺ کا بول و براز نگل لیتی تھی؟

آپ ﷺ کے فضلات کے بارے میں یہ بھی تاثر دیا جاتا ہے کہ زمین انھیں نگل لیتی تھی۔ اس بارے میں بھی چند روایات سے استدلال کیا گیا ہے:

پہلی حدیث:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء جاتے۔ آپ ﷺ کے بعد میں وہاں جاتی تو وہاں کوئی چیز نہ دیکھتی، میں نے اس کا ذکر آپ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ رضی اللہ عنہا! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہمارے جسم اہل جنت

---

① صحیح بخاری: 170
② البدایہ: 182/8 وغیرہ

کی ارواح پر بنے ہیں۔ان سے جو کچھ نکلتا ہے زمین اسے نگل لیتی ہے۔

یہ حدیث المجروحین لابن حبان، تاریخ بغداد، دلائل النبوۃ للبیہقی، العلل المتناہیہ وغیرہ میں "الحسین بن علوان ثنا هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة" کی سند سے منقول ہے۔ ① ابن حبانؒ نے اسے موضوع اور بے اصل قرار دیا ہے۔امام بیہقیؒ نے بھی کہا ہے:

«هذا من موضوعات الحسين لا ينبغي ذكره ففي الاحاديث الصحيحة المشهورة من معجزاته كفاية عن كذب ابن علوان.» ②

"یہ حسین بن علوان کی من گھڑت روایات میں سے ہے اس کا ذکر مناسب نہیں۔ آپ ﷺ کے معجزات کے بارے میں صحیح مشہور احادیث ابن علوان کے جھوٹ سے کافی ہیں۔"

اس کے بعد حسین بن علوان کے بارے میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔اس کذاب ووضاع کا ترجمہ شائقین میزان ③ اور لسان المیزان ④ میں ملاحظہ فرمائیں۔ہم بلاوجہ تطویل مناسب نہیں سمجھتے۔

اس کی دوسری سند:

حضرت عائشہ ؓ سے یہی روایت طبقات ابن سعد ⑤، دلائل النبوۃ لأبی نعیم ⑥ میں "اسماعيل بن ابان الوراق ⑦ حدثنا عنبسة بن عبدالرحمن

① المجروحين لابن حبان: 245/1، تاريخ بغداد: 62/8، دلائل النبوة للبيهقي: 70/6، العلل المتناهيه: 182/1

② دلائل النبوة: 70/6، شرح الشفاء للقاري: 360/1 ③ ميزان: 543/1

④ لسان الميزان: 300/2 ⑤ طبقات ابن سعد: 170/1

⑥ دلائل النبوة لابي نعيم: 444,443/2 ⑦ ابن سعد میں الفضل بن اسماعیل بن ابان الوراق ہے جبکہ ابونعیم میں اسماعیل بن ابان ہے اور یہی صحیح ہے۔

القرشي عن محمد بن زاذان عن ام سعد عن عائشة" کی سند سے منقول ہے۔مگر یہ سند بھی سخت ضعیف ہے۔اختصاراً عرض ہے کہ عنبسہ بن عبدالرحمٰن قرشی اموی کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

«متروك رماه ابو حاتم بالوضع.» ①

"یہ متروک ہے اور ابوحاتم نے اسے حدیث گھڑنے سے متہم کیا ہے۔"

اس کا استاد محمد بن زاذان بھی متروک ہے۔ ②

رہی ام سعدؓ تو اس کی بھی توثیق ثابت نہیں۔اس لیے یہ سند بھی سخت ضعیف ہے اور متروک ومجہول راویوں پر مشتمل ہے۔

تیسری سند:

علامہ سیوطیؒ نے اسی موضوع سے متعلق ایک روایت امام ابونعیمؒ سے "عبد الكريم الخراز حدثنا ابو عبدالله المديني عن مولاة عائشة" کی سند سے روایت کی ہے۔ یہ روایت ابونعیم کی اخبار اصبہان ③ میں بھی مذکور ہے جس میں یہ بھی بیان ہے "مولاۃ عائشہؓ" کا نام لیلیٰ ہے۔

علامہ ابن عبدالبرؒ نے الاستیعاب میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں بھی لیلیٰ مولاۃ عائشہ کے ترجمے میں اسے ذکر کیا ہے۔گویا یہ لیلیٰ مولاۃ عائشہ سے ہے حضرت عائشہؓ سے نہیں۔مگر یہ سند بھی ناقابلِ اعتبار ہے۔علامہ ابن عبدالبرؒ نے کہا ہے:

«حديثها ليس بقائم الاسناد روى عنها ابو عبدالله المدني وهو مجهول.» ④

"اس کی سند قائم نہیں اس سے ابوعبداللہ المدنی روایت کرتا ہے اور وہ مجہول ہے۔"

---

① تقریب، ص: 266 ② تقریب، ص: 297

③ اخبار اصبہان: 176/1 ④ الاستیعاب: 463/4، الاصابۃ: 183/8

حافظ ابن حجرؒ نے بھی ابو عبداللہ کو "لسان المیزان" ① میں مجہول ہی کہا ہے۔
ابو عبداللہ کا شاگرد عبدالکریم بن عبدالرحمن الخزاز بھی ضعیف ہے۔ امام ازدیؒ فرماتے ہیں:
"ذاهب الحديث جداً" حافظ ابن حجرؒ نے اس کی مناکیر میں سے ایک منکر روایت کا
بھی ذکر کیا ہے۔ ②

حافظ ابن حجرؒ نے عبدالکریم بن عبدالرحمٰن الخزاز کا ترجمہ تہذیب ③ میں بھی ذکر کیا ہے اور انھوں نے صرف ابن حبان سے اس کی توثیق نقل کی ہے۔ اور تقریب میں اسے مقبول کہا ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ "لسان" کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے لسان میں لکھا ہے اس سے خود ان کی اصطلاح کے مطابق یہ مقبول کے درجہ سے کم ہو کر ضعیف کے درجہ میں آ جاتا ہے۔ ④

لہذا عبدالکریم ضعیف اور اس کا استاد ابو عبداللہ مجہول ہے۔ اس لیے یہ روایت بالکل ضعیف ہے۔

چوتھی سند:

امام حاکمؒ نے اسی موضوع کی ایک روایت "موسى بن عبدالرحمن المسروقي حدثنا ابراهيم بن سعد حدثنا المنهال بن عبيد الله عمن ذكره عن ليلى مولاة عائشة عن عائشة." کی سند سے بیان کی ہے۔ ⑤

اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ لیکن یہ سند بھی قابل التفات نہیں کیونکہ المنہال بن عبیداللہ کا کہیں ترجمہ نہیں ملا۔ شیخ مقبل نے بھی رجال الحاکم ⑥ میں صرف اس کا نام ہی ذکر کیا ہے۔ پھر منہال اسے "عمن ذكره" کہہ کر مبہم راوی سے روایت کرتا ہے۔ مستور کی روایت تو متابعت وشواہد میں جگہ پا لیتی ہے لیکن مجہول و مبہم راوی کی روایت

---

① لسان المیزان: 403/6
② لسان: 53/4
③ تہذیب: 373/6
④ حاشیہ لسان: 245/5
⑤ المستدرک: 71/4
⑥ رجال الحاکم: 337/2

اس قابل نہیں ہوتی۔

پانچویں سند:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی یہ روایت امام دارقطنی نے "الأفراد والغرائب" میں ذکر کی ہے اسی کے حوالے سے علامہ سیوطی نے اسے الخصائص ① میں نقل کیا ہے اور وہ اطراف الغرائب والافراد ② میں موجود ہے۔

مگر یہ سند بھی صحیح نہیں۔ علامہ ابن الجوزی نے یہی روایت العلل المتناہیۃ ③ میں ذکر کی ہے اور لکھا ہے: امام دارقطنی نے کہا ہے کہ محمد بن حسان اس میں متفرد ہے اور امام ابوحاتم نے کہا ہے کہ وہ کذاب تھا۔ اس کے ترجمہ میں یہی حدیث مذکور ہے اور حافظ ابن جوزی کے حوالے سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو میزان، لسان، المغنی، دیوان الضعفاء۔ ④

علامہ ابن عراق نے بھی تنزیہ الشریعہ ⑤ میں اسے کذابین میں شمار کیا ہے۔ [illegible] علامہ سیوطی نے کہا ہے کہ یہ سند سب سے زیادہ قوی ہے۔ [illegible] محمد بن حسان بغدادی ثقہ صالح ہے۔ مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے علامہ سیوطی [illegible] میں ہے۔ سند میں محمد بن حسان الأموی ہے۔ اسے بلا دلیل بغدادی [illegible] ہے۔ ابن دحیہ خود قابل اعتماد نہیں وہ بلا شبہ صاحب علم تھے [illegible] اپنے آپ کو حضرت دحیہ کلبی کی اولاد سے [illegible] تفصیل لسان المیزان ⑥ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [illegible] ذہبی، حافظ ابن حجر اور علامہ ابن عراق کے مقتضیٰ [illegible]

---

① الخصائص 176/1 ② اطراف الغرائب والافراد [illegible]

③ العلل المتناهية 182/1

④ ميزان 512/3، لسان 121/5، المغنى 566/2، ديوان الضعفاء [illegible] 267

⑤ تنزيه الشريعه 102/1 ⑥ ميزان 40/ 292، 293

چھٹی سند:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا میں نے چاہا کہ شاید اللہ تعالیٰ آپ کے پیٹ مبارک سے نکلنے والی چیز مجھے دکھا دے تو میں اسے کھا لوں۔ میں نے دیکھا کہ زمین صاف سفید ہے۔ میں نے عرض کیا آپ نے وضو نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: ''ہاں لیکن ہم انبیاء کے فضلات کے بارے میں زمین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انھیں چھپا لے۔'' ①

علامہ سیوطیؒ نے الخصائص ② میں اسے خطیب بغدادیؒ کی ''رواة مالك'' سے نقل کیا ہے۔ مگر یہ روایت سخت منکر ہے۔ علامہ ذہبیؒ نے فرمایا ہے:

""اسحاق بن الصلت اتى عن مالك بخبر منكر جداً والاسناد إليه مظلم ذكره الخطيب في كتاب من روى عن مالك."" ③

''اسحاق بن صلت، امام مالکؒ سے ایک نہایت منکر روایت ذکر کرتا ہے جس کی سند اس تک مظلم ہے۔ اسے خطیب نے اپنی کتاب ''من روى عن مالك'' میں بیان کیا ہے۔''

بلکہ خود علامہ سیوطیؒ نے ذیل اللآلی ④ میں یہی روایت ذکر کی ہے اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ کا یہ کلام نقل کر کے اس کا موضوع ہونا بیان کر دیا ہے۔ علامہ ابن عراقؒ نے کہا ہے کہ علامہ سیوطیؒ اس میں تناقض کا شکار ہوئے ہیں۔ الخصائص میں تو انھوں نے کہا ہے کہ میں موضوعات سے گریز کروں گا مگر ذیل الموضوعات میں ذکر کیا ہے۔ الخصائص میں ذکر کرنا

---

① تاریخ جرجان، ص: 526

② الخصائص: 2/187، اس کی طرف اشارہ علامہ سیوطی نے: 1/177 میں بھی کیا ہے۔

③ میزان: 1/192، لسان: 1/365 ④ ذیل اللآلی، ص: 51,10

متقاضی ہے کہ یہ موضوع نہیں۔ ①

ایک مرسل حدیث:

علامہ سیوطی نے حکیم ترمذی کی نوادر الاصول سے حضرت ذکوان سے نقل کیا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کا سایہ نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی قضائے حاجت کے بعد اس کا کوئی اثر نظر آتا تھا۔ ②

مگر یہ روایت مرسل ہونے کے باوجود من گھڑت ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ سیوطی الخصائص میں اس کے بارے میں خاموشی سے گزر گئے مگر "مناهل الصفاء في تخريج احاديث الشفاء" میں یہ کہہ کر اس کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اس میں عبدالرحمان بن قیس وضاع، کذاب ہے اس کا استاد عبدالملک بن عبداللہ بن الرائد مجہول ہے۔ عبدالرحمان بن قیس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بھی یہی فیصلہ ہے:

«متروك كذبه أبو زرعة وغيره.» ③

"وہ متروک ہے امام ابوزرعہ وغیرہ نے اس کو جھوٹا کہا ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے اس کی مکمل سند بھی ذکر نہیں کی تاکہ معلوم ہو سکے کہ حکیم ترمذی اور عبدالرحمان بن قیس کے مابین راویوں کی کیا پوزیشن ہے۔ پھر یہ ان صحیح احادیث کے بھی معارض ہے جن میں رسول اللہ ﷺ کے سایہ کا ذکر ہے۔ جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

اسی ضروری تفصیل سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ روایات جن میں آپ ﷺ کے فضلات کو زمین کے نگل جانے کا ذکر ہے، ان میں کوئی روایت بھی کذاب، متروک اور مجہول راویوں سے خالی نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بول کے حوالے سے مروی روایات بھی کذاب اور متروک راویوں کی کارستانی ہے۔ رہا آپ ﷺ

---

① تنزيه الشريعة: 338/1

② الخصائص: 177/1، مناهل الصفاء، ص: 42، رقم: 68

③ تقريب، ص: 208

تو موئے مبارک سے تو ہم عرض کر آئے ہیں کہ اگر اس بارے میں روایت کو قابل اعتبار تسلیم کیا جائے تو اس سے فضلات کے پاک ہونے پر استدلال ہی درست نہیں کیونکہ انسانی اعضاء جس طرح پاک ہیں اسی طرح انسان کا خون بھی پاک ہے نجس نہیں۔ انسان کے جسم سے جو چیز سبیلین سے نکلتی ہے وہ ناپاک ہے۔ منی بھی ناپاک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے نجس و ناپاک ہی کہتے ہیں۔ ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہے کہ میں آپ ﷺ کے کپڑوں پر لگی منی کو پانی سے صاف کرتی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بول و براز کو پانی سے یا ڈھیلوں سے صاف کرتے تھے۔ نہ آپ ﷺ نے اپنے موئے مبارک کی طرح اپنے بول و براز صحابہ میں تقسیم کیا، نہ صحابہ کرام نے اس کی تمنا و آرزو کی، اس لیے آپ ﷺ کے بول و براز کو طاہر قرار دینا درست نہیں۔ یہی امام بخاری اور بعض دیگر اہل علم کا موقف ہے اور اسی بنا پر منی مسلمان کی طہارت کا قول محل نظر ہے۔

مولانا تھانوی کا فتویٰ

اسی مسئلے کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی سے پوچھا گیا کہ ایک واعظ نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بول و براز پاک ہوتا ہے، اور ان کے بول و براز کو زمین ہضم کر جاتی ہے۔ مولانا تھانوی صاحب نے اس کا جواب یوں فرمایا:

> نہ معلوم ان واعظ صاحب نے ایسی باتیں بیان کر کے مسلمانوں کو پریشان کیا جو عقائد ضروریہ میں سے نہیں ہیں، نہ ان پر کوئی حکم موقوف ہے۔ بیان کرنے کی چیز عقائد و احکام ہیں نہ کہ ایسی روایات جن کی اصل ہی نہیں، نہ ان کی ضرورت بھی نہیں۔ ایسی روایت بعض معتبر کتابوں میں اگر ہیں بھی تو ان کی تصدیق کیا ضروری ہے کیونکہ سند صحیح نہیں اور نہ تکذیب واجب ہے اس لیے کہ کوئی نص قطعی نہیں، اس لیے ایسے امور میں مشغول ہی نہ ہونا چاہیے نہ تصدیق نہ تکذیب۔ اور ایسے واعظوں کا وعظ ہی کیوں سنا جاتا ہے اور ان سے مطالبہ سند کا کیوں نہ کیا گیا اسی جلسہ میں حقیقت کھل جاتی۔

اس کے بعد پھر استفسار ہوا کہ یہ روایات ضعیف ہیں اور ان کی کوئی سند نہیں مگر نشر

الطیب میں یہ روایت بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کی گئی ہے۔ جواب جلد عطا فرمایئے۔ جس کے جواب میں حضرت تھانوی نے لکھا:

ضعیف بلا اسناد نہیں ہوتی بلکہ بسند ضعیف ہوتی ہے جو عقائد میں حجت نہیں فضائل میں کھپ جاتی ہے۔ میں نے تحریر سابق میں یہی لکھا ہے کہ سند صحیح نہیں تو دونوں تحریروں میں تضاد نہیں کیونکہ ضعیف کی نفی نہیں کی اور اس ضعیف سند ہی سے ایسی کتابوں کو غیر معتبر بتلایا تھا کیونکہ معتبر صحیح کو کہتے ہیں ضعیف کو نہیں کہتے۔ باقی یہ بات کہ پھر کتاب میں یوں لکھا سو کتاب تو فضائل میں ہے عقائد واحکام میں نہیں اگر شاذ ونادر ایسی بھی کوئی روایت لکھی جائے کھپت ہو جاتی ہے بخلاف وعظ کے کہ وہ عقائد واحکام کی تعلیم کے لیے ہوتا ہے اس میں ایسے مضامین نہیں کھپتے۔ دوسرے وعظ سننے والے اکثر کم فہم ہوتے ہیں اور کتاب پڑھنے والے اکثر فہیم۔

اضافہ: بعد تحریر جواب ہذا شرح الشفاء ملا علی قاری میں یہ بحث نظر سے گزری انھوں نے فصل نظافت جسم نبوی میں اس پر بہت مبسوط لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بعض روایات کا تو ثبوت مقدوح ہے اور بعض کی دلالت اور بعض روایات میں شارحین کا یہ قول مذکور ہے۔ شربته وانا لا اعلم اور ایک روایت میں حضور ﷺ کا اس کے متعلق نہی فرمانا مذکور ہے اور وہ یہ ہے:

«روی ابن عبد البر ان سالم بن ابی الحجاج ... ﷺ ثم ازدرد ای ابتلع فقال اما علمت ان الدم کله ... وفی روایة لا تعد فان الدم کله حرام.

پس مسئلہ بالکل منقح ہو گیا کہ طہارت کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔» ①

مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے جو کچھ تحریر فرمایا قارئین اس پر غور فرمائیں۔ بالآخر انھوں نے واضح فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کے فضلات کی "طہارت کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔" یہی چیز

---

① بوادر النوادر، ص: 293،292، ط: ادارہ الاسلامیات لاھور

سابقہ صفحات میں ہم عرض کر آئے ہیں۔

البتہ یہاں اس بات کی طرف توجہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اوپر دونوں عبارتوں پر جو خط ہم نے کھینچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی عبارت میں ''بعض معتبر کتابوں'' کی بجائے ''بعض غیر معتبر کتابوں'' ہونا چاہیے کیونکہ دوسری عبارت میں انھیں ''غیر معتبر'' لکھا گیا ہے۔ سائل نے نشر الطیب سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بول و براز کو زمین کے ہضم کرنے کے بارے میں ہے، خون کے بارے میں نہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کذاب اور متروک راوی سے مروی ہے جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ وعظ میں بیان کی گئی ایسی روایات کو سن کر ''دوسری اقوام بھی ہنسیں'' گی۔ تو کیا سیرت کی کتاب میں پڑھ کر کوئی ہنسی نہیں اڑائے گا؟ آخر واعظ بھی تو سیرت کی کتابیں پڑھ کر ہی وعظ فرمائے گا بالخصوص جب وہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی نشر الطیب میں انھیں دیکھ لے گا۔ اگر ''ایسے واعظوں کا وعظ'' نہیں سننا چاہیے تو جس کتاب میں یہ روایات درج ہوں ان کو پڑھنا کیا ضروری ہے؟

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا کلام اسی طرح شرح شمائل ① مع نسیم الریاض میں ہے۔ مگر الاستیعاب ② میں یہ ''سالم رجل من الصحابہ'' کے ترجمہ میں مختصراً ہے۔ اس روایت کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اس فتویٰ سے بھی عیاں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کی طہارت کا موقف ''دعویٰ بلا دلیل ہے۔'' کسی قابل اعتبار روایت سے طہارت ثابت نہیں ہوتی۔

﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کسے کس طرح پیدا کرنا ہے اور کس چیز سے پیدا کرنا ہے۔ ''خلق'' کے معنی پیدا

---

① شرح شمائل: 361/1، مع نسیم الریاض

② الاستیعاب: 137/2

کرنا، بنانا ہے اور کبھی یہ ابداع کے معنی میں بھی آتا ہے، یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی تقلید کے پیدا کرنا۔ اور کبھی یہ مخلوق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ①

یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ عموماً مترجمین حضرات نے پہلے معنی مراد لیے ہیں اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو پوری طرح جانتا ہے۔ زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی، انسانوں کو بھی اور حیوانوں کو بھی، اور شجر وحجر کو بھی اور بحر و بر کو بھی۔ وہ جانتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے اعضاء اور اس کی ہڈیاں کہاں کہاں پڑی ہیں۔ اسی طرف سورۂ قٓ میں اشارہ ہے:

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ﴾ ②

''بے شک ہم جان چکے ہیں جو کچھ زمین ان میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو خوب محفوظ رکھنے والی ہے۔''

اس میں کفار کے اسی شبہ کا جواب ہے کہ انسانوں کے اجسام جب زمین میں دفن ہو کر مٹی میں مل جاتے ہیں اور مٹی انھیں کھا جاتی ہے تو وہ دوبارہ کیوں کر زندہ ہوں گے؟ اسی کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اگر یہ بات تمھاری عقل وفکر اور تمھاری معلومات سے باہر ہے تو کیا تم سمجھتے ہو یہ معلومات ہماری دسترس سے بھی باہر ہیں؟ ہرگز نہیں۔ انسان مٹی میں دفن ہو کر مٹی ہو جائے۔ اس کے اعضاء خواہ کتنے ہی پراگندہ ہو کر بکھر جائیں ہمیں ان کے بارے میں پورا پورا علم ہے، ہم جب چاہیں گے انھیں حکم دیں گے اور وہ جمع ہو کر دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہمیں ان کی خلقِ اول کی تفصیل کا بھی علم ہے اور خلقِ ثانی کا بھی۔ جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور کامل علم والا ہے تو اس کے لیے دوبارہ زندہ کرنا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے؟

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی نے موت کے قریب اپنی اولاد کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو بہت سی

---

① مفردات ② قٓ:4

لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا دینا اور مجھے اس آگ میں جلا دینا تا آنکہ آگ میں گوشت پوست جل جائے تو ہڈیوں میں سے جو باقی بچیں ان کو باریک کر کے آدھی راکھ دریا میں بہا دینا اور باقی تیز ہوا میں اڑا دینا۔ چنانچہ اولاد نے اسی طرح کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا تجھ میں اس کے جو اجزاء ہیں انھیں جمع کر دو اور ہوا کو حکم دیا: تمھارے اندر جو اجزاء ہیں انھیں جمع کر دو۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی، جب سب اجزاء جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: "کــــن" ہو جا، تو وہ جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تم نے یہ حکم اپنے بارے میں کیوں دیا تھا؟ اس نے عرض کیا: اے اللہ آپ سے ڈرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس ڈرنے کی وجہ سے معاف کر دیا۔ ①

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت حضرت حذیفہؓ سے بھی بیان کی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ کے ایک بندے کا ذکر ہوا ہے جو ایک ایسی بستی کے پاس سے گزرا جو برباد ہو چکی تھی۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اسے سو سال تک موت دے دی، پھر اسے زندہ کیا اور اس سے پوچھا کتنی دیر مرے رہے ہو؟ عرض کیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ فرمایا: بلکہ تو سو سال تک مرا رہا ہے، اپنے کھانے پینے کی اشیاء کو دیکھو وہ بگڑی نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے نشانی بنائیں، ہڈیوں کو دیکھو ہم انھیں کیسے اٹھا کر کے جوڑتے ہیں پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں پھر جب معاملہ اس کے سامنے کھل گیا تو وہ بول اٹھا:

﴿ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾ ②

"میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

اس لیے اللہ تعالیٰ انسان کے بکھرے اجزاء کو جمع کر کے زندہ کرنے پر قادر ہے۔ کفار حیات بعد الممات کے کیوں قائل نہیں تھے؟ اس عقیدہ کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے اختیار

---

① صحیح بخاری: 3478، صحیح مسلم: 2757 ② البقرۃ: 259

کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کی ضروری وضاحت ہم "تفسیر سورۂ ق" میں ذکر کر آئے ہیں۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب مناظر وہ ہے جو ایسی مضبوط دلیل پیش کرے جس کا انکار مخاطب سے ممکن نہ ہو۔ چنانچہ جھگڑالو انسان کے اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اسے وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار اسے پیدا کیا ہے۔ یہاں لفظ "أنشأ" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیدا کرنا، پرورش کرنا و پروان چڑھانا اور کسی چیز کو ایجاد کرنا جس میں اشارہ ہے کہ ہڈیوں کو بنانے والا اور بتدریج نشوونما کرنے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے۔ اور وہ جھگڑالو بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ انھیں اولاً وجود بخشنے والا رحم مادر سے لے کر جوانی تک کی ساری نشوونما کرنے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی نمرود کے سامنے یہی اسلوب اختیار کیا تھا کہ میرا رب وہ ہے جو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، تم اپنی ربوبیت کا اعلان کرتے ہو تو تم اسے مغرب سے لا کر دکھاؤ تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اس آیت مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ ہڈیوں کو بنانے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ تبھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی قدرتِ کاملہ پر قیامت کے قائم ہونے کی دلیل و برہان کے طور پر ذکر کیا ہے۔ سخت ہڈی تو کجا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میرے علاوہ جن معبودوں کی پرستش ہوتی ہے وہ سب مل کر مکھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ① حالانکہ مکھی میں کوئی مضبوط ہڈی نہیں ہوتی تو اللہ کے سوا کوئی اور انسان وحیوان کی مضبوط ہڈیاں کیونکر بنا اور سنوار سکتا ہے؟

﴿ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ﴾ وہ جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کر دی۔ اس میں بھی منکرین قیامت کے اس خیال کی تردید ہے کہ جب جسم راکھ اور مٹی ہو جائے گا تو اس میں زندگی اور حیات تو کیسے پیدا ہو جائے گی۔

---

① الحج:73

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس قسم کا کرشمہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سرسبز وشاداب درخت سے آگ پیدا کر دی ہے۔ آگ اور پانی دونوں باہم متضاد ہیں آگ پر پانی کا چلو ڈال دیا جائے تو وہ سرد ہو جاتی ہے اور آگ پانی کو بخارات بنا کر اڑا دیتی ہے یا خشک کر دیتی ہے۔ آگ عموماً خشک چیز کو جلاتی ہے مگر ایسے درخت بھی ہیں جن سے آگ نکلتی ہے۔ عرب میں عفار اور مرخ نامی درخت پائے جاتے تھے جن کی ہری بھری ٹہنیاں لے کر عرب انھیں آپس میں رگڑتے تو ان سے آگ روشن ہو جاتی۔ جس طرح سرسبز وشاداب درخت سے اللہ تعالیٰ آگ پیدا کرنے پر قادر ہیں اسی طرح ہڈیوں کی راکھ کے اندر زندگی پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں درخت کے آغاز اور انجام کی طرف اشارہ ہو کہ درخت کو پانی سے شادابی عطا کی آخر میں یہ خشک ہو کر ایندھن بنا تو آگ کی نذر ہو گیا۔ ایک ہی چیز کے آغاز اور انجام میں جب اللہ تعالیٰ متضاد صفات پیدا کر سکتا ہے تو انسان کے اندر یہ کیوں ناممکن ہے کہ اسے زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ بنا دے؟ یوں ہر درخت اس کا مصداق ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر اسی طرف اشارہ ہے:

﴿اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝﴾ ①

”پھر کیا تم نے دیکھی وہ آگ جو تم سلگاتے ہو؟ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں۔“

درخت کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا اور پھر اسے سرسبزی وشادابی بخشتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہی آگ جلانے کے کام آتا ہے۔ لیکن یہاں سورۂ یٰسٓ میں چونکہ شجر کے ساتھ ”اخضر“ کی صفت بیان ہوئی ہے اس لیے ظاہر یہی ہے کہ اس سے خاص درخت مراد ہے۔

ان آیات پر مختصراً ایک نظر مزید ڈال لیجیے کہ ان میں منکرین قیامت کو پانچ جواب

---

① الواقعۃ: 72,71

دیے گئے ہیں:

1: یہ اپنی پیدائش پر غور کریں جو ایک نطفہ سے انسان بنانے پر قادر ہے۔ اس کے لیے اس کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

2: یہ اعتراض وانکار اس لیے کرتا ہے وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے۔ ''نَسِيَ خَلْقَه'' اگر وہ اپنی پیدائش پر غور کرتا تو ہمارے مقابلے پر نہ اترتا اور جو بات منہ پر آتی بے خوف وخطر نہ کہتا۔ اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتا کہ جس طرح کوئی انسان کسی مردہ کو زندہ نہیں کر سکتا اسی طرح ہمارے بارے میں سمجھتا ہے کہ ہم بھی عاجز اور درماندہ ہیں اور ہم بھی زندہ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ یہ یاد رکھتا کہ کوئی انسان تو کسی انسان کو پیدا نہیں کرتا۔ سب کو ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں۔ جب پہلی بار ہم نے اسے بنایا ہے تو دوبارہ ہمارے لیے بنانا مشکل کیسے ہے؟ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے یہاں بڑی لطیف بات فرمائی ہے کہ ''نَسِيَ خَلْقَه'' میں بڑا پیار بھرا واضح جواب ہے۔ یہ تو اسی طرح ہوا کہ آپ کسی پر احسان کریں اور وہ آپ کے کسی احسان کا اعتراف نہ کرے، تو آپ کہیں دیکھو تم میرے احسان کا انکار کرتے ہو حالانکہ میں نے تمھیں لباس دیا، مال دیا، جس گھر میں تو رہتا ہے وہ بھی میں نے دیا۔ اس اسلوب میں اس کے لیے احسان کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی اسلوب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ میرے پیدا کرنے کے احسان کو نہ بھولتا تو میرے دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت سے انکار نہ کرتا۔

3: تیسرا جواب یہ کہ جس نے پہلی بار زندہ کیا ہے وہ ساری مخلوق اور ہر ایک کے پیدا کرنے کو جانتا ہے، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا تو تب مشکل ہوتا جب اس میں کامل قدرت نہ ہوتی اور مخلوق کے بارے میں کامل علم نہ ہوتا۔ جب اللہ ہی نے پہلی بار پیدا کیا اور وہی ''بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ'' ہے تو اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

4: چوتھا جواب یہ ہے کہ جو ہستی سرسبز درخت سے آگ بھڑکا سکتی ہے اس کے لیے مرنے والوں کو قبروں سے نکالنا کیا مشکل ہے؟

5: پانچواں جواب اسی ضمن میں یہ ہے کہ موت میں خشکی و یبوست ہے۔ جب کہ زندگی میں

رطوبت و حرارت سے۔ جب جسم پر موت طاری ہوتی ہے تو حیات ختم ہو جاتی کیونکہ دونوں باہم متضاد ہیں۔ منکرین اسی شبہ میں مبتلا ہیں کہ جب موت ہے تو پھر حیات کیسی؟ انہیں بتایا گیا ہے کہ سبز درخت میں رطوبت و برودت ہوتی ہے جب اس سے آگ جس میں حرارت اور یبوست ہوتی ہے، نکل سکتی ہے تو موت کے بعد زندگی، جو اس سے متضاد ہے، کا آنا بھی ناممکن نہیں ہے۔ نیز جیسے شادابی اور آگ جمع ہو سکتے ہیں، اسی طرح انسان بھی آگ میں رہ سکتے ہیں۔

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○﴾ [یٰسٓ: 81-83]

''اور کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کردے؟ کیوں نہیں اور وہی سب کچھ پیدا کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے، اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ''ہو جا'' تو وہ ہو جاتی ہے۔ سو پاک ہے وہ کہ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی کامل بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

ان آیات میں حیات بعد الممات پر مزید پانچ دلائل کا ذکر ہے:

1 ..... پہلی دلیل جو علم و عقل کے بالکل مطابق ہے کہ جو ہستی عظیم الشان آسمانوں کو اور اتنی وسیع زمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ انسان جیسے کمزور و ناتواں کو دوبارہ پیدا کیوں نہیں کر سکتی؟

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا﴾ ①

''کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ②

---

① النازعات: 27 ② المؤمن: 57

"یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

ان نادانوں کو اتنی سمجھ نہیں آتی جو ہستی ساتوں آسمان، زمین اور ان کے مابین سورج، چاند اور ستاروں کا نظام چلانے اور عظیم الشان مخلوق بنانے پر قادر ہے وہ انسان جیسے کمزور و ناتواں وجود کو دوبارہ بنانے پر قادر کیوں نہیں؟ انسان کو بنانے والا مالک تو خود فرماتا ہے:

﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ ①

"اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

جو معمولی تکلیف پر بے قرار ہو جاتا ہے اور چند دن گزار کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ کہاں یہ بے جان ضعیف اور کہاں یہ آسمان و زمین، مگر اتنی سیدھی اور صاف بات بھی ان نادانوں کو سمجھ نہیں آتی:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ②

"اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔"

اس دلیل کے لیے مزید سورۂ ق کے تحت جو لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ ③

2۔ ﴿بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ یہ دوسری دلیل ہے کہ کیوں نہیں، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے، وہی سب کچھ پیدا کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ زمین و آسمان ہوں یا انسان یا باقی سب مخلوق، سب کو پیدا کرنے والا وہی

---

① النسآء: 28 ② الاحقاف: 33 ③ ق: 7,6

ہے۔ اور سب کچھ جاننے والا بھی وہی ہے۔ پہلے جو فرمایا تھا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ ① یہاں اسی کو زوردار الفاظ سے دہرایا گیا ہے کہ وہ بڑا ماہر خلاق ہے۔ گویا یہ مبالغہ اور صفت کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ اس جہاں میں اس نے انواع واقسام کے اناج، رنگ برنگ کے پھل، مختلف وضع کے پھول، انسانوں کی مختلف شکلیں ان کی مختلف وضع قطع، الگ الگ خصائص وعادات بلکہ پوری مخلوق میں یہ تنوع اس کے ماہر خلاق ہونے، اس صفت سے پوری طرح متصف ہونے اور اس کے وسیع علم پر روشن دلیل ہے کہ اس کے پاس چند ایک ڈیزائن نہیں بلکہ ان گنت ڈیزائن ہیں۔ پھر اسے اپنی مخلوق کے بارے میں بھی پورا پورا علم ہے۔ وہ جاندار ہو یا بے جان، وہ ہر ایک کی ضروریات کو بھی جانتا ہے اور ان کے مصالح کو بھی، پھر ان کے اسرار وخفایا سے بھی باخبر ہے اور ان کے ظاہر و باطن سے بھی واقف۔ اس لیے انسان مر کے مٹی بھی ہو جائے تو اسے علم ہے کہ اس کے اجزاء کہاں کہاں ہیں۔ جو اتنا قادر وعلیم ہو اس کے لیے اس کے اجزاء کو جوڑ کر دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟

3. ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا﴾ یہ تیسری دلیل ہے کہ کسی چیز کو بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کارخانے نہیں لگانے پڑتے۔ نہ ہی مشینوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے بلکہ اس کا تو صرف ایک حکم چلتا ہے اور اس کے حکم پر وہ چیز تیار ہو جاتی ہے۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ﴾ ②

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا ''ہوجا'' تو وہ (قیامت کا دن) ہو جائے گا، اس کی بات ہی سچی ہے اور اس کی بادشاہی ہوگی، جس دن صور میں پھونکا جائے گا، غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے اور وہی کمال حکمت والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

---

① یٰسٓ 79: ② الانعام 73:

قیامت کے بارے میں فرمایا:

﴿ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ ﴾ ①

"پس وہ تو صرف ایک ڈانٹ ہوگی۔"

گویا کہا جائے گا اٹھو، تو وہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ کسی شے کے بارے میں "کُن" فرمادے تو اس کی کیا مجال ہے کہ وہ نہ ہو۔ اسے زمین وآسمان کے خزانے آہستہ آہستہ بنا کے رکھنے اور محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں وہ جہاں چاہتا ہے اور جس چیز کا خزانہ چاہتا ہے اس کے "کُن" کہنے سے بن جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت میں مروی ہے:

ولو ان اولكم و آخركم وحيكم وميتكم ورطبكم ويابسكم اجتمعوا في صعيد واحد فيسأل كل انسان منكم ما بلغت امنيته فاعطيت كل سائل منكم ما نقص ذلك من ملكي الا كما لو ان احدكم مر بالبحر فغمس فيه إبرة ثم رفعها إليه، ذلك بأني جواد واجد ماجد افعل ما أريد، عطائي كلام وعذابي كلام انما أمري لشيء إذا اردت ان اقول له كن فيكون. ②

"اور اگر تمھارے پہلے اور پچھلے، اور تمھارے زندہ اور مردہ، اور تمھارے صحت مند اور بیمار ایک جگہ جمع ہو جائیں پھر تم میں سے ہر انسان اپنی خواہش کے مطابق سوال کرے تو میں تمھارے ہر سائل کو دوں تو میرے خزانے میں اتنی سی کمی ہوگی کہ اگر کوئی دریا میں سوئی ڈبوئے پھر اسے اوپر اپنی طرف اٹھالے۔ یہ اس لیے کہ میں جواد ہوں، واجد ہوں، ماجد ہوں، جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، میری عطا کلام ہے، میرا عذاب کلام ہے، کسی شے کے بارے میں میرا امر، جب میں اس شے کا ارادہ کرتا

① النازعات:13 ② ترمذي: 2495، احمد: 154/5، 177

ہوں، یہ ہے کہ میں اسے کہوں "ہو جا" پس وہ ہو جاتا ہے۔"

یہ حدیث معمولی اختلاف سے صحیح مسلم ① میں بھی ہے۔ مؤولین نے یہاں "کن فیکون" کی حسب عادت تاویل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یوں فرمانا حقیقتاً نہیں بلکہ مجازاً ہے۔ اور اس سے سرعت تکوین مراد ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے یہ حضرات اللہ کی دیگر صفات کی تاویل کرتے ہیں۔ مگر قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں اس کا اطلاق "یقول" اور "اقول" سے ہوا ہے کہ میں کہتا ہوں کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے۔

اس لیے یہاں اس شے کا فوراً ہو جانا ہی مراد لینا درست نہیں۔ بلکہ اس میں دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار ہے کہ جب چاہتا ہے بلا تدریج وہ شے فوراً "کن" کہنے سے پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی چیز کا پیدا ہونا اس کی حکمت و مصلحت کی بنا پر تدریجی ہے تو وہ اسی طرح وجود میں آتی ہے۔ اس کا یہ فیصلہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔

4. ﴿فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ یہ بعث بعد الموت پر چوتھی دلیل ہے کہ معترضین سمجھتے ہیں کہ یہ امر محال ہے۔ کسی کام سے عاجز ہو جانا دراصل یہ انسان کی کمزوری اور اس کی عدم استطاعت کا نتیجہ ہے۔ مگر اللہ ہر قسم کے عجز و نقص سے پاک ہے۔ اس کے لیے کوئی امر محال اور ناممکن نہیں۔ بلکہ ہر شے کا اختیار اور بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے وہ اپنی بادشاہت میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ جب ہر چیز پر بادشاہت اسی کی ہے تو بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنا اس کی قدرت اور بادشاہت سے خارج کیونکر ہے؟

"مَلَكُوْت" یہ "مَلَكَ" کا مصدر ہے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ ②

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ

---

① صحیح مسلم: 2577، کتاب الادب

② مفردات

"کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

حقیقی بادشاہی چونکہ اسی کی ہے اس لیے حمد و ثنا بھی اسی کے لیے ہے:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ ①

"اللہ کا پاک ہونا بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔"

اسی کا بیان سورۂ بنی اسرائیل ② میں ہے [illegible] واعلان کرتے ہوئے مالک الملک کے حضور حاضری دیتے ہیں [illegible] بادشاہی اسی کی ہے اور مالک یوم الدین بھی وہی ہے۔ یعنی دنیا میں بھی اسی کے قبضے میں [illegible] آخرت میں بھی اسی کے فیصلے ہوں گے۔

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ ③

جب حقیقت یہ ہے تو قیامت کا انکار محض تکبر و تمرد کا نتیجہ ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا ہے کہ ملک اور ملکوت ایک ہی [illegible] جیسے رحمۃ اور "رحموت"، رہبۃ اور "رہبوت"، جبر اور "جبروت" ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ملک سے عالم الاجساد اور ملکوت سے عالم ارواح مراد ہے۔ مگر صحیح یہی ہے کہ دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔

---

① التغابن:1 ② بنی اسرائیل:111 ③ الانفطار:19

حضرت حذیفہ بن یمان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے تکبیر تحریمہ کہی پھر یہ دعا پڑھی:

((اللہ اکبر ذو الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ.)) ①

''اللہ بڑا ہے، بادشاہت والا اور قدرت وطاقت والا اور بلندی والا اور عظمت والا ہے۔''

5۔ ﴿وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ یہ پانچویں دلیل ہے کہ جس طرح تمھاری ابتدا اللہ کی طرف سے ہے، اسی طرح تمھاری انتہا بھی اسی کی طرف ہے۔ تمھارے لیے اس کی طرف لوٹنے میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ طوعاً و کرہاً تمھیں اس کے ہاں پہنچنا ہے۔ اسی کی جانب سے مبدأ ہے اور اسی کی طرف معاد ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہڈیوں کے زندہ ہونے سے ہی ہوگا۔ اگر اللہ کی طرف لوٹنے کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا کا وجود کھیل تماشا بن کے رہ جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ جہان عبث اور بے غرض وغایت نہیں بنایا۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں کہ تماشا ختم اور پیسہ ہضم۔

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ ②

''تو کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ ہم نے تمھیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور یہ کہ بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟''

اسی طرح زمین و آسمان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ﴾ ③

''اور ہم نے آسمان و زمین کو اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا، سو ان لوگوں کے لیے جنھوں

---

① ابوداود، نسائی وغیرہ ② المؤمنون:115 ③ صٓ:27

نے کفر کیا آگ کی صورت میں بڑی ہلاکت ہے۔''

کافر تو یہی سمجھتا ہے کہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

﴿اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝﴾ ①

''نہیں ہے یہ (زندگی) مگر ہماری اس دنیا کی زندگی، ہم (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں۔''

ان کی اس فکر کا نتیجہ ہے کہ انسان کا پیدا کرنا، زمین وآسمان اور اس پورے کارخانۂ قدرت کا پیدا کرنا محض عبث، بے کار اور بے نتیجہ ہے۔ جب کہ ایک مومن صادق زمین وآسمان اور اس کے مابین سارے نظام پر غور وفکر کر کے پکار اٹھتا ہے:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ ②

''اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

اس سارے نظام کا نتیجہ ایک دن نکلنے والا ہے۔ جس نے دنیا میں آنے کا مقصد سمجھ لیا وہ تو کامیاب رہا۔ یہ کامیابی یہی ہے کہ اللہ جہنم سے بچالے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾ ③

''پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔''

یہاں کی ساری عیش وعشرت عارضی اور فانی ہے۔ کامیابی یہ ہے کہ انسان جہنم سے بچ کر جنت میں چلا جائے۔ اسی فکر اور اس کے یقینی ہونے پر سورۂ یٰسٓ کی ان آخری

---

① المؤمنون:37 ② آلِ عمران:191 ③ آلِ عمران:185

آیات میں مختلف دلائل کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا کی حقیقت سمجھنے اور اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِی الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ.

ارشاد الحق اثری

15/ربیع الاول 1433ھ

8 فروری 2012، بروز بدھ

ادارہ کی دیگر مطبوعات

1. العلل المتناهية في الأحاديث الواهية (2 جلدیں)
2. إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر للمحدث شمس الحق الديانوي رحمه الله
3. المنسد للإمام أبي يعلى أحمد بن علي بن المثنى الموصلي رحمه الله (چھ ضخیم جلدوں میں)
4. المعجم للإمام أبي يعلى الموصلي رحمه الله
5. مسند السراج للإمام أبي العباس محمد بن إسحاق السراج الثقفي النيسابوري
6. المقالة الحسنى (المعربة) للمحدث عبد الرحمن المباركفوري رحمه الله
7. جلاء العينين في تخريج روايات البخاري في جزء رفع اليدين (للشيخ الأستاذ بديع الدين شاه الراشدي رحمه الله)
8. فضائل شهر رجب لأبي محمد الحسن بن محمد الخلال رحمه الله
9. تبيين العجب... في فضل رجب للحافظ ابن حجر العسقلاني رحمه الله
10. امام دارقطنی رحمہ اللہ
11. صحاح ستہ اور ان کے مؤلفین
12. موضوع حدیث اور اس کے مراجع
13. عدالتِ صحابہ رضی اللہ عنہم
14. کتابتِ حدیث تا عہد تابعین
15. الناسخ والمنسوخ
16. احکام الجنائز
17. امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ
18. قادیانی کافر کیوں؟
19. پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری نماز
20. مسئلہ قربانی اور پرویز
21. پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث
22. توضيح الكلام في وجوب القراءة خلف الإمام (جو بلا مبالغہ اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے)
23. احادیثِ ہدایہ: فنی و تحقیقی حیثیت
24. مولانا سرفراز صفدر اپنی تصانیف کے آئینہ میں
25. آفات نظر اور ان کا علاج
26. احادیثِ صحیح بخاری و مسلم میں پرویزی تشکیک کا علمی محاسبہ
27. آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے
28. حرز المؤمن
29. امام بخاری رحمہ اللہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ
30. اسباب اختلاف الفقہاء
31. مسلک اہل حدیث اور تحریکات جدیدہ
32. مسلکِ احناف اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی
33. مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کا موقف
34. مقالات 1-2
35. فلاح کی راہیں
36. اسلام اور موسیقی پر اشراق کے اعتراضات کا جائزہ
37. اسلام اور موسیقی
38. نوافل کی جماعت کے ساتھ فرض نماز کا حکم
39. أحكام الحج والعمرة والزيارة
40. مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم
41. تنقیح الکلام فی تائید توضیح الکلام
42. تفسیر سورۂ ق
43. مقالات محدث مبارکپوری رحمہ اللہ (صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی)
44. إعلاء السنن في الميزان (حنفی مسلک کی معروف کتاب کا ناقدانہ جائزہ)
45. مقالاتِ اثریہ

ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار فیصل آباد پاکستان — فون: 041-2642724